انتہا پسندی اور اس کے مسلم معاشرے پر اثرات

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ

(مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ)

مقالہ نگار

سارہ بھٹہ

رجسٹریشن نمبر:759-PhD/IS/F16

اسکالر پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۲۵

انتہا پسندی اور اس کے مسلم معاشرے پر اثرات

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ

مقالہ نگار

سارہ بھٹہ

پی ایچ ڈی، اسکالر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

اسلامی فکر و ثقافت

رجسٹریشن نمبر:

759-PhD/IS/F16

نگران مقالہ

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری

ایسوسی ایٹ پروفیسر، اسلامی فکر و ثقافت

نمل یونیورسٹی، اسلام آباد

فیکلٹی آف سوشل سائنسز

شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

اکتوبر ۲۰۲۵

بسم الله الرحمن الرحيم

منظوری فارم برائے مقالہ و دفاع مقالہ

(Thesis and Defense Approval form)

زیر دستخطی اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ انہوں نے مذکورہ مقالہ کا بغور مطالعہ کیا اور مقالے کے دفاع کا جائزہ لیا۔ وہ امتحانی کارکردگی اور تحقیقی معیار سے مکمل طور پر مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف سوشل سائنسز سے اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالہ بعنوان: انتہا پسندی اور اس کے مسلم معاشرے پر اثرات
اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ

Extremism and its impact on Muslim socities
An Analytical Study in the Light of Islamic Teachings

نام ڈگری: <u>ڈاکٹر آف فلاسفی علوم اسلامیہ</u>

نام مقالہ نگار: **<u>سارہ بھٹہ</u>**

رجسٹریشن نمبر: **<u>759-PhD/IS/F16</u>**

ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری
(نگران مقالہ) ____________________
دستخط نگران مقالہ

ڈاکٹر ریاض احمد سعید
(صدر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت) ____________________
دستخط صدر شعبہ اسلامی فکر و ثقافت

ڈاکٹر ریاض شاد
(ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز) ____________________
دستخط ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

میجر جنرل (ر) شاہد محمود کیانی
(ریکٹر نمل اسلام آباد) ____________________
دستخط ریکٹر نمل

تاریخ: ____________________

حلف نامہ فارم

(Candidate declaration form)

میں **سارہ بھٹہ** ولد افتخار احمد بھٹہ رول نمبر: PD-IS-AF16-ID-009

رجسٹریشن نمبر: PD-IS-AF16-AD-009

طالبہ، پی ایچ-ڈی شعبہ علوم اسلامیہ، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ مقالہ

بعنوان: **انتہاپسندی اور اس کے مسلم معاشرے پر اثرات**

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ

Extremism and its impact on Muslim societies
An Analytical Study in the Light of Islamic Teachings

پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے سلسلہ میں پیش کیا گیا ہے اور ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری کی نگرانی میں تحریر کیا گیا ہے، راقم الحروف کا اصل کام ہے، اور یہ کہ مذکورہ کام نہ تو کہیں اور جمع کروایا گیا ہے، نہ ہی پہلے سے شائع شدہ ہے اور نہ ہی مستقبل میں کسی بھی ڈگری کے حصول کے لیے کسی دوسری یونیورسٹی یا ادارے میں میری طرف سے پیش کیا جائے گا۔

نام مقالہ نگار: **سارہ بھٹہ**

دستخط مقالہ نگار: ____________

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

Abstract

This research study critically examines extremism in the context of Muslim societies, defining it not as terrorism or political violence, but as ghulūw a form of excess, exaggeration, or deviation from the balance and moderation prescribed by Islam. Extremism, as conceptualized in this dissertation, refers to the tendency of excess or deficiency (ifrat and tafriṭ) in belief, worship, conduct, and social dealings. The study underscores that Islam, through the concept of ummatan wasaṭan (the balanced community), promotes moderation, rationality, and equilibrium in every aspect of human life.

The first chapter explores the conceptual framework of extremism, emphasizing the significance of moderation and identifying its intellectual, psychological, and social causes and manifestations. The second chapter analytically discusses the various forms of extremism manifested in beliefs (i'tiqādāt), acts of worship ('ibādāt), and social and transactional behaviors (mu'āmalāt). The third chapter investigates the multidimensional impacts of extremism on Muslim societies—intellectual and ideological distortion, decline in religious tolerance, sectarian conflicts, disintegration of family and social harmony, and deterioration of political, economic, and educational systems.

The fourth chapter proposes a comprehensive framework for countering extremism through intellectual, moral, and educational reform. It emphasizes the necessity of reviving authentic Islamic thought, fostering ethical character-building, strengthening educational and training mechanisms, and establishing a reformed social system based on justice, compassion, and balance.

Methodologically, the study employs an analytical and descriptive approach, drawing on primary Islamic sources the Qur'an and Sunnah—along with the works of classical and contemporary scholars. The findings suggest that the eradication of extremism is possible only through the integration of sound knowledge, ethical discipline, and balanced religious understanding. The research concludes that a return to the Islamic principles of moderation and harmony is essential for restoring intellectual stability and social well-being within Muslim societies.

Keywords: Extremism, Moderation, Ghulūw, Ifrat and Tafriṭ, Intellectual Reform, Moral Education, Islamic Ethics, Social Harmony, Balanced Society'

فہرستِ عنوانات

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	مقالہ کی منظوری کا فارم(Thesis Acceptance Form)	VI
	حلف نامہ(Declaration)	V
	ملخص مقالہ(Abstract)	VI
	فہرست عنوانات	VII
	اظہار تشکر(A word of thanks)	IX
	انتساب(Dedication)	X
	مقدمہ	XI
	باب اوّل انتہاپسندی: مفہوم، اسباب اور تاریخی ارتقاء	1
	فصل اوّل انتہا پسندی کا مفہوم اور شرعی نقطہ نظر	3
	فصل دوم اسلام میں اعتدال و توازن کی اہمیت	24
	فصل سوم انتہا پسندی کے اسباب و عوامل	42
	فصل چہارم انتہا پسندی کا تاریخی پس منظر	62
	باب دوم اعتقادات، عبادات اور معاملات میں انتہا پسندی	92
	فصل اوّل اعتقادات میں نظری و فکری انحرافات	93
	فصل دوم عبادات میں انتہا پسندی کی صورتیں اور اور رویّے	109
	فصل سوم فقہی و دینی معاملات میں انتہا پسندی کے رجحانات	128
	فصل چہارم معاشرتی اور معاشی معاملات میں عدم توازن	151
	باب سوم مسلم معاشروں پر انتہاپسندی کے اثرات	173
	فصل اول انتہا پسندی کے نظری و فکری اثرات	174
	فصل دوم مذہبی رواداری کا فقدان اور فرقہ وارانہ تنازعات	188
	فصل سوم خاندانی و سماجی زندگی میں انتہا پسندی کے مظاہر	197

	فصل چہارم　انتہاپسندی کے سیاسی، معاشی و تعلیمی آثار	214
	باب چہارم　انتہاپسندی کے انسداد کے فکری، اخلاقی اور تربیتی جہات	229
	فصل اول　فکری اصلاح کا لائحہ عمل	230
	فصل دوم　اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا اسلامی منہج	250
	فصل سوم　تربیتی و تعلیمی حکمتِ عملی	261
	فصل چہارم　اسلامی معاشرتی نظام اور عملی اقدامات	280
	نتائج	297
	سفارشات	299
	فہرست آیات کریمہ	302
	فہرست احادیث مبارکہ	306
	فہرست مصادر و مراجع	308

اظہار تشکر

اللہ رب العزت کا بے پایاں فضل و کرم ہے کہ جس کی عنایات اور توفیق سے یہ تحقیقی مقالہ پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ میں ربِّ العالمین کے حضور عاجزانہ دعا گو ہوں کہ وہ اس علمی کاوش کو اپنی رضا کے لیے قبول فرمائے اور اسے امتِ مسلمہ کے اجتماعی مفاد میں نافع و مؤثر بنائے۔

اس کے بعد میں اپنے نگرانِ مقالہ محترم ڈاکٹر سید عبد الغفار بخاری کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے شکر گزار ہوں، جن کی قیمتی رہنمائی، شفقت اور علمی سرپرستی نے اس تحقیق کی تکمیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اسی طرح میں صدرِ شعبہ اسلامی فکر و ثقافت، ڈاکٹر ریاض احمد سعید، کا بھی تہِ دل سے ممنون ہوں جن کی راہنمائی، شفقت اور تعاون ہمیشہ شاملِ حال رہا۔ مزید برآں، ڈین کلیہ سماجی علوم، پروفیسر ڈاکٹر محمد ریاض شاد، کا بھی بے حد شکر گزار ہوں جن کی ذاتی دلچسپی، حوصلہ افزائی اور اعتماد نے میرے حوصلے بلند کیے اور تحقیقی جذبے کو جِلا بخشی۔

میں نمل یونیورسٹی کے تمام معزز اساتذہ کرام بالخصوص صدرِ شعبہ عربی، ڈاکٹر ابو بکر بھٹہ، کی بھی شکر گزار ہوں، جن کی رہنمائی اور حوصلہ افزائی میری علمی توانائی کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔ اسی طرح میں یونیورسٹی کی انتظامیہ، لائبریریوں کے عملے اور اُن تمام افراد کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے مرحلۂ تحقیق میں کسی نہ کسی صورت میں تعاون فراہم کیا۔ آخر میں، اپنے تمام اعزہ و اقارب کی شکر گزار ہوں جن کی دعاؤں، محبت اور مدد سے میری تعلیمی راہ میں آنے والی رکاوٹیں آسان ہوئیں۔

جزاکم اللہ خیراً

سارہ بھٹہ

(مقالہ نگار)

انتساب

میں اپنی اس تحقیقی کاوش کو اپنے والدین کے نام پیش کرتی ہوں، جن کے دامنِ شفقت میں میرے ذوقِ علم نے پرورش پائی، اور جن کی بے لوث محبتوں، دعاؤں اور قربانیوں نے مجھے اس علمی و تحقیقی سفر کے اس مقام تک پہنچایا۔ ان کی شفقت و تربیت میری کامیابی کی بنیاد اور میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

﴿وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ [الإسراء: ٢٣، ٢٤]

مقدمہ

موضوع تحقیق کا تعارف

انتہا پسندی ایک ایسا منفی رجحان ہے جو فکری، مذہبی اور معاشرتی عدم توازن کو جنم دیتا ہے۔ یہ رویہ اسلام کے اس اعتدال پسند اور جامع تصور کے سراسر منافی ہے جو امن، برداشت اور رواداری پر مبنی ہے۔ مسلم معاشروں میں انتہا پسندی نے فکری جمود، فرقہ واریت، تشدد اور باہمی نفرت کو فروغ دیا ہے جس سے امت کی وحدت متاثر ہوئی۔ اسلام نے واضح طور پر درمیانی راستے (أُمَّةً وَسَطًا) کو اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے تاکہ اعتدال، انصاف اور رحمت پر مبنی معاشرہ قائم ہو۔

انتہا پسندی سے مراد وہ فکری و عملی شدت ہے جو انسان کے عقائد، عبادات، اجتہاد، اور تکفیر کے میدانوں میں ظاہر ہوتی ہے، نہ کہ محض عسکری یا دہشت گردانہ رویوں تک محدود ہے۔ یہ وہ رجحان ہے جس میں انسان دین کے فہم میں اعتدال اور توازن سے ہٹ کر غلو، افراط یا تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسلام چونکہ ایک معتدل اور متوازن دین ہے جو امتِ وسط کے تصور کو بنیاد بناتا ہے، اس لیے ہر قسم کی فکری یا عملی انتہا پسندی دین کے مزاج کے خلاف ہے۔

مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کا مظاہرہ صرف سیاسی یا سماجی سطح پر نہیں بلکہ عقائد، عبادات اور معاملات میں بھی دیکھا جاتا ہے۔ عقائد میں انتہا پسندی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی گروہ اپنی تعبیرِ دین کو حتمی سمجھ کر دوسروں کو گمراہ یا کافر قرار دیتا ہے۔ عبادات میں یہ رجحان اس صورت میں ظاہر ہوتا ہے جب ظاہری اعمال کو اصل دین قرار دے کر روحِ عبادت کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ معاملات میں انتہا پسندی تب سامنے آتی ہے جب انصاف، رواداری اور حسنِ سلوک کی بجائے سختی، تعصب اور خود غرضی کو اپنایا جائے۔ اسلام نے ان تمام صورتوں کی نفی کرتے ہوئے میانہ روی اور اعتدال کو اصل راہ قرار دیا ہے۔

ا- عقائد

عقائد میں انتہا پسندی سے مراد وہ فکری شدت ہے جس میں انسان یا گروہ اپنے نظریاتی مؤقف کو ہی دینِ حق کا واحد معیار سمجھ لیتا ہے اور دوسروں کے عقائد کو باطل یا کفر قرار دینے لگتا ہے۔ یہ رویہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب ایمان کی اصل روح، یعنی یقین، رواداری، اور حسنِ ظن، کی جگہ تعصب، جمود، اور خود پسندی لے لیتے ہیں۔ عقائد میں غلو اس وقت جنم لیتا ہے جب انسان نصوصِ شرعیہ کو اپنے محدود فہم یا گروہی تعبیر کے تابع کر دیتا ہے۔ ایسے افراد معمولی اجتہادی یا فقہی اختلافات کو بھی کفر و ایمان کا معیار بنالیتے ہیں۔ نتیجتاً امت میں فرقہ واریت، تکفیر،

اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اسلام عقائد میں میانہ روی، اعتدال، اور دلیل پر مبنی ایمان کی تعلیم دیتا ہے، نہ کہ سخت گیری اور انکارِ حق کا رویہ۔ یہی توازن ایمان کی صحت اور امت کی وحدت کی بنیاد ہے۔

۲-عبادات

عبادات میں انتہا پسندی سے مراد وہ طرزِ عمل ہے جس میں انسان عبادت کے حقیقی مقصود یعنی بندگی، اخلاص اور روحانی توازن سے ہٹ کر غلو، ظاہریت یا خود ساختہ مشقت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسلام نے عبادات کو انسان کی روح کی پاکیزگی، نفس کی تربیت، اور خالق کے ساتھ تعلقِ محبت پر قائم کیا ہے، مگر جب عبادت کو صرف ریاضت، کثرت یا دکھاوے کا ذریعہ بنالیا جائے تو یہ عمل عبادت کے مقصد کے برعکس ہو جاتا ہے۔ عبادات میں انتہا پسندی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کوئی شخص دین کی رخصتوں اور آسانیوں کو ترک کر کے غیر معمولی سختی اختیار کرے، یا دوسروں پر ایسے اعمال لازم سمجھے جو شریعت نے فرض نہیں کیے۔ ایسے رویے سے انسان میں خود پسندی، ریاکاری، اور روحانیت کے بجائے ظاہری پن پیدا ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسے افراد عبادت میں کثرت اور طوالت کو تقویٰ کی علامت سمجھ کر ان لوگوں کو کمتر جانتے ہیں جو عبادت میں اعتدال اختیار کرتے ہیں۔ نتیجتاً دین کا وہ توازن جو رحمت اور سہولت پر مبنی ہے، سختی اور بوجھ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسلام کا مزاج میانہ روی کا ہے، جو عبادت کو زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے ساتھ ہم آہنگ رکھتا ہے۔ حقیقی عبادت وہ ہے جو انسان کے دل میں عاجزی، سکون، اور رب کے قرب کا احساس پیدا کرے، نہ کہ تکبر، ظاہر داری، یا فکری جمود۔ عبادت میں اعتدال ہی دین کی اصل روح اور روحانی کمال کا ذریعہ ہے۔

۳-معاملات

اسلامی تعلیمات میں "معاملات" سے مراد انسان کی وہ تمام عملی سرگرمیاں ہیں جو اس کی فکری، فقہی، سماجی اور معاشی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں۔ فکری معاملات میں انسان کا طرزِ فکر، نقطۂ نظر اور دوسروں کے خیالات کے بارے میں رویہ شامل ہے۔ فقہی پہلو ان اصولوں اور احکام پر مشتمل ہے جو روزمرہ زندگی کے فیصلوں اور اعمال کی بنیاد بنتے ہیں۔ سماجی معاملات میں خاندان، معاشرہ، اور انسانی روابط کا نظام شامل ہے، جبکہ معاشی پہلو انسان کے رزق، تجارت، محنت اور وسائلِ معیشت کے استعمال سے تعلق رکھتا ہے۔ اسلام نے ان تمام پہلوؤں میں عدل، توازن اور اعتدال کو بنیادی اصول کے طور پر پیش کیا ہے۔

ان پہلوؤں میں انتہا پسندی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان اعتدال سے ہٹ کر افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جائے۔ فکری طور پر جب کوئی شخص اپنی رائے کو حتمی سمجھ کر دوسروں کے لیے برداشت ختم کر دیتا ہے، تو یہ انتہا پسندی ہے۔ فقہی اعتبار سے جب کسی مسلک یا رائے کو واحد حق قرار دے کر دوسروں کو گمراہ یا خطاکار کہا جائے، تو یہ

بھی غلو ہے۔ سماجی سطح پر جب انسان تعلقات میں سختی، تعصب، یا طبقاتی برتری کے رویے اپناتا ہے، تو وہ معاشرتی انتہا پسندی ہے۔ معاشی معاملات میں جب انسان ناجائز منافع، اسراف، یا بخل کا رویہ اختیار کرتا ہے تو یہ بھی حد سے تجاوز ہے۔ اسلام ان تمام صورتوں میں اعتدال، انصاف، اور احسان کو پسند کرتا ہے۔ معاملات میں انتہا پسندی نہ صرف فرد کی اخلاقی توازن کو بگاڑتی ہے بلکہ پورے معاشرے میں بے اعتمادی، عدمِ مساوات اور فساد کو جنم دیتی ہے۔ لہٰذا ایک صالح اسلامی معاشرہ اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب فکری، فقہی، سماجی اور معاشی تمام معاملات میں توازن، رواداری اور عدل کو عملی زندگی کا حصہ بنایا جائے۔

معاملات کی اقسام

اگر معاملات میں پائی جانے والی انتہا پسندی کا تجزیہ کیا جائے تو اسے دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم دینی و فقہی معاملات سے متعلق ہے، جن میں اجتہاد و تقلید، تکفیر و فتاویٰ اور جہاد جیسے موضوعات شامل ہیں۔ ان امور میں اعتدال اور توازن کا فقدان فکری و عملی سطح پر ایسی انتہا پسندی کو جنم دیتا ہے جو امت کے اتحاد، دین کے فہم، اور معاشرتی استحکام کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ دوسری قسم سماجی، معاشرتی اور معاشی معاملات سے متعلق ہے، جہاں انتہا پسندی کا اظہار اخلاقی تعصبات، طبقاتی تفاخر، نسلی برتری، یا اقتصادی ناانصافی کی صورت میں ہوتا ہے۔ ان دونوں اقسام میں قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں اعتدال کے قرآنی اصول سے انحراف کے باعث معاشرتی بگاڑ، فکری تقسیم اور عملی افراط کا سبب بنتی ہیں۔

دینی و فقہی معاملات

اجتہاد و تقلید میں انتہا پسندی

اسلامی فقہ کی تاریخ میں اجتہاد اور تقلید دو اہم پہلو ہیں جو دین کے عملی نفاذ اور فہم کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اجتہاد کا مقصد نصوصِ شرعیہ کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کرنا ہے، جبکہ تقلید کا مطلب اہلِ علم اور مجتہدین کی آراء سے رہنمائی لینا ہے۔ تاہم جب کوئی گروہ یا فرد اجتہاد کو مطلق آزادی کے طور پر اختیار کر لیتا ہے اور اپنے فہم کو قطعی اور ناقابلِ خطا سمجھنے لگتا ہے، تو یہاں اجتہادی انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔ ایسی سوچ نصوص کے حقیقی مفہوم سے دوری اور ذاتی آراء کو شریعت پر فوقیت دینے کا سبب بن جاتی ہے۔ دوسری طرف جب تقلید کا دائرہ اتنا محدود کر دیا جاتا ہے کہ عقل، تحقیق، اور اجتہاد کے دروازے بند کر دیے جائیں، تو تقلیدی جمود پیدا ہوتا ہے۔ اس طرح کے رویے میں ماضی کے فقہی اجتہادات کو ابدی حیثیت دے کر ہر نئی فکری یا سماجی تبدیلی کو رد کر دیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں شریعت کا وہ لچکدار اور زمانہ شناس پہلو ماند پڑ جاتا ہے جو دین کی روح کو زندہ رکھتا ہے۔ یوں اجتہاد میں بے قاعدگی اور تقلید میں جمود دونوں انتہا پسندی کی صورتیں ہیں، جن سے دین کی اعتدال پسند روح متاثر ہوتی ہے۔

تکفیر و فتاویٰ میں انتہا پسندی

تکفیر یعنی کسی مسلمان کو کافر قرار دینا، اور فتاویٰ یعنی شرعی احکام کے حوالے سے رائے دینا، دونوں انتہائی حساس دینی امور ہیں۔ جب کوئی گروہ معمولی اختلافاتِ رائے، فقہی تعبیرات، یا فکری اختلاف کو بنیاد بنا کر دوسروں کی تکفیر شروع کر دیتا ہے، تو یہ عقیدتی انتہا پسندی کی خطرناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں امت کے درمیان نفرت، تفرقہ، اور تشدد کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ تکفیری رویہ اس وقت بڑھتا ہے جب افراد اپنی محدود علمی استعداد کو فیصلہ کن معیار بنا لیتے ہیں اور اختلافِ اجتہاد کو دین سے خروج قرار دیتے ہیں۔ یہی رویہ مذہبی فتاویٰ کے میدان میں بھی انتہا پسندی پیدا کرتا ہے، جہاں فتوے تحقیق و حکمت کے بجائے تعصب، گروہی مفاد یا جذباتی ردِ عمل کے تحت صادر ہونے لگتے ہیں۔ ایسے فتوے امت میں انتشار پیدا کرتے ہیں اور دین کے رحمانی اور اعتدال پسند تصور کو مسخ کر دیتے ہیں۔ اسلام نے تکفیر کو ایک سنگین عمل قرار دیا ہے اور اس کے استعمال میں احتیاط، علم اور عدل کی شرط رکھی ہے۔ نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی تعلیمات میں یہ واضح کیا گیا کہ کسی مسلمان کی نیت اور ایمان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق صرف اللہ کے پاس ہے۔ لہٰذا فتاویٰ اور دینی فیصلوں میں توازن، علمیت اور اخلاقی ذمہ داری لازم ہے تاکہ دین کے وقار اور امت کی وحدت محفوظ رہ سکے۔

جہاد میں انتہا پسندی

جہاد اسلام کا ایک اہم اور مقدس فریضہ ہے جو ظلم، ناانصافی اور جبر کے خاتمے کے لیے مشروع کیا گیا ہے۔ مگر جب جہاد کے اصل مقاصد، یعنی عدل، دفاع اور امن سے ہٹ کر اس کو ذاتی یا گروہی مفاد، سیاسی مقاصد، یا بدلے کے جذبے کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ عملی انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جہاد میں انتہا پسندی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کوئی گروہ یا فرد قتال کو محض اپنی فہمِ دین کی بنیاد پر واجب قرار دیتا ہے، ریاستی نظم کو نظر انداز کرتا ہے، اور امت کے اجتماعی مفاد کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ ایسے رویوں سے نہ صرف دین کے نام پر فساد پھیلتا ہے بلکہ اسلام کا وہ تصورِ رحمت و عدل بھی مجروح ہوتا ہے جس پر اس کا پورا نظام قائم ہے۔ جہاد کی غلط تعبیرات اور جذباتی تعبیرات نے کئی مسلم معاشروں میں فکری انتشار اور سیاسی عدم استحکام کو جنم دیا ہے۔ اسلام نے جہاد کو ایک منظم، اخلاقی اور ریاستی ذمہ داری کے طور پر متعین کیا ہے، جس میں نیت، مقصد اور طریقہ سب شریعت کے تابع ہوں۔

دینی و فقہی معاملات میں پائی جانے والی یہ تینوں اقسام اجتہاد و تقلید، تکفیر و فتاویٰ، اور جہاد میں انتہا پسندیدر حقیقت اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب انسان علم، فہمِ شریعت، اور توازن سے ہٹ کر جذبات، تعصب، یا خود پسندی کے زیرِ اثر فیصلے کرنے لگتا ہے۔ اس کا تدارک صرف اسی وقت ممکن ہے جب علمی مکالمے، اجتہادی بصیرت،

اخلاقی ذمہ داری، اور فکری رواداری کو فروغ دیا جائے۔ اسلام کا حقیقی پیغام اعتدال، علم، عدل، اور رحمت ہے، اور انہی اصولوں پر عمل کر کے ہی امتِ مسلمہ اس فکری و فقہی انتہا پسندی سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔

سماجی، معاشرتی اور معاشی معاملات

انتہا پسندی کی دوسری بڑی قسم سماجی، معاشرتی اور معاشی معاملات سے متعلق ہے، جو انسان کے باہمی تعلقات، اخلاقی رویّوں، طبقاتی نظام، اور اقتصادی طرزِ عمل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اسلام نے ان تمام پہلوؤں میں عدل، احسان، توازن، اور مساوات کو بنیادی اصول قرار دیا ہے، مگر جب انسان ان اصولوں سے انحراف کرتا ہے تو انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔

سماجی معاملات

سماجی معاملات سے مراد انسان کے دوسروں کے ساتھ تعلقات، برتاؤ، میل جول، اور سماجی ذمہ داریاں ہیں۔ سماجی معاملات میں انتہا پسندی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان دوسروں کے ساتھ تعلقات میں عدمِ برداشت، تعصب، اور خود پسندی کا مظاہرہ کرے۔ یا جب انسان دوسروں کے حقوق کو کمتر سمجھے، معاشرتی مقام یا نسب پر فخر کرے، یا اپنی رائے و طبقے کو برتر جانے۔ مثلاً کوئی شخص اپنے مذہب، مسلک، یا خاندان کو برتر سمجھ کر دوسروں کو حقیر جانے تو یہ سماجی انتہا پسندی ہے۔ اسی طرح رنگ، نسل یا زبان کی بنیاد پر دوسروں سے نفرت یا برتری کا اظہار بھی انتہا پسندی کی ایک شکل ہے۔ معاشرتی میل جول میں جب لوگ محض اپنے طبقے یا مفاد تک محدود ہو جائیں اور کمزور طبقات کو نظر انداز کریں، تو سماجی ناانصافی جنم لیتی ہے۔ بعض اوقات یہ رویّہ سوشل بائیکاٹ، تضحیک، یا تشدد کی صورت بھی اختیار کرلیتا ہے۔ رائے کے اختلاف کو دشمنی سمجھنا، یا دوسروں کی اصلاح کے بجائے ان کی تحقیر کرنا بھی انتہا پسندی کی علامات ہیں۔ اس سے معاشرے میں تکبر، تحقیر، اور غیر تسلی بخش تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی تعصب اس وقت ابھرتا ہے جب انسان اپنے گروہ، خاندان یا قوم کے مفاد کو انصاف پر ترجیح دیتا ہے، جس سے معاشرے میں ناانصافی اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام ایسے رویّوں کو اخوت، مساوات، اور حسنِ اخلاق کے منافی قرار دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ عدل و احترام کے ساتھ پیش آئے تاکہ معاشرتی توازن اور ہم آہنگی برقرار رہے۔

معاشرتی معاملات

معاشرتی معاملات میں خاندان، ازدواجی تعلقات، تربیتِ اولاد، ہمسائیگی، اور اجتماعی نظمِ زندگی شامل ہیں۔ ان میں انتہا پسندی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب افراد ذاتی پسند، رسم و رواج، یا غیر شرعی اقدار کو دین سے مقدم کر

لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر نکاح، وراثت یا خاندانی فیصلوں میں خواتین کے حقوق کی نفی، یا اپنی مرضی کے رسم و رواج پر اصرار، معاشرتی افراط و تفریط کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس طرح معاشرہ توازن اور باہمی احترام سے محروم ہو جاتا ہے۔ یا جب انسان خاندانی یا اجتماعی تعلقات میں عدل و توازن کو ترک کر دے۔ مثلاً ازدواجی زندگی میں شوہر یا بیوی کا ایک دوسرے پر غیر ضروری دباؤ ڈالنا، شک و بدگمانی، یا حق تلفی کرنا انتہا پسندی ہے۔ اسی طرح تربیتِ اولاد میں حد سے زیادہ سختی یا بے جا نرمی دونوں انتہا پسندی کی صورتیں ہیں، کیونکہ اسلام اعتدال اور حکمت کی تربیت پر زور دیتا ہے۔ خاندان کے بڑوں کا رعب و تسلط اس حد تک بڑھ جانا کہ دوسروں کی رائے کو دبایا جائے بھی انتہا پسندی ہے۔ ہمسائے کے حقوق میں غفلت یا معمولی بات پر دشمنی پیدا کرنا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔ معاشرتی سطح پر جب لوگ اجتماعی نظم و قانون کو اپنے ذاتی مفادات پر قربان کر دیتے ہیں، تو یہ عملی انتہا پسندی بن جاتی ہے۔ اسلام ایسے رویّوں کو رد کرتا ہے اور عدل، شفقت، رواداری اور باہمی تعاون کو ایک متوازن معاشرت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔

معاشی معاملات

معاشی معاملات میں تجارت، محنت، سرمایہ کاری، دولت کی تقسیم، اور وسائل کا استعمال شامل ہے۔ معاشی معاملات میں انتہا پسندی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان مال و دولت کے معاملے میں حد سے تجاوز کر جائے، خواہ اس میں افراط ہو یا تفریط۔ مثلاً تجارت میں ناجائز منافع خوری، ذخیرہ اندوزی، دھوکہ دہی، یا حرام ذرائع سے کمائی کرنا انتہا پسندی کی علامت ہے۔ اسی طرح بعض لوگ محنت سے گریز کر کے دولت کو صرف وراثت یا سود کے ذریعے حاصل کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں، جو غیر متوازن رویہ ہے۔ سرمایہ کاری میں خطرات سے بے پرواہ ہو کر حریصانہ سرمایہ بڑھانے کی کوشش یا دوسروں کے حقوق کو پامال کرنا بھی انتہا پسندی ہے۔ وسائل کے استعمالمیں اسراف، فضول خرچی، یا دوسری طرف کنجوسی اور بخل بھی افراط و تفریط کی صورتیں ہیں۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے معاشرے میں طبقاتی تفاوت، حسد، اور محرومی بڑھتی ہے، جو اجتماعی ناہمواری کا باعث بنتی ہے۔ اسلام ان تمام رویّوں کے مقابلے میں اعتدال، دیانت داری، انصاف اور میانہ روی کو معاشی زندگی کا بنیادی اصول قرار دیتا ہے۔ اسلام نے ان امور میں حلال روزی، دیانت، عدل، اور میانہ روی کو لازم قرار دیا ہے۔ تاہم جب انسان لالچ، ذخیرہ اندوزی، سود خوری، یا اسراف میں مبتلا ہو جائے تو یہ معاشی انتہا پسندی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس رویے سے سماجی ناہمواری، طبقاتی تفریق، اور غربت میں اضافہ ہوتا ہے، جو آخر کار معاشرتی عدمِ استحکام کا سبب بنتا ہے۔

یہ انتہا پسندی عام طور پر اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب اخلاقی تربیت کا فقدان ہو، دینی تعلیمات سے غفلت برتی جائے، یا مادی اقدار کو روحانی اقدار پر ترجیح دی جائے۔ اسلام نے ان تمام پہلوؤں میں اعتدال کو لازم قرار دیا ہے تاکہ انسان کا رویہ انصاف، توازن اور مساوات پر قائم رہے۔

ان تینوں سطحوں سماجی، معاشرتی، اور معاشی میں انتہا پسندی کی قدرِ مشترک یہ ہے کہ یہ قرآنی اصولِ اعتدال سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ جب انسان اپنی خواہشات یا گروہی مفادات کے تحت فیصلے کرنے لگتا ہے، تو معاشرے میں بگاڑ، فکری تقسیم، اور اخلاقی زوال پیدا ہوتا ہے۔ اسلام کا مزاج اس کے برعکس ہے، جو انسان کو توازن، عدل اور رواداری کی راہ دکھاتا ہے تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں امن، مساوات، اور فلاح کی فضا میں ترقی کر سکیں۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ سماجی، معاشرتی، اور معاشی سطحوں پر پائی جانے والی انتہا پسندی دراصل انسانی رویّوں میں توازن کے بگاڑ کی مظہر ہے۔ جب انسان قرآن کے اصولِ اعتدال سے انحراف کرتا ہے اور اپنی خواہشات، ذاتی مفادات یا گروہی وابستگیوں کو معیارِ حق بنالیتا ہے تو وہ افراط و تفریط کے جال میں پھنس جاتا ہے۔ سماجی سطح پر یہ انتہا پسندی تعصّب، نفرت، اور عدمِ برداشت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جہاں دوسروں کے حقوق اور جذبات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ معاشرتی میدان میں یہ رویّہ خاندانی ناچاقیوں، طلاق کی بڑھتی شرح، والدین کی نافرمانی، یا صنفی عدمِ توازن کی شکل اختیار کرتا ہے۔ معاشی سطح پر یہ ظلم، استحصال، ناجائز منافع خوری، اور وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، جو طبقاتی خلیج کو بڑھا کر معاشرتی اضطراب کو جنم دیتی ہے۔ ان تمام صورتوں میں مشترکہ عنصر عدل و توازن سے انحراف ہے، جو اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصول کے خلاف ہے۔ اسلام کا مزاج افراط و تفریط کے بجائے اعتدال، عدل، اور رواداری پر قائم ہے، جو ہر میدان میں انسان کو راہِ مستقیم دکھاتا ہے۔ اگر فرد اپنے کردار میں میانہ روی، امانت، اور تقویٰ کو اختیار کرے تو معاشرہ فکری و اخلاقی استحکام کی منزل پا سکتا ہے۔ یوں اعتدال ہی وہ محور ہے جو امتِ مسلمہ کو انتہا پسندی کے خطرات سے محفوظ رکھ کر امن، انصاف، اور فلاح کی طرف لے جاتا ہے۔

موضوع کی اہمیت

موضوع کی اہمیت موجودہ دور میں نہایت گہری، علمی اور عملی نوعیت کی حامل ہے۔ آج کا مسلمان معاشرہ فکری، اعتقادی، اخلاقی، معاشرتی اور معاشی سطح پر جس اضطراب اور انتشار کا شکار ہے، اس کی ایک بڑی وجہ دین کے فہم میں اعتدال سے انحراف اور انتہا پسندی کا فروغ ہے۔ انتہا پسندی نے نہ صرف فکری ہم آہنگی کو مجروح کیا ہے بلکہ امتِ مسلمہ کی وحدت، امن، ترقی اور علمی وقار کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔ یہ رویّہ محض عسکری یا دہشت گردانہ سرگرمیوں تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں غلو اور افراط و تفریط کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ خواہ وہ عبادات میں ریاکاری یا خود ساختہ زہد ہو، عقائد میں تکفیر و انکار ہو، یا معاشرت میں عدمِ برداشت اور اخلاقی جمود۔

یہ موضوع اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو وسطیت (الوسطیۃ)، عدل اور توازن کو اپنی تعلیمات کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اُمتِ مسلمہ کو "اُمّتًا وسطًا" کہا، یعنی ایک ایسی امت جو ہر معاملے میں اعتدال کی نمائندہ ہو۔ مگر جب اس اصول سے انحراف ہوتا ہے تو معاشرے میں انتہا پسندی جنم لیتی ہے، جو فکری تنگ نظری، فرقہ واریت، اور معاشرتی بے سکونی کو فروغ دیتی ہے۔ آج مسلم معاشرے میں علمی و فکری اختلافات کو برداشت کرنے کی صلاحیت کم ہو چکی ہے، اور چھوٹے مسائل پر بھی تکفیر، تحقیر، اور مخالفت کے رویّے پروان چڑھ رہے ہیں۔

یہ تحقیق اس لیے بھی اہم ہے کہ یہ انتہا پسندی کے فکری، اخلاقی اور تربیتی پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتی ہے، جس سے اصلاحِ معاشرہ کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ جب تک فرد، خاندان، اور ریاست اعتدال کی قرآنی روش کو اختیار نہیں کرتے، تب تک نہ دینی وحدت ممکن ہے نہ سماجی استحکام۔ اس لیے اس موضوع پر تحقیق صرف علمی ضرورت نہیں بلکہ امتِ مسلمہ کی فکری بقا اور عملی اصلاح کے لیے ناگزیر ہے۔ یہی مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام کا حقیقی پیغام شدت نہیں، بلکہ توازن، عدل، اور فلاحِ انسانیت ہے۔

سابقہ تحقیقی کام کا جائزہ

مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کے موضوع پر مختلف زاویوں سے متعدد محققین نے کام کیا ہے۔ ان تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کا مظہر صرف سیاسی یا عسکری نہیں بلکہ سماجی و خاندانی سطح پر بھی موجود ہے۔ عورت پر تشدد، طبقاتی امتیاز، اور فکری جمود یہ سب اسی انتہا پسندانہ رجحان کے مختلف مظاہر ہیں۔ چنانچہ چند ایسے موضوعات پر کام ہوا ہے جو اس تحقیق کے ساتھ جزوی طور پر تعلق رکھتے ہیں۔

مقالات

انتہا پسندانہ رویے

- پاکستان میں فرقہ وارانہ فسادات – ریاستی و غیر ریاستی اداروں کا کردار: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تفصیلی جائزہ مقالہ نگار: عبدالرحمٰن، نگران: ڈاکٹر فریدہ یوسف، شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، (پی ایچ-ڈی) 2018

- نوجوانوں میں انتہا پسندانہ رویوں کے اسباب اور ان کا تدارک: اسلامی تعلیمات کے تناظر میں

مقالہ نگار: محمد نصیر بن محمد یونس نگران: ڈاکٹر سعید الحق جدون لیکچرار، شعبہ علومِ اسلامیہ ودینیہ، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ، ۲۰۲۴ء-۲۰۲۵ء (ایم فل)

- پاکستان میں شدت پسندی کے داخلی اور خارجی عوامل اور ان کا سدباب مقالہ نگار: محمد زبیر حسن، نگران: ڈاکٹر حافظ عبدالمجید، شعبہ علوم اسلامیہ وعربی، گومل یونیورسٹی، سیشن ۲۰۱۷ء-۲۰۲۰ء (پی ایچ-ڈی)
- انسداد انتہا پسندی میں علماء پاکستان کا کردار مقالہ نگار: بختاور اکرم، نگران: ڈاکٹر محمد خان ملک، شعبہ علوم اسلامیہ، منہاج یونیورسٹی، لاہور، سیشن ۲۰۱۳ء-۲۰۱۵ء (ایم فل)
- عدم احترام کے انتہاء پسندانہ رویوں کے تدارک میں مسلمانوں کی ذمہ داریاں، مقالہ نگار: حافظ محمد ندیم نقش بندی، نگران: ڈاکٹر عرفان اللہ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ علومِ اسلامیہ، لاہور گیریژن یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۲۵ء (ایم فل)

شدت پسندی وفرقہ وارانہ تشدد

- پاکستان میں شدت پسندی کے داخلی اور خارجی عوامل اور ان کا سدباب، مقالہ نگار: محمد زبیر حسن بن حافظ سلطان احمد، نگران: ڈاکٹر حافظ عبدالمجید، شعبہ علومِ اسلامیہ وعربی، گومل یونیورسٹی، ڈیرہ اسماعیل خان، سیشن ۲۰۱۷ء-۲۰۲۰ء، تاریخِ مناقشہ: ۱۵ جون ۲۰۲۳ء (ایم فل)
- پاکستان میں فرقہ وارانہ تشدد کے سدِ سباب کی کوششوں کا جائزہ: ۱۹۸۱ء مابعد کا خصوصی مطالعہ

مقالہ نگار: افتخار قدیر، نگران: علی اصغر سلیمی، شعبہ علومِ اسلامیہ، بہاءالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، (پی ایچ-ڈی) 2000

- پاکستان میں فرقہ واریت، حکومتی اقدامات کا تجزیاتی مطالعہ

مقالہ نگار: صائمہ ارشاد، نگران مقالہ: محمد زید لکھوی، یونیورسٹی آف اوکاڑہ، 2021 (ایم فل)

- مذہبی فرقہ واریت کا خاتمہ: انتشارِ عالم کا واحد حل

مقالہ نگار: مومنہ شاہین، نگران مقالہ: نگہت اکرم، یونیورسٹی آف پونچھ، 2014 (ایم فل)

- فرقہ واریت کی تاریخ، اسباب اور حل

مقالہ نگار: عارف اللہ، نگران مقالہ: واحد بخش، یونیورسٹی آف پونچھ، 2014 (ایم فل)

- فرقہ واریت کے خاتمے میں مساجد کا کردار: پاکستانی تناظر میں ایک جائزہ

مقالہ نگار: مقصود احمد، نگران مقالہ: محمد امین، یونیورسٹی آف لاہور، 2017 (ایم فل)

- فرقہ واریت پر لکھی گئی اہم تالیفات کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

مقالہ نگار: محمد امتیاز، نگران مقالہ: علی اصغر چشتی؛ غلام انور الازہری، محی الدین اسلامی یونیورسٹی، نیریاں شریف، 2019 (ایم فل)

کتب

- الصحوۃ الإسلامیۃ بین الجحود والتطرف، یوسف القرضاوی
- The Genealogy of Terror: How to distinguish between Islam, Islamism and Islamist Extremism Matthew L. N. Wilkinson 2019 Routledge

مذہبی عدم انتہاپسندی

- پاکستان میں مذہبی عدم برداشت کے بڑھتے رجحانات کا تدریسی عمل پر اثر: تحقیقی مطالعہ قرآن کریم اور اُسوۂ کریمی کی روشنی میں، مقالہ نگار: نامعلوم، نگران: نامعلوم، شعبہ: نامعلوم، کلیہ معارفِ اسلامیہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی
- عصر حاضر میں اتحاد بین المسلمین کی ضرورت، اس کی راہ میں رکاوٹیں اور ان کا سدباب: قرآن و سیرت طیبہ کی روشنی میں تحقیقی جائزہ مقالہ نگار: غلام محمد، نگران: ڈاکٹر زاہد علی زاہدی، شعبہ اصول الدین، کراچی یونیورسٹی، کراچی، ۲۰۱۷ء
- مذہبی انتہاپسندی اور رواداری: حالاتِ حاضرہ کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ مقالہ نگار: مولانا عنایت الرحمٰن، نگران: پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید، شعبہ قرآن وسنۃ، کلیہ معارف اسلامیہ، کراچی یونیورسٹی، کراچی، سنِ تکمیل ۲۰۱۱ء
- مذہبی انتہاپسندی کے تدارک میں حکومتی اور غیر حکومتی اداروں کی ذمہ داریاں، مقالہ نگار: عروہ اختر، نگران: ڈاکٹر سلطان محمود خان، شعبہ علومِ اسلامیہ، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور، سیشن ۲۰۱۹ء-۲۰۲۱ء، تاریخ مناقشہ: ۱۱ اکتوبر ۲۰۲۱ء (ایم فل)
- عصرِ حاضر میں مذہبی انتہاپسندی کا رجحان اور تعلیماتِ نبوی کی روشنی میں تدارک، مقالہ نگار: سلطان محمود، نگران: ڈاکٹر ضیاء الرحمٰن، شعبہ علومِ اسلامیہ (فاصلاتی نظام)، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور، داخلہ: خزاں ۲۰۱۳ (ایم فل)

- پاکستان میں غلوفی الدین (مذہبی انتہاپسندی) کی صورتیں اور ان کا تدارک، مقالہ نگار:عبدالرحمٰن، نگران: پروفیسر ڈاکٹر محمد عبداللہ عابد، شعبہ علومِ اسلامیہ، قرطبہ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی،ڈیرہ اسماعیل خان-۲۰۱۷ء(ایم فل)
- مذہبی انتہاپسندی کے عملی مظاہر اور ان کا تدارک، مقالہ نگار: محمد طلحہ، نگران :ڈاکٹر فیض اللہ بغدادی، شعبہ علومِ اسلامیہ، منہاج یونیورسٹی،لاہور،۲۰۱۹ء(ایم فل)
- پاکستانی معاشرہ میں عدم برداشت اور انتہاء پسند رویوں کی وجوہات اور ان کا انسداد: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ،مقالہ نگار:نعمت اللہ ، نگران :ڈاکٹر صاحب زادہ محمد، شعبہ علومِ اسلامیہ، بلوچستان یونیورسٹی، کوئٹہ، سیشن۲۰۱۸ء(ایم فل)
- پاکستانی معاشرہ میں مذہبی شدت پسندی کے اسباب ومحرکات ،مقالہ نگار: افتخار قدیر، نگران:ڈاکٹر عمر حیات، شعبہ علومِ اسلامیہ، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، سمن آباد، فیصل آباد، الحاق :جی سی یونیورسٹی، فیصل آباد ،۲۰۱۵ء(ایم فل)
- پاکستانی معاشرہ میں عدم برداشت کی روک تھام کے لیے حکمتِ عملی: سیرتِ طیبہ کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ، مقالہ نگار: مبشر حسین، نگران:ڈاکٹر جواد حسیب، شعبہ علومِ اسلامیہ،ہائی ٹیک یونیورسٹی،ہیوی انڈسٹری ٹیکسلا ایجوکیشن سٹی، ٹیکسلا کینٹ، سیشن ۲۰۲۲ء-۲۰۲۴ء(ایم فل)
- پاکستان میں مذہبی عدم برداشت کے رجحانات :اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تجزیاتی مطالعہ، مقالہ نگار:غلام عباس، نگران:ڈاکٹر محمد ادریس لودھی، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاءالدین زکریایونیورسٹی، ملتان، سی-۲۰۱۴(ایم فل)
- عصرحاضر میں عدم برداشت کابڑھتاہوارجحان، اسباب اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا ممکنہ تدارک: ضلع بنوں کے تناظر میں مقالہ نگار: طارق علی شاہ، نگران: ڈاکٹرعبدالقدوس، شعبہ علومِ اسلامیہ وتحقیق،یونیورسٹی آف سائنس وٹیکنالوجی، بنوں، سیشن۲۰۱۷ء(ایم فل)

کتب

- الصحوة الإسلامية بين الاختلاف المشروع والتفرق المذموم، يوسف القرضاوي
  طبعة دار الشروق الاولی، ۲۰۰۱
- التسامح الديني في الإسلام–د. يوسف القرضاوي

- لا إكراه في الدين—د. محمد عمارة
- الاختلاف والائتلاف في الإسلام—طه جابر العلواني
- فقه الاختلاف—شیخ يوسف القرضاوي
- التطرف الديني: أسبابه وعلاجه—د. عبد الكريم بكار
- مذہب اور جدید چیلنج

مولانا وحید الدین خان

علمی پبلیشرز، نیا دہلی / لاہور

- فرقہ واریت: اسباب اور حل—ڈاکٹر خالد علوی

ادبی پبلیشرز، اسلام آباد / لاہور

- مذہبی رواداری اور اسلام

مولانا وحید الدین خان

- اسلام اور مذہبی رواداری

ڈاکٹر محمد طاہر القادری

- فرقہ واریت: اسباب اور حل

ڈاکٹر خالد علوی

- اسلام میں مذہبی رواداری

سید صباح الدین عبد الرحمن

- اسلام اور مذہبی رواداری

فلاح الدین فلاحی

- اسلام میں اختلاف اور رواداری

مولانا امین احسن اصلاحی

آرٹیکلز

- معاشرتی عدم برداشت: اسباب، اثرات اور تدارک

ڈاکٹر محمد تاج الدین کالامی، ماہنامہ منہاج القرآن جولائی ۲۰۲۵ء

- عدم برداشت کا رجحان اور تعلیمات نبوی

ڈاکٹر طاہر رضا بخاری، ترجمان القرآن، |مارچ ۲۰۰۱| اسوۂ حسنہ

- برداشت اور رواداری

ڈاکٹر زیب النساء سرویا، ماہنامہ دختران اسلام نومبر ۲۰۲۴ء

- Islam and the Future of Tolerance

  Authors: Maajid Nawaz & Sam Harris

  Publisher: Harvard University Press، Publication Year: 2015

- The Myth of Islamic Tolerance

  Editor: Robert Spencer

  Publisher: Prometheus Books,Publication Year: 2005

- When Religion Becomes Evil

  Author: Charles Kimball

  Publisher: HarperCollins Canada,Publication Year: 2002

- Religious Extremism and Sindh's Resilience, Imtiaz Ali, Scholar, Department of International Relations, University of Karachi
- The Impact of Violent Religious Extremism on Various Cultural Components of Pakistani Society, Syed Sibtain Hussain Shah, Department of International Relations, National University of Modern Languages, Islamabad
- Cultivation of Religious Extremism through Facebook: The Case of Pakistan ,: Abid Ali Butt & Ayesha Ashfaq, University of the Punjab.
- Religious Education and Extremism in Pakistan: From Deobandi Militancy to a Rising Sufi Fanaticism , Syed Sibtain Hussain Shah
- Religious Extremism in Pakistan and Its Impact on National Security
- Syed Subtain Hussain Shah,University of Warsaw (Faculty of Political Science and International Studies,2019
- Comparative Analysis between Nigeria and Pakistan: Religious Extremism as Case Study, Muhammad Asif, University of Punjab , Lahore.

اسلام کا تصورِ اعتدال

- اسلام کا تصورِ اعتدال اور موجودہ دور کی انتہا پسندی کا ایک تحقیقی جائزہ ، مقالہ نگار: علی رضاعابدی ، نگران:ڈاکٹر حافظ محمد ثانی، شعبہ علومِ اسلامی، کلیہ معارفِ اسلامیہ ،وفاقی اُردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس وٹیکنالوجی، عبدالحق کیمپس، کراچی (پی ایچ-ڈی)

کتب

- الوسطية في القرآن الكريم: دراسة شاملة لمبدأ الاعتدال والتوازن في الإسلام
  المؤلف: علي محمد الصلابي، دار المعرفة-بيروت، ٢٠١٢
- الوسطية في العقيدة الإسلامية المؤلف: ثائر إبراهيم خضير الشمري
  دار الكتب العلمية-بيروت، ٢٠٠٥
- الوسطية في الإسلام، عبد العزيز عزّت الخيّاط
- الناشر: دار السلام-القاهرة، ٢٠٠٧
- الوسطية والاعتدال في المنهج الدعوي عند الشيخ الغزالي

(نسخة أو دراسة معاصرة) الموضوع: هذا عنوان متداول لبحوث / منشورات تناولت اعتدال الإمام الغزالي في المنهج الدعوي (تفصيل منهجي بين التطرف والاعتدال في الخطاب والدعوة).

- اسلام کا تصور اعتدال و توازن زمرہ : فکریات، مصنف: شیخ الاسلام ڈاکٹر محمد طاہر القادری
  منہاج القران پبلیکیشنز
- دین میں تشدد یا اعتدال
  جاوید احمد غامدی

- The Middle Path of Moderation in Islam: The Qur'anic Principle of Wasatiyyah Mohammad Hashim Kamali,Oxford University Press,215

آرٹیکلز

- اسلام اور اعتدال کا راستہ،ڈاکٹر یوسف القرضاوی ، ترجمہ: ارشاد الرحمٰن | ستمبر ۲۰۱۸ |
  نظامِ حیات، ترجمان القرآن
- اُمتِ مسلمہ کی خصوصیت اعتدال اور میانہ روی

مولانا عبد المتین، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاون کراچی پاکستان

رجب المرجب ۱۴۴۵ھ - فروری ۲۰۲۴ء

- اسلام میں میانہ روی اور اعتدال کی قدریں، مولانا ابو عمار زاہد الراشدی

دین و حکمت، (جون ۲۰۱۹ء)

- شیخ الاسلام کا نظریہ اعتدال و توازن، ڈاکٹر شفاقت علی البغدادی الازہری

ماہنامہ دختران اسلام فروری ۲۰۲۱ء

- اسلام کی ہمہ گیری اور اُس کا مزاجِ اعتدال مولانا توحید عالم بجنوری

ماہنامہ دارالعلوم، شمارہ ۳، جلد: ۹۸، جمادی الاولی ۱۴۳۵ہجری مطابق مارچ ۲۰۱۴ء

معاشرتی افراط و تفریط

- خواتین پر تشدد اور اسلامی معاشرے میں اس کا تدارک

مقالہ نگار: رخسانہ یاسمین قریشی، نگران تحقیق: ڈاکٹر مستفیض احمد علوی، گفٹ یونیورسٹی گجرانوالہ، یہ ایک تحقیقی مقالہ، علوم اسلامیہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد

- پاکستانی معاشرہ میں بڑھتی ہوئی جذباتیت: عوامل و اثرات اور اسلامی لائحہ عمل

مقالہ نگار: عائشہ شمشاد دختر شمشاد احمد، نگران: ڈاکٹر فریحہ انجم، شعبہ علومِ اسلامیہ، لاہور کالج فار ویمن یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۲۱ء-۲۰۲۳ء

- العنف ضد المرأة: مفهومها وأسبابها وأشكالها وآثارها

المؤلف: طارق عبد الرؤوف عامر

الناشر: مؤسسة طيبة للنشر والتوزيع، 2014

- المفصل في أحكام المرأة والبيت المسلم في الشريعة الإسلامية

المؤلف: عبد الكريم زيدان، مؤسسة الرسالة، بيروت، ۱۹۹۷

آرٹیکلز

- A Close Study on Domestic Violence Against Women: Islamic Perspectives and Remedies : Maulana Akbar Shah & Afreen Al-Burhān: Journal of Quran'ān and Sunnah Studies,IIUM Journals
- Anti-violence against women in Islamic law

  Dr. Zaid Haris & Dr. Muhammad Saeed Tayyab

  Contemporary Journal of Social Science Review (2025)

تحقیقی خلا

اگرچہ انتہاپسندی کے موضوع پر موجود تحقیقی لٹریچر میں فرقہ وارانہ تشدد، انتہا پسندانہ رویّوں، معاشرتی افراط و تفریط اور اسلام کے تصورِ اعتدال پر مختلف زاویوں سے بحث کی گئی ہے، تاہم زیادہ تر مطالعات نے انتہاپسندی کو عمومی سماجی یا سیاسی تناظر میں ہی پیش کیا ہے۔ موجودہ لٹریچر میں ایک نمایاں خلا یہ ہے کہ انتہاپسندی کے بنیادی فکری و عملی عوامل —یعنی عقائد میں انتہاپسندی، عبادات میں غلو، اور معاملات میں عدمِ توازن— کو بطور اصل اسباب منظم اور تجزیاتی انداز میں کم ہی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے، حالانکہ یہی انحرافات فرقہ واریت، عدمِ برداشت اور سماجی انتشار کو جنم دیتے ہیں۔ یہ تحقیق ان عوامل کے منفی سماجی، فکری اور نظری اثرات کا اسلامی تصورِ وسطیت و اعتدال کی روشنی میں تجزیہ کرتے ہوئے ایک جامع اصلاحی فریم ورک پیش کرکے اس تحقیقی خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرے گی۔

جوازِ تحقیق

انتہاپسندی اور اس کے مسلم معاشرے پر اثرات کا مطالعہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں نہایت اہم اور عصری ضرورت رکھتا ہے، کیونکہ موجودہ دور میں مسلم معاشرے فکری غلو، فرقہ واریت، تشدد اور عدم برداشت جیسے رویوں سے دوچار ہیں جنہوں نے اسلام کے پرامن، اعتدال پسند اور رحمت پر مبنی تصور کو دھندلا دیا ہے۔ یہ تحقیق اس امر کو واضح کرتی ہے کہ اسلام اعتدال، رواداری، انصاف اور اخوت کا دین ہے، جو افراط و تفریط اور غلو کو سختی سے رد کرتا ہے۔ قرآن مجید میں امتِ مسلمہ کو "اُمَّۃً وَسَطًا" قرار دے کر اعتدال کو اس کی امتیازی خصوصیت بتایا گیا ہے، جبکہ نبی کریم ﷺ کی سیرت میں حلم، عفو اور صبر کے بے شمار نمونے ملتے ہیں جو انتہاپسندی کے خاتمے کی عملی راہیں دکھاتے ہیں۔ نظریاتی طور پر یہ مطالعہ اسلامی نظریۂ اعتدال، فکری توازن، اور سماجی عوامل کے باہمی تعلق کو واضح کرتا ہے کہ کس طرح معاشی، تعلیمی اور فکری محرومیاں مذہبی شدت پسندی کو جنم دیتی ہیں۔ اس تحقیق کا

مقصد نہ صرف انتہاپسندی کے فکری و اخلاقی اسباب کا تعین کرنا ہے بلکہ اسلامی اخلاقیات اور قرآنی اصولوں کی روشنی میں ایک متوازن، پُرامن اور مستحکم مسلم معاشرہ تشکیل دینے کے لیے رہنمائی فراہم کرنا بھی ہے۔

بیانِ مسئلہ

اس تحقیق کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ مسلم معاشروں میں انتہاپسندی ایک فکری، اعتقادی اور عملی چیلنج کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اسلام امن، اعتدال اور رواداری کا دین ہے، جو انسانیت کو میانہ روی، توازن اور عدل کی تعلیم دیتا ہے۔ موجودہ دور میں مسلم معاشرے فکری و نظریاتی انحرافات، شدت پسندی، اور عدمِ برداشت جیسے مسائل سے دوچار ہیں۔ انتہاپسندی نے نہ صرف فکری و اخلاقی بگاڑ پیدا کیا ہے بلکہ سماجی استحکام، مذہبی ہم آہنگی، اور علمی ترقی کو بھی متاثر کیا ہے۔ یہ مسئلہ محض مذہبی یا فکری نوعیت کا نہیں بلکہ اس کے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی پہلو بھی ہیں۔ بعض گروہوں نے دینی تعلیمات کی غلط تعبیرات اور مخصوص سیاسی مفادات کے تحت مذہب کو شدت پسندانہ مقاصد کے لیے استعمال کیا، جس سے دینِ اسلام کی اصل روح، یعنی اعتدال و رحمت، پسِ پشت چلی گئی۔ اس تناظر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ انتہاپسندی کے اسباب، اس کے تاریخی ارتقاء، اور اس کے مسلم معاشروں پر فکری، اخلاقی، اور معاشی اثرات کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے۔ ساتھ ہی اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایسا اصلاحی اور تربیتی منہج مرتب کیا جائے جو فکری توازن، رواداری، اور اعتدال کو فروغ دے کر مسلم معاشروں میں پائیدار امن و استحکام پیدا کرے۔

مقاصدِ تحقیق

اس تحقیق کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ دینِ اسلام ایک معتدل اور متوازن نظامِ حیات ہے جو "اُمّتِ وَسط" ہونے کا درس دیتا ہے۔ تاہم جب فرد یا معاشرہ اس توازن کو چھوڑ کر شدت، جمود، یا غلو کا مظاہرہ کرتا ہے تو اس سے دین کے حقیقی مقاصد عدل، رحمت اور اعتدال مسخ ہو جاتے ہیں۔ اس مقالے میں اس امر کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ کس طرح عبادات میں غیر ضروری سختی یا ظاہریت، عقائد میں تکفیر و تعصب، اعمال میں عدمِ برداشت، اور معاملات میں ناانصافی و خودغرضی اسلام کے اعتدال پسند منہج کے منافی ہیں۔ نیز یہ کہ اسلام کے حقیقی پیغام یعنی وسطیت، رواداری اور توازن کو نمایاں کیا جائے اور مسلم معاشروں میں پائی جانے والی فکری و عملی انتہاپسندی کے علمی و تربیتی اسباب کو سمجھ کر ان کے اصلاحی حل پیش کیے جائیں۔ لہٰذا یہ مطالعہ مذہب کے نام پر ہونے والے تشدد کا نہیں، بلکہ دینی فہم میں پائے جانے والے غلو اور افراط و تفریط کے رویّوں کا تجزیاتی مطالعہ ہے، چنانچہ منتخب موضوع کے درج ذیل اہداف و مقاصد ہیں:

۱. انتہا پسندی کے مفہوم، اس کے فکری و عملی اسباب، اور اسلامی تعلیمات میں تصورِ وسطیت و اعتدال کے نظریاتی و شرعی مقام کا تجزیاتی مطالعہ کرنا۔
۲. اعتقادات، عبادات، فقہی و دینی معاملات، اور معاشرتی و معاشی امور میں انتہا پسندی کی ممکنہ صورتوں کی نشاندہی اور ان کے اثرات کا جائزہ لینا۔
۳. مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کے نظری و فکری، مذہبی، سماجی، اور سیاسی و معاشی اثرات کا تجزیاتی مطالعہ کرنا۔
۴. انتہا پسندی کے انسداد کے لیے فکری، اخلاقی، تربیتی اور عملی جہات کی نشاندہی اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ایک جامع فریم ورک تیار کرنا۔

سوالات تحقیق

۱. انتہا پسندی کے مفہوم اور اس کے فکری و عملی اسباب کیا ہیں، اور اسلامی تعلیمات میں تصورِ وسطیت و اعتدال کا نظریاتی و شرعی مقام کیا ہے؟
۲. اعتقادات، عبادات، فقہی و دینی معاملات، اور معاشرتی و معاشی امور میں انتہا پسندی کی ممکنہ صورتیں کیا ہیں اور یہ کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں؟
۳. مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کے نظری و فکری، مذہبی، سماجی، اور سیاسی و معاشی اثرات کون سے ہیں؟
۴. مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کے انسداد کے لیے فکری، اخلاقی، تربیتی اور عملی جہات کیا ہیں، اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انہیں کس طرح مؤثر طریقے سے نافذ کیا جا سکتا ہے؟

پس منظری مطالعہ

اسلامی معاشروں میں انتہا پسندی کا رجحان محض عسکری نوعیت کا نہیں بلکہ فکری، اخلاقی، اور مذہبی سطح پر بھی ظاہر ہوا ہے۔ ماضی میں اس موضوع پر زیادہ تر تحقیقات دہشت گردی اور سیاسی تشدد کے تناظر میں کی گئیں، لیکن عقائد، عبادات اور معاملات میں پائی جانے والی فکری انتہا پسندی پر کم توجہ دی گئی۔ یہی فکری خلا اس مطالعے کی بنیاد بنا تاکہ اسلام کے اصولِ اعتدال کی روشنی میں غیر عسکری انتہا پسندی کے اسباب، اثرات، اور اس کے تدارک کے مناہج کا علمی تجزیہ پیش کیا جا سکے۔

دائرۂ تحقیق اور اس کی حدود

یہ تحقیق انتہا پسندی کے غیر عسکری پہلوؤں تک محدود ہے، جن میں بالخصوص فکری، اعتقادی، نفسیاتی اور عملی یعنی سماجی، سیاسی پہلوؤں کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ اس مطالعے کا مرکزی زور اس امر پر ہے کہ کس طرح فکری

جمود، غلط تعبیرِ دین، اور اخلاقی انحراف نے مسلم معاشروں میں فکری شدت اور فکری تنگ نظری کو جنم دیا۔ تحقیق میں انتہا پسندی کو ذہنی و فکری رویے کے بگاڑ کے طور پر دیکھا گیا ہے، نہ کہ اس کے عسکری یا سیاسی مظاہر کے طور پر۔

یہ تحقیق اس پہلو کا احاطہ نہیں کرتی جس کا تعلق مسلح تحریکات، سیاسی تشدد، یا دہشت گردانہ سرگرمیوں سے ہے، کیونکہ وہ دائرۂ مطالعہ سیکورٹی اسٹڈیز اور سیاسیات کے مضامین سے زیادہ مربوط ہے۔ اس کے برعکس، اس مطالعے میں اسلامی افکار و تعلیمات کی روشنی میں انتہا پسندی کے فکری، نظریاتی اور اخلاقی اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے تاکہ یہ واضح کیا جاسکے کہ فکر و کردار کی سطح پر پیدا ہونے والا انحراف، بالآخر معاشرتی سطح پر کس طرح بگاڑ اور اختلاف کا باعث بنتا ہے۔

یوں یہ تحقیق انتہا پسندی کو فکری و اخلاقی انحراف کے تناظر میں سمجھنے کی ایک علمی و تجزیاتی کاوش ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے اصل پیغام یعنی اعتدال، توازن، رواداری اور اصلاحِ باطن کی روشنی میں اس مسئلے کا غیر عسکری مگر بنیادی پہلو اجاگر کیا جاسکے۔

منہج تحقیق

۱- تحقیق کی نوعیت (Nature of Study)

یہ تحقیق معیاری (Qualitative) نوعیت کی ہے، جس میں اسلامی مصادر، علمی متون، اور فکری تجزیے کی بنیاد پر انتہا پسندی کے فکری، اعتقادی، اور معاشرتی پہلوؤں کا مطالعہ کیا گیا ہے۔ اس میں کوئی مقداری (Quantitative) یا شماریاتی ڈیٹا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔

۲- تحقیقی منہج: (Research Approach)

تحقیق کا منہج تجزیاتی (Analytical) اور توصیفی (Descriptive) ہے۔ اس کے تحت انتہا پسندی کے مختلف پہلوؤں (عقائد، عبادات، معاملات) کا اسلامی تعلیمات کی روشنی میں تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے۔

۳- ماخذ تحقیق: (Sources of Data)

درج ذیل ذرائع تحقیق کا استعمال کیا گیا ہے:

بنیادی مصادر (Primary Sources) قرآنِ مجید، احادیثِ نبویہ، فقہی متون، تفاسیر، اور اسلامی مفکرین کے آثار۔

ان کے علاوہ الأحکام السلطانیہ، از الماوردی، إحیاء علوم الدین، از الغزالی ابو حامد محمد بن محمد، الأشباه والنظائر، از السیوطی، الاقتصاد فی الاعتقاد، از الغزالی ابو حامد محمد بن محمد، اقتضاء الصراط المستقیم، از ابن تیمیہ، الإنصاف فی

بیان اسباب الاختلاف از شاہ ولی اللہ، الإیمان والحیاۃ، از الدکتور یوسف القرضاوی، البدایہ والنھایہ، از ابن کثیر، السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، از ابن تیمیۃ، الحرانی، الصحوۃ الإسلامیہ بین الجحود والتطرف، از یوسف القرضاوی، الطرق الحکمیہ فی السیاسہ الشرعیہ، از ابن القیم، مجموع الفتاوی، از ابن تیمیۃ، مدارج السالکین، از ابن القیم، معالم فی الطریق، از سید قطب، مقدمہ ابن خلدون، الموافقات فی اصول الشریعہ، از الشاطبی، ابراہیم بن موسیٰ الغرناطی، الوسطیۃ فی الإسلام مفہومھا ومظاہرھا، از القرضاوی قابل ذکر ہیں۔

- ثانوی مصادر (Secondary Sources) جدید تحقیقی کتب، مقالات، جرائد، رپورٹیں، اور فکری و سماجی علوم پر معاصر تحقیقات۔

۱. **ڈیٹا جمع کرنے کا طریقہ** :(Data Collection Method)

مطالعۂ مراجع و مصادر (Library Research) کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے تحت مختلف اسلامی کتب خانوں، آن لائن ڈیٹا بیسز) مثلاً Al-Maktaba al-Shamela, JSTOR, Google Scholar وغیرہ (سے مواد جمع کیا گیا ہے۔

۲. ڈیٹا کے تجزیے کا طریقہ (Data Analysis Method)

مواد کو موضوعاتی بنیاد پر منظم کیا گیا ہے (Thematic Analysis)۔ ہر باب میں مسئلے کا تجزیہ اسلامی نصوص، فقہی اصول، اور معاصر فکری مباحث کے تناظر میں کیا گیا ہے تاکہ نظری اور عملی پہلوؤں میں توازن قائم ہو۔

۳. نتائج وسفارشات (Expected Outcome)

تحقیق کے نتیجے میں انتہا پسندی کے فکری و اخلاقی اسباب کی واضح نشاندہی ہو گی، اور ایک اسلامی منہجِ اصلاح تجویز کیا گیا ہے جو مسلم معاشروں میں فکری توازن، اعتدال، اور رواداری کے فروغ میں مددگار ثابت ہو۔

اسلوب تحریر

۱) موضوع کو ابواب اور ذیلی فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے تاکہ عنوان سے متعلق کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

۲) تحقیق میں حتیٰ الوسع اصل ماخذ و مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تاہم ضرورت کے تحت ثانوی مراجع کو بھی شامل تحقیق کیا گیا ہے۔

۳) مقالہ میں صحیحین کے علاوہ پیش کردہ احادیث کی تصحیح وتضعیف کے سلسلہ میں علامہ ناصر الدین البانیؒ کی تحقیق پر اعتماد کیا گیا ہے۔

۴) ممکنہ حد تک عبارت کو سادہ، سہل اور عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۵) موضوع زیر بحث سے متعلقہ عربی اور انگلش زبان میں موجود مواد کا ترجمہ اقتباسات کے پیش کرنے کے بعد اردو زبان میں پیش کیا گیا ہے۔

۶) اقتباسات کے حوالہ جات ہر صفحہ کے آخر میں (نئے نمبر شمار کے تحت) (فوٹ نوٹس) درج کئے گئے ہیں۔

۷) مقالے میں حوالہ جات، حواشی اور تعلیقات کے اندراج میں شعبے کے تحقیقی ضابطے کے مطابق طریقہ کار اختیار کیا گیا ہے۔ حوالہ کے لیے مصنف کا نام، کتاب کا نام، ناشر، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد نمبر اور صفحہ نمبر ترتیب وار دیئے گئے ہیں۔

۸) حوالہ جات میں مصنف اور کتاب کی مکمل تفصیلات صرف پہلی مرتبہ ہی دی گئی ہیں۔ اگر دوبارہ وہی حوالہ آئے تو صرف کتاب اور جلد و صفحہ نمبر دیا گیا ہے۔

۹) میں فارمیٹ کے مطابق کتاب کا نام پہلے اور مصنف کا نام و دیگر بعد میں درج کیا گیا ہے۔

۱۰) فہرست آیات میں آیات قرآنیہ کو سورتوں اور آیات کے نمبر کی ترتیب سے درج کیا گیا ہے۔

۱۱) احادیث مبارکہ کی فہرست کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۲) مصادر و مراجع کی فہرست کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

۱۳) مقالہ میں مذکور غیر معروف اعلام کا مختصر تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔

۱۴) مقالہ میں درج ذیل اختصارات کا استعمال کیا گیا ہے:

آیات کے لیے : ﴿.........﴾

احادیث کے لیے : ((.........))

اقتباسات کے لیے : ”.........“

ترجمہ کے لیے : (.........)

جلد اور صفحہ نمبر کو اکٹھا ظاہر کرنے کے لیے : ج/ص

صرف صفحہ نمبر ظاہر کرنے کے لیے : (اردو کے لیے) ص:

(انگلش کے لئے) P

ایک سے زائد حوالہ کے لئے (حوالوں کے لیے درمیان) : ؛

الی اخرہ ظاہر کرنے کے لیے : ...

نظریاتی تناظر

اس تحقیق کا نظریاتی تناظر اسلامی نظریۂ اعتدال پر مبنی ہے جس کے مطابق قرآنِ مجید نے امتِ مسلمہ کو "اُمَّةً وَسَطًا" قرار دے کر واضح کیا کہ اسلام کسی بھی قسم کی انتہاپسندی، غلو یا افراط و تفریط کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن و سنت کی تعلیمات صبر، حلم، عفو، برداشت اور توازن جیسے اخلاقی اوصاف پر زور دیتی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا حقیقی مزاج اعتدال پسندی ہے۔ اس مطالعے میں انتہاپسندی کو صرف مذہبی نہیں بلکہ سماجی و نفسیاتی مظہر کے طور پر بھی دیکھا گیا ہے، کیونکہ معاشی ناہمواری، سماجی محرومیاں اور فکری جمود ایسے عوامل ہیں جو شدت پسندی کو فروغ دیتے ہیں۔ اسی لیے فکری اعتدال کا نظریہ اس تحقیق کا بنیادی محور رہے، جو یہ واضح کرتا ہے کہ اسلام دینِ وسط ہے اور وہ فرد و معاشرہ دونوں میں توازن، رواداری اور انصاف کو قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ مزید برآں، اسلامی اخلاقیات جیسے عدل، مساوات، رحم اور امانت داری ایسے نظریاتی اصول فراہم کرتے ہیں جن کی روشنی میں انتہاپسندی کے اسباب و اثرات کا تجزیہ اور ان کے خاتمے کے لیے عملی رہنمائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

باب اول

انتہا پسندی: مفہوم، اسباب اور تاریخی ارتقاء

فصل اول　انتہا پسندی کا مفہوم اور شرعی نقطہ نظر
فصل دوم　اسلام میں اعتدال و توازن کی اہمیت
فصل سوم　انتہا پسندی کے اسباب و عوامل
فصل چہارم　انتہا پسندی کا تاریخی پس منظر

فصل اول
انتہا پسندی کا مفہوم اور شرعی نقطہ نظر

فصل اول

انتہا پسندی کا مفہوم اور شرعی نقطہ نظر

انتہا پسندی ایک گہرا اور پیچیدہ سماجی، مذہبی، اور سیاسی مسئلہ ہے جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو متاثر کرتا ہے۔ یہ ایک ذہنی، جذباتی اور سماجی کیفیت ہے جس میں افراد یا گروہ اپنے نظریات اور عقائد کو اس قدر قطعی مان لیتے ہیں کہ وہ کسی بھی اختلاف یا تنقید کو برداشت نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ دوسروں کے نقطہ نظر کو نہ صرف رد کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات اسے ختم کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ انتہا پسندی دراصل اعتدال سے ہٹ کر شدت اور انتہاء اختیار کرنے کا رجحان ہے، جس سے سوچ میں تنگ نظری اور معاشرتی ہم آہنگی میں کمی پیدا ہوتی ہے۔

یہ رجحان کسی ایک طبقے یا قوم تک محدود نہیں بلکہ عالمی سطح پر مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ مذہبی، سیاسی اور سماجی انتہا پسندی اس کی نمایاں اقسام ہیں۔ مذہبی انتہا پسندی میں افراد اپنے عقیدے کو اس حد تک برتر سمجھتے ہیں کہ دوسرے مذاہب اور نظریات کے لیے گنجائش باقی نہیں رہتی، جبکہ سیاسی انتہا پسندی میں مخالف نظریات رکھنے والوں کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح، سماجی انتہا پسندی میں طبقاتی فرق اور معاشرتی ناانصافی کے خلاف ردعمل شدت اختیار کر لیتا ہے۔

انتہا پسندی کی ابتدا ذہنی سطح سے ہوتی ہے، جہاں فرد یا گروہ حقیقت کو ایک محدود زاویے سے دیکھنے لگتا ہے۔ یہ تنگ نظری آگے چل کر عمل میں شدت پیدا کرتی ہے، جس کے نتیجے میں معاشرہ بے چینی، نفرت اور تصادم کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کے اسباب میں تعلیم کی کمی، مذہبی تعلیمات کی غلط تعبیر، سیاسی اقتدار کی ہوس، معاشی دباؤ، اور سماجی ناانصافی جیسے عوامل شامل ہیں، جو انسان کو دوسروں کے حقوق اور آزادی کو نظر انداز کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ مجموعی طور پر، انتہا پسندی ایک خطرناک سماجی بیماری ہے جو فرد اور معاشرے دونوں کی فکری و جذباتی صحت کو متاثر کرتی ہے۔ اس کا سدباب انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر ضروری ہے تاکہ معاشرے میں توازن اور ہم آہنگی قائم ہو سکے۔

اسلامی نقطہ نظر سے، غلوّ اور انتہا پسندی فکری انحراف کی صورتیں ہیں جو انسان کو اعتدال سے ہٹا کر افراط و تفریط کی راہ پر لے جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے ایسے رویوں کی سختی سے مذمت کی ہے اور اس کے برعکس عدل، توازن اور وسطیت (اعتدال) کو پسند فرمایا ہے، کیونکہ یہی راستہ انسانی معاشرے میں امن، انصاف اور استحکام کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

انتہا پسندی: تعبیرات و مفاہیم کا جائزہ

لفظ "انتہا پسندی" دو زبانوں سے مل کر بنا ہے، جن میں "انتہا" (عربی) اور "پسند" (فارسی) کا لفظ ہے، جس کے معنی حد سے آگے بڑھنے یا کسی بات میں حد سے زیادہ میلان رکھنے کے ہیں۔ انتہا پسندی دراصل "اعتدال" کی ضد ہے، یعنی جب انسان عدل و توازن کو نظر انداز کر کے درمیانی راستہ چھوڑ دیتا ہے تو یہی رویہ انتہا پسندی کہلاتا ہے۔ انتہا پسندی سے مراد کسی نظریے، سوچ یا عمل میں ایسی شدت اور سختی پیدا کر لینا ہے کہ اعتدال کی گنجائش باقی نہ رہے۔

اگرچہ قرآنِ کریم میں لفظ "انتہا پسندی" براہِ راست موجود نہیں، تاہم اس مفہوم کو واضح کرنے والے کئی الفاظ قرآن میں مختلف مقامات پر آئے ہیں، جیسے "غلوّ" (حد سے بڑھ جانا)، "اعتداء" (زیادتی کرنا، حد سے تجاوز کرنا)، "بغی" (سرکشی و بغاوت)، "طغیان" (نافرمانی اور حد سے تجاوز) اور "فساد" (بگاڑ اور امن و انصاف کا خاتمہ)۔ ان تمام الفاظ کے استعمال سے واضح ہوتا ہے کہ انتہا پسندی ظلم، زیادتی، جبر اور تشدد کو جنم دیتی ہے، جس کے نتیجے میں معاشرتی نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور فتنہ و فساد پھیل جاتا ہے۔

چنانچہ قرآن کی روشنی میں حدِ اعتدال سے آگے بڑھ جانا دراصل حدود شکنی اور ظلم و زیادتی کے مترادف ہے، جس کی سخت مذمت کی گئی ہے، جبکہ اس کے برعکس "وسطیت" (اعتدال و توازن) کو پسند فرمایا گیا ہے۔ یہی رویہ اسلامی تعلیمات کا بنیادی اور پسندیدہ اصول ہے۔

انتہا پسندی کے مفہوم کو مختلف تعبیرات اور اصطلاحات کے ذریعے واضح کیا گیا ہے، جن میں غلوّ، اعتداء، بغی، طغیان، اسراف، فساد فی الارض، تصلب اور تطرف خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اگرچہ یہ تمام اصطلاحات اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف پہلو رکھتی ہیں، مگر ان سب میں ایک بنیادی قدر مشترک ہے، اور وہ ہے شدت، حد سے تجاوز اور اعتدال سے انحراف۔ غلوّ اس رویے کو ظاہر کرتا ہے جس میں انسان کسی عقیدے یا عمل میں اعتدال کی حد پار کر جائے۔ اعتداء اور بغی ظلم، زیادتی اور دوسروں کے حقوق پامال کرنے کی علامت ہیں، جبکہ طغیان اور اسراف میں نفس یا عمل کا سرکشی، بے اعتدالی اور حد سے بڑھ جانے کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح فساد فی الارض اس طرزِ عمل کو بیان کرتا ہے جو معاشرتی امن و انصاف کو تباہ کر دیتا ہے اور بگاڑ کو فروغ دیتا ہے۔ تصلب اور تطرف فکری و نظریاتی سختی، تنگ نظری اور انتہا پسندانہ جمود کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ان تمام اصطلاحات کے مجموعی مفہوم سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انتہا پسندی محض ایک فکری یا نظریاتی رجحان نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر انحرافی رویہ ہے جو انسان کی سوچ، کردار اور معاشرتی توازن تینوں کو متاثر کرتا ہے۔ یہ رویہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان میانہ روی، رواداری اور عدل و انصاف کے اصولوں کو چھوڑ کر

شدت، تعصب اور نفرت کی راہ اختیار کر لیتا ہے، جس کا نتیجہ معاشرتی انتشار، بے امنی اور باہمی تصادم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

غلو

قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویہ میں انتہا پسندی کے مفہوم کو "غلوّ" کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔ غلوّ کے لغوی معنی ہیں کسی معاملے میں حد سے آگے بڑھ جانا یا اعتدال کی حد کو پار کر جانا۔ دینِ اسلام نے ہمیشہ ہر پہلو میں میانہ روی، اعتدال اور توازن کو پسند فرمایا ہے، جبکہ غلوّ کو افراط، فساد اور گمراہی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنی امت کو غلوّ سے سختی کے ساتھ منع فرمایا اور اسے گزشتہ امتوں کی تباہی کا بنیادی سبب بتایا۔ قرآنِ کریم میں بھی اہلِ کتاب کو دین کے معاملات میں غلوّ سے روکا گیا، تاکہ وہ اعتدال اور حقیقت کے راستے پر قائم رہیں۔

ان تعلیمات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ غلوّ محض ایک اخلاقی یا فکری کمزوری نہیں بلکہ دینی انحراف کی ایک خطرناک صورت ہے، جو انسان کو شدت، تنگ نظری اور ناحق تعصب کی طرف لے جاتی ہے۔ یہی کیفیت آج کے زمانے میں "انتہا پسندی" کے نام سے جانی جاتی ہے، جو دراصل اسی رویے کا تسلسل ہے کہ جب کوئی فرد یا گروہ دین، نظریے یا عمل میں اعتدال چھوڑ کر شدت اختیار کر لیتا ہے اور اپنے مؤقف کے سوا کسی اور رائے کو برداشت نہیں کرتا۔

ابن منظور غلو کے معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"غَلا في الدِّينِ والأَمْرِ يَغْلُو غُلُوًّا: جاوَزَ حَدَّهُ، وأَغْلَى في الأَمرِ: أَفْرَطَ فيه. والغَلاءُ: فِي السِّعْرِ، وغَلِيَ الماءُ يَغْلِي غَلَيانًا، والغُلْواءُ: الفَرَسُ الشديدُ. وكلُّ ما جاوَزَ القَدْرَ فَقَدْ غَلا فيه[1]" .

دین یا کسی (دیگر) معاملے میں غلا کا مطلب ہے: اس کی حد سے تجاوز کرنا۔ اور 'أَغْلَى فِي الأَمر' کا مفہوم ہے: کسی کام میں حد سے زیادہ سختی یا شدت اختیار کرنا (افراط کرنا)۔ 'غَلاء' قیمت کے بارے میں بولا جاتا ہے، یعنی نرخوں کا بڑھ جانا۔ 'غَلِيَ الماءُ' یعنی پانی کا جوش کھانا یا ابلنا۔ 'غُلْواء' اس سخت اور سرکش گھوڑے کو کہا جاتا ہے جو قابو میں نہ آئے۔ اور ہر وہ چیز جو اپنی مقررہ حد سے تجاوز کر جائے، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں غلو ہوا ہے۔

ابن سیدہ غلو کی لغوی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، دار صادر، بیروت، ۱۴۱۴ھ، مادۃ (غلو)، ج۱۵، ص ۱۳۲

"الغلو لغةً: مأخوذ من" غلا في الأمر غلواً أي: تجاوز حده[1]۔

غلو لغت میں: غلا في الأمر غلواً: سے **مشتق** ہے **یعنی** حد سے بڑھ جانا، تجاوز کرنا۔

قرآن مجید میں بھی غلو کا لفظ استعمال ہوا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَاَ هْلَ ا لْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْ ا فِىْ دِ يْنِكُمْ ﴾[2]

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو سے کام نہ لو۔

علامہ طبرسی علیہ الرحمہ نے غلو کی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا ہے:

"لا تتجاوزوا الحد الذي حدّه الله لكم إلى الازدياد، وضده: التقصير وهو الخروج عن الحد إلى النقصان، والزيادة في الحد والنقصان عنه كلاهما فساد، ودين الله الذي أمر به هو بين الغلو والتقصير وهو الاقتصار على ما حدّه الله تعالى[3]۔

یعنی اس حد سے آگے نہ بڑھو جو اللہ نے تمہارے لیے مقرر کی ہے۔ غلو کا ضد تقصیر ہے، یعنی حد سے پیچھے رہ جانا۔ حد سے آگے بڑھنا اور حد سے پیچھے رہنا دونوں فساد ہیں۔ اللہ کا دین وہ ہے جس کا حکم دیا گیا ہے، جو غلو اور تقصیر کے درمیان ہے، اور وہ ہے اللہ کی مقرر کردہ حد پر اکتفا کرنا۔

کسی چیز میں حد سے تجاوز کرنا افراط کہلاتا ہے۔ اگر یہ تجاوز کسی کی قدر و منزلت یا فضیلت کے بارے میں ہو تو اسے "غلوّ" کہا جاتا ہے، اور اگر یہ اشیاء کے نرخ یا قیمتوں سے متعلق ہو تو اسے "غلاء" (یعنی مہنگائی) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ابلنے یا جوش کھانے کی کیفیت کو "غلیان" کہا جاتا ہے، جبکہ غیر معمولی سرکش یا تیز رفتار حیوان کے لیے لفظ "غلواء" استعمال ہوتا ہے۔ ان تمام مفاہیم میں ایک ہی فعل کے بنیادی معنی یعنی حد سے تجاوز کرنا پائے جاتے ہیں۔

الاعتداء

دوسرا لفظ جو انتہا پسندی کے معنی میں استعمال ہوا ہے وہ اعتداء ہے۔ اس کا مادہ: (ع د و) ہے جس کا معانی حد سے تجاوز کرنے، زیادتی کرنا کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن میں متعدد مقام پہ آیا ہے جن میں سے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾[4]۔

---

[1] ابن سیدہ، ابوالحسن علی بن اسماعیل، المحکم والمحیط الأعظم، دار الکتب العلمیہ بیروت ۲۰۰۰م، تحقیق: عبدالحمید ہنداوی، ج۶ص ۵۷

[2] سورۃ النساء: ۱۷۱

[3] الطبرسی، ابو علی فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، دار العلوم بیروت، لبنان، ج۳ص ۴۱۰

[4] البقرہ: ۱۹۰

اور حد سے تجاوز نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ حد سے نکلنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لسان العرب میں ہے:

"العُدْوانُ والاعتداء: ظُلْمٌ وتجاوُزُ الحَدِّ"[1]۔ اعتداء کا مطلب ہے ظلم کرنا اور حد سے تجاوز کرنا۔

یہ لفظ انتہا پسندی کے تشدد والے پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔

راغب اصفہانی اس مفہوم بیان کرتے ہیں:

العُدْوانُ: "هو تجاوز ما هو حقّ إلى ما ليس بحقّ"[2]۔

عدوان یہ ہے کہ حق کی حد سے نکل کر اس چیز میں جانا جو حق نہیں۔

لفظ "الاعتداء" عربی زبان میں "حد سے تجاوز کرنے" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ اس حالت کو ظاہر کرتا ہے جب کوئی شخص کسی معاملے میں عدل و انصاف کی حدود پار کر جائے۔ یہ مفہوم صرف جسمانی ظلم یا زیادتی تک محدود نہیں بلکہ قول، عمل اور رویے میں بھی ناانصافی، سختی یا زیادتی کے تمام پہلوؤں کو شامل کرتا ہے۔ شرعی اعتبار سے الاعتداء کا مطلب ہے حق و باطل کی سرحد عبور کرنا، اللہ کے مقرر کردہ اصولوں سے تجاوز کرنا، یا دوسروں کے جائز حقوق کو پامال کرنا۔ قرآنِ کریم میں کئی مقامات پر اس رویے کی سخت مذمت کی گئی ہے اور مومنوں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اعتدال، انصاف اور میانہ روی کو اختیار کریں، کیونکہ الاعتداء ظلم، فساد اور معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔

البغی

ایک اور لفظ جو انتہا پسندی کے معنی میں استعمال ہوا ہے وہ لفظ البغی ہے، علامہ فیروز آبادی اس کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

البَغْيُ: "الفِسْقُ، والطُّغْيانُ، والعُدْوانُ، والظُّلْمُ"[3]۔ بَغی فسق، سرکشی، زیادتی اور ظلم کو کہتے ہیں۔

یہ لفظ قرآن میں متعدد مقام پر آیا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ[4]﴾۔

کہہ دو! میرے رب نے بے حیائی، کھلے اور چھپے سب حرام کیے ہیں اور گناہ اور ناحق سرکشی بھی۔

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۵، ص ۸۴

[2] اصفہانی، حسین بن محمد ابو القاسم، المفردات فی غریب القرآن، تحقیق صفوان عدنان داوودی، دار القلم، دمشق، مادہ: عدو، ص ۵۷۰

[3] الفیروز آبادی، مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب، القاموس المحیط، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، مادہ، ب غ ي، ج ۱، ص ۲۰۶

[4] سورۃ الاعراف: ۳۳

لفظ "بغی" کے معنی ہیں ناحق سرکشی، ظلم اور زیادتی۔ یہ اس رویے کی نشاندہی کرتا ہے جب انسان حق و انصاف سے ہٹ کر دوسروں پر زیادتی کرتا ہے یا اپنی خواہشاتِ نفس کو عدل پر غالب کر دیتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بغی کو ان اعمال میں شمار کیا گیا ہے جو معاشرتی انصاف اور توازن کو بگاڑ دیتے ہیں اور انسانوں کے درمیان فساد، ظلم اور نااتفاقی پیدا کرتے ہیں۔ یہ رویہ صرف فردی سطح تک محدود نہیں بلکہ اجتماعی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے، جیسے سیاسی جبر، مذہبی شدت پسندی یا معاشرتی ناانصافی۔ جب یہی رویہ شدت اختیار کر لیتا ہے تو وہ انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جو معاشرتی امن و توازن کے لیے خطرہ بن جاتی ہے۔

طغیان

ایک اور عربی لفظ جو انتہا پسندی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، وہ لفظ طغیان ہے، اس کا مادہ، ط غ ی ہے جس کا معنی سرکشی، حد سے تجاوز کرنا ہوتا ہے۔ لسان العرب میں ہے:

الطُّغْيانُ: "مجاوَزَةُ الحَدِّ في الكُفْرِ والعُصيانِ. وطَغَى الماءُ: جاوَزَ القَدْرَ حتى عَلا وغَمَرَ"[1]۔

طغیان کا مطلب ہے کفر اور نافرمانی میں حد سے بڑھ جانا، یا کسی شے کا اپنی حد سے بڑھ جانا (جیسے پانی کا طغیان یعنی سیلاب کی طرح بہہ جانا)۔

قرآن مجید میں بھی اس کا مادہ طَغَىٰ استعمال ہوا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ﴾[2]۔

بیشک جب پانی حد سے بڑھ گیا تھا تو ہم نے تمہیں (تمہارے آباءواجداد کو) کشتی میں سوار کیا۔

اور دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ فِرْعَوْنَ طَغَىٰ ﴾[3]۔ بیشک فرعون نے سرکشی کی تھی۔

طغیان کا مطلب ہے حد سے تجاوز کرنا، جو انتہا پسندی کا بنیادی وصف ہے۔

سورہ العلق میں ہے: ﴿كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى﴾[4]۔ بے شک انسان حد سے نکل جاتا ہے۔

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۵، ص ۱۸۷

[2] سورۃ الحاقہ: ۱۱

[3] سورۃ النازعات: ۱۷

[4] سورۃ العلق: ۶

لفظ "طغیان" اس طرزِ عمل کو ظاہر کرتا ہے جس میں انسان یا کوئی طاقت اپنی مقررہ حد سے آگے بڑھ جاتی ہے۔ یہ رویہ سرکشی، نافرمانی اور ظلم کی انتہا کی علامت ہے۔ طغیان صرف فرد کے کردار تک محدود نہیں رہتا بلکہ اجتماعی اور سیاسی سطح پر بھی نمایاں ہوتا ہے، مثلاً اقتدار کے استعمال میں ظلم، جبر یا نظریاتی شدت پسندی کی صورت میں۔ قرآنِ کریم میں طغیان ان رویوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو انسان کو اللہ کی اطاعت اور انصاف کے راستے سے ہٹا کر تکبر، غرور اور زیادتی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس طرح طغیان دراصل انتہاپسندی کی ایک نمایاں شکل ہے جو اعتدال کے مقابلے میں افراط اور انحراف کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔

مسرف

ایک اور لفظ جو کثرت سے عربی زبان میں انتہاپسندی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے وہ **مسرف، اسراف ہے**، اس کا مادہ سرف ہے، علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

"السَّرَفُ: تَجَاوُزُ الحَدِّ في كُلِّ فِعْلٍ وقَوْلٍ، ويُقَالُ للمُسْرِفِ: مَنْ يَصْرِفُ شَيْئاً في غَيْرِ حَقِّهِ[1] -

سرف ہر قول و فعل میں حد سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ اور "مسرف" اس کو کہا جاتا ہے جو کسی چیز کو اس کے حق کے بغیر خرچ کرے۔

لسان العرب میں ہے:

"السَّرَفُ: تجاوز الحَدِّ في كلِّ فعلٍ يفعله الإنسانُ"[2]-

سَرَف کا مطلب ہے ہر اس عمل میں حد سے تجاوز کرنا جو انسان کرے۔

قرآن مجید میں لفظ مُسرِف (اسراف کرنے والا) کئی مقامات پر آیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾[3] -

ا. اسراف: حد سے تجاوز کرنا، یعنی افعال و اقوال میں افراط اور بے اعتدالی سے کام لینا۔ جب یہی افراط فکری، نظریاتی یا رویّے کی سطح پر ظاہر ہونے لگتی ہے تو وہ انتہاپسندی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں، انتہاپسندی دراصل اسراف کی فکری اور عملی توسیع ہے، کیونکہ ہر قسم کی انتہاپسندی کسی نہ کسی درجے میں اسراف ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

---

[1] اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، مادہ: سرف، ص ۲۳۶

[2] ابن منظور، لسان العرب، مادہ: سرف، ج۹، ص ۱۴۸

[3] سورۃ الأعراف: ۳۱

انتہا پسندی کو اکثر اسراف کی ایک نمایاں شکل کہا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر:

مذہب میں اسراف اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب عبادات میں حد سے بڑھا جائے اور دین کو سختی اور تنگی کا سبب بنا دیا جائے۔

سیاست میں اسراف طاقت کا غلط استعمال اور دوسروں کے حقوق کی پامالی کی صورت میں نظر آتا ہے۔

جبکہ سماجی سطح پر اسراف کا مظہر شدت، نفرت اور عدم برداشت کے فروغ کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

الغرض اسراف انسان کے افعال اور رویّوں میں پیدا ہوتا ہے، اور جب یہ افراط بڑھتی چلی جاتی ہے تو آخرکار انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جو اعتدال اور توازن کے خلاف ایک انحرافی طرزِ عمل ہے۔

فساد فی الارض

ایک اور لفظ جو انتہا پسندی کے قریب قریب معنی میں استعمال ہوتا ہے وہ لفظ ہے "فساد فی الارض" ہے، فساد کا مادہ (ف س د) ہے۔ ابن منظور لکھتے ہیں:

"الفَسادُ نقيضُ الصَّلاحِ، فَسَدَ الشيءُ يَفْسُدُ فَسادًا وفُسُودًا: بَطَلَ وغَيْرَ صَلاحِه"[1]۔

فساد، اصلاح (درستگی) کا الٹ ہے۔ کسی چیز کا فاسد ہونا یعنی اس کا درستگی سے نکل جانا، بیکار یا بطلان کی حالت میں آ جانا۔

علامہ الزبیدی فساد کا معنی لکھتے ہیں:

"الفَسادُ: نَقيضُ الصَّلاحِ، وهو الخَلَلُ واضطرابُ الأُمورِ"[2]۔

فساد، صلاح کا الٹ ہے، یعنی خرابی، بگاڑ اور امور میں انتشار پیدا ہونا۔

قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر "فساد فی الارض" کا مفہوم انتہا پسندی اور شدت پسندی کے معنی میں بھی بیان کیا گیا ہے۔، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللَّهَ عَلَىٰ مَا فِي قَلْبِهِ وَهُوَ أَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ﴾[3]۔

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، ج۳، ص ۳۳۵

[2] الزبیدی، ابو الفضل محمد بن محمد، تاج العروس من جواہر القاموس، تحقیق عبد الستار احمد فراج، دار الھدایہ، ج۱۰، ص ۲۴۸

[3] سورۃ البقرہ: ۲۰۴-۲۰۵

اور لوگوں میں بعض ایسا بھی ہے جس کی بات دنیا کی زندگی میں آپ کو بھلی معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے دل کی باتوں پر اللہ کو گواہ کرتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے۔

انتہاپسندانہ سوچ کا نتیجہ زمین میں فساد، جانوں اور نسلوں کی بربادی ہے۔

قرآنِ کریم میں "فساد فی الارض" کا تصور انتہا پسندی اور شدت پسندی کے مفہوم سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ لغوی طور پر فساد، اصلاح اور درستگی کے برعکس ہے، یعنی خرابی، بگاڑ اور انتشار پیدا کرنا۔ مفسرین کے مطابق جب انسان ظلم، ناانصافی، اور زیادتی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ دراصل زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔ ایسے لوگ بظاہر نیکی اور اصلاح کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر ان کے اعمال درحقیقت تباہی، نقصان اور بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔

انتہا پسندی کا رویہ بھی اسی فساد کی ایک شکل ہے، کیونکہ یہ معاشرتی امن، انسانی زندگی اور نسلوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ طرزِ فکر اصلاح کے نام پر بگاڑ پیدا کرتا ہے، اور خیر کے لبادے میں شر کو فروغ دیتا ہے۔ قرآن واضح طور پر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا، انتہا پسندی دراصل فساد فی الارض ہی کی ایک عملی صورت ہے جو ظاہری طور پر نیکی یا حق کے نام پر ظاہر ہوتی ہے، مگر اپنے انجام میں معاشرے کے لیے نقصان، انتشار اور تباہی کا سبب بنتی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ زمین میں فساد پھیلانے والے اعمال اور انتہاپسندی دونوں ہی انسان اور معاشرے کے لیے تباہ کن رویے ہیں۔

تَصَلَّب

عربی معاجم اور قوامیس میں انتہا پسندی کے لیے ایک اور لفظ تَصَلَّب ہے۔ اس کا مادہ (ص ل ب) ہے کہا جاتا ہے "صار صلباً وہ متشدد ہو گیا۔ ابن منظور لکھتے ہیں:

"الصلابة تعني الشدة والمتانة في الشيء أو الشخص، وتشير إلى القوة والاستقامة. التصلب يعني اتخاذ موقف صارم أو التشدد في التعامل، سواء مع الأمور أو مع الآخرين" (1)۔

صلابیت کا مطلب ہے کسی چیز یا شخص میں سختی اور مضبوطی، یعنی طاقت اور استقامت۔ "تصلب" کا مطلب ہے سخت موقف اختیار کرنا یا معاملات میں شدت پسندی دکھانا، چاہے وہ چیزوں کے ساتھ ہو یا دوسروں کے ساتھ۔

کہا جاتا ہے "هو صُلْبٌ في دينه"اي شديد فيه۔

---

(1) ابن منظور، لسان العرب، ج۲ ص ۲۸۰

وہ اپنے دین میں سخت ہے یعنی اس میں تشدد برتتا ہے۔

تاج العروس میں ہے۔

تَصَلَّبَ: "تَشَدَّدَ وتَقَوَّى وصارَ صَلْباً بعيداً عن اللِّينِ"[1]۔

تَصَلَّبَ کا مطلب ہے سختی اختیار کرنا، طاقتور ہونا اور نرم خوئی سے دور ہونا۔

المعجم الوسیط" نے بھی تصلب کے معنی تشدد، طاقتور بننے اور سختی و درشتی کے بیان کئے ہیں[2]۔

اگرچہ قرآنِ مجید میں لفظ تَصَلَّب استعمال نہیں ہوا، لیکن اس کے مفہوم کو مختلف آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں شدت پسندی، سخت رویہ اور فساد کے مفہوم کو واضح کیا گیا ہے، جو تَصَلَّب کے مفہوم سے ہم آہنگ ہیں۔

لغوی طور پر تصلب کے معنی سختی اختیار کرنا، مضبوط ہونا اور نرمی سے دور رہنا ہیں۔ یہ لفظ کسی شخص یا چیز میں استقامت، طاقت اور عدمِ لچک کو ظاہر کرتا ہے۔ مفسرین کے مطابق اگر کوئی شخص دین یا معاملات میں صلب مزاج ہو تو اس میں شدت پسندی اور سخت رویہ پایا جاتا ہے۔ معاجم میں بھی تصلب کو تشدد، طاقتور بننے اور سختی اختیار کرنے کے معنوں میں بیان کیا گیا ہے۔ ایسا شخص جو بظاہر نیک دکھائی دیتا ہے مگر اس کے اعمال فساد یا تباہی کا باعث بنتے ہیں، دراصل تَصَلَّب کے مفہوم کی مثال ہے۔ اس رویے میں سختی، عدمِ برداشت اور شدت پسندی نمایاں ہوتی ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ تصلب اعتدال کے برعکس رویہ ہے جو کسی بھی نظام، مذہب یا تعلقات میں شدت، تنگ نظری اور انتہا پسندی کی علامت بن جاتا ہے۔

تَطَرَّف

تطرف سے مراد کسی بھی معاملے میں اعتدال اور میانہ روی سے ہٹ کر ایک طرف کی انتہا اختیار کرنا ہے۔ جب انسان توازن کھو بیٹھتا ہے اور دین، سوچ یا عمل میں ایک رخ پر شدت اختیار کر لیتا ہے تو وہ تطرف کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی رویہ آگے چل کر انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انتہا پسندی تب جنم لیتی ہے جب کوئی فرد یا گروہ اپنے نظریے کو ہی حتمی حق سمجھ کر دوسروں کی آراء اور حدود کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نتیجے میں انسان رواداری، اعتدال اور توازن سے محروم ہو کر سختی، نفرت اور تشدد کی راہ اپناتا ہے۔ یوں تطرف دراصل انتہا پسندی کی جڑ ہے،

---

[1] الزبیدی، تاج العروس من جواہر القاموس، تحقیق عبد الستار احمد فراج، دار الھدایۃ، ج۷، ص ۱۱۲

[2] المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیہ، مکتبۃ الشروق الدولیہ، ۲۰۰۴، ص:۵۱۹ باب الصاد، مادۃ صلب

کیونکہ یہ درمیانی راستے سے انحراف اور فکر و عمل میں حد سے آگے بڑھ جانے کا رویہ ہے، جو بالآخر معاشرتی بگاڑ اور فساد کا سبب بن جاتا ہے۔

تطرف کا مادہ (ط ر ف) ہے۔ اور "الطَرَف" کے معنی ہیں: "منتهي كلّ شيء"[1]۔ ہر چیز کا انتہائی سرا

ابن منظور "تطرف" کا معنی بیان کرتے ہیں:

"التَّطَرُّفُ: الذَّهابُ إلى طَرَفِ الشيءِ. وتَطَرَّفَ في الأَمرِ: جاوَزَ حَدَّهُ وأخَذَ في أَطْرافِهِ"[2]۔

تطرّف کا مطلب ہے کسی چیز کے کنارے یا سرے تک جانا۔ کسی معاملے میں تطرّف کرنے کا مطلب ہے اس کی حد سے تجاوز کرنا اور اسے انتہا تک لے جانا۔

علامہ فیروزآبادی تطرف کا معنی بیان کرتے ہیں:

"تَطَرَّفَ: أَخَذَ في الطَّرَفِ أو مالَ إليه"[3]۔

تطرّف کا مطلب ہے کنارے پر آجانا یا اس کی طرف جھک جانا۔

تاج العروس میں ہے:

تَطَرَّفَ: بَلَغَ الطَّرَفَ في الشيءِ وخَرَجَ عن وَسَطِه[4]۔

تطرّف کا مطلب ہے کسی چیز کے کنارے تک پہنچ جانا اور اس کے وسط سے نکل جانا۔

وہ حدِ اعتدال سے تجاوز کر گیا، کہا جاتا ہے۔

"تَطَرَّف في آرائه" فهو مُتَطَرِّف اي جاوزحدّ الاعتدال فيها "[5]۔

اس کے خیالات میں انتہا پسندی ہے، لہٰذا وہ ایک انتہا پسند ہے، یعنی وہ ان میں اعتدال کی حد سے آگے نکل گیا ہے۔

گویا تطرّف کے بنیادی معنی کسی چیز کے کنارے یا انتہا تک پہنچنے، میانہ روی چھوڑ کر حد سے آگے بڑھ جانے یا اعتدال کے بجائے کسی ایک طرف جھکنے کے ہیں۔ اسی وجہ سے آج کے دور میں "تطرّف" کا لفظ مجازی طور پر انتہا پسندی (Extremism) کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ یہ رویہ اعتدال یا وسط سے ہٹ کر کسی ایک سمت میں شدت یا افراط کو ظاہر کرتا ہے۔ یوں تطرّف دراصل اس حالت کو بیان کرتا ہے جہاں انسان یا گروہ توازن کھو کر

---

[1] المعجم الوسیط، ص:۵۵۵، باب الطاء، مادۃ طرف

[2] ابن منظور، لسان العرب، ج۹، ص۱۸۹

[3] الفیروز آبادی، القاموس المحیط، ج۲، ص۳۲۱

[4] الزبیدی، تاج العروس من جواہر القاموس، ج۱۱، ص۴۲

[5] الزبیدی، تاج العروس من جواہر القاموس، ج۱۱، ص۴۲

کسی خاص نظریے یا سمت میں ضرورت سے زیادہ جھکاؤ اختیار کرلیتا ہے۔

انتہا پسندی کا اصطلاحی مفہوم

ائمہ کرام نے انتہا پسندی (الغلو) کو مختلف پہلوؤں سے بیان کیا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ دین میں حد سے آگے بڑھنے کا نام ہے، جبکہ بعض نے اسے اعتدال سے ہٹ کر سختی اور شدت اختیار کرنے کے رویے کے طور پر سمجھایا ہے۔ ان کے مطابق اسلام کی اصل روح توازن، میانہ روی اور اعتدال پر قائم ہے، اس لیے جو بھی طرزِ عمل ان اصولوں سے تجاوز کرے، وہ انتہا پسندی کہلاتا ہے۔ ائمہ کے نزدیک یہ رجحان فکری، اعتقادی، فقہی اور عملی سطح پر امت میں اختلافات اور بگاڑ کا بنیادی ذریعہ بنتا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ انتہا پسندی اور غلوّ کی تعریف کرتے ہیں:

"المبالغة في الشيء والتشديد فيه بتجاوز الحد "[1]۔

یعنی حدود کو پامال کرکے مبالغہ و تشدد سے کام لینا۔

اسی طرح حافظ ابن حجر رحمہ اللہ حدیث ((هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ))[2]۔ کی شرح میں لکھتے ہیں:

"المتنطعون هم المتعمقون الغالون في الكلام والفعل "[3]

متنطع وہ لوگ ہیں جو بات اور عمل میں غلوّ اور شدت اختیار کرتے ہیں۔

گویا اس حدیث میں "المتنطعون" سے مراد وہ لوگ ہیں جو دین کے معاملات میں حد سے بڑھ جاتے ہیں، غیر ضروری سختی اختیار کرتے ہیں، اور معمولی امور میں بھی شدت دکھاتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ تین مرتبہ ارشاد فرما کر امت کو متنبہ کیا کہ دین میں انتہا پسندی، شدت یا بے جا سختی اختیار کرنا نہ صرف گمراہی بلکہ ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔ اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا مزاج آسانی، اعتدال اور نرمی پر مبنی ہے، جبکہ "المتنطعون" جیسے رویے دین کے توازن اور اصل روح کے خلاف ہیں، یہاں بھی انتہا پسندی کو غلوّ اور شدت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ، حدیث ((إيَّاكم والغلوَّ في الدِّين، فإنَّما أهلكَ مَن كانَ قبلَكمُ الغلوُّ في الدِّين))[4]۔ کی شرح میں غلو کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] ابن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح البخاری، المکتبہ السلفیہ مصر ۱۳۸۰-۱۳۹۰ھ، ج۱۳، ص۲۷۸

[2] مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، دار احیاء التراث العربی، بیروت، حدیث:۲۶۷۰

[3] ابن حجر، فتح الباری، ج۱۳، ص۲۷۸

[4] النسائی، احمد بن شعیب، ابو عبد الرحمن، سنن النسائی، حلب، المکتب المطبوعات الاسلامیۃ، ۱۴۰۶ھ، کتاب المناسک، باب التغلیظ فیمن اَتی عرفات (حدیث:۳۰۵۷)

"الغلو هو التعمق في الشيء والمبالغة فيه، وهو منهيّ عنه في الدين "[1]

غلو کسی چیز میں ضرورت سے زیادہ گہرائی اختیار کرنے اور اس میں مبالغہ آرائی کرنے کو کہتے ہیں، اور دین میں اس سے منع کیا گیا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ غلو کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"والغلو مجاوزة الحد بأن يزاد الشيء في حمده أو ذمه على ما يستحق "[2]۔

غلو کا مطلب حد سے تجاوز کرنا ہے، یعنی کسی چیز کی تعریف یا مذمت میں اسے اس کے حقیقی مقام سے بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔

یعنی اگر کوئی شخص کسی بھی معاملے میں میانہ روی چھوڑ کر حد سے آگے بڑھ جائے، چاہے وہ محبت میں ہو یا نفرت میں، تو وہ دراصل انتہا پسندی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی غلو بعد میں مذہبی شدت، سخت رویّے اور عدم برداشت کی صورت اختیار کر لیتا ہے، جو اسلام کی اعتدال، نرمی اور برداشت پر مبنی تعلیمات کے بالکل منافی ہے۔

راغب اصفہانی نے انتہا پسندی (غلوّ) کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے:

الغُلُوّ: "مُجَاوَزَةُ الحَدِّ فِي كُلِّ فِعْلٍ أو قَوْلٍ"[3]۔ غلوّ ہر قول یا فعل میں حد سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔

یہی غلوّ بعد میں "تطرف" اور "انتہا پسندی" کے مفہوم کی بنیاد ہے۔

"التطرف الديني هو الابتعاد عمّا حدّه الله ورسوله، والميل إلى أقاصي الأفكار أو الممارسات الدينية، دون مراعاة لحدود الاعتدال التي شرّعها الدين".[4]

دینی انتہا پسندی (التطرف الدینی) اس روش کو کہتے ہیں جس میں انسان اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ حدود سے ہٹ جائے اور دینی خیالات یا اعمال میں حد سے زیادہ شدت یا انتہا اختیار کر لے، بغیر اس کے کہ دین نے جس اعتدال اور توازن کی تعلیم دی ہے، اس کا خیال رکھا جائے۔

---

[1] النووی، یحیٰ بن شرف، ابوزکریا، المنہاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، داراحیاء التراث العربی بیروت، ۱۳۹۲ھ، ج۸، ص ۲۷

[2] ابن تیمیہ، اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ اصحاب الجحیم، دار عالم الکتب، بیروت، لبنان، الطبعۃ السابعۃ، ۱۴۱۹ھ-۱۹۹۹م ج۱، ۳۲۸

[3] راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، ص ۶۰۱

[4] ابن منظور، لسان العرب، ج۹، ص ۱۸۹، مادہ: طرف

بعض علما کے نزدیک غلوّ کا لفظ دو طرح کے رویّوں پر بولا جاتا ہے، یعنی حد سے بڑھ جانا(افراط) اور حد سے پیچھے رہ جانا(تفریط)۔ جبکہ کچھ اہل علم کے مطابق غلوّ صرف افراط، یعنی زیادتی یا حد سے آگے بڑھنے تک محدود ہے، اور اس کے برعکس تفریط کے لیے تقصیر کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی رحمہ اللہ انتہا پسندی کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"التطرّف: مجاوزة حدّ الاعتدال، والميل إلى طرفٍ دون الوسط "[1]

تطرّف اعتدال کی حد سے نکل جانا اور میانہ روی کے بجائے کسی ایک انتہا کی طرف جھک جانا ہے۔

"التطرّف الديني هو الابتعاد عن حدود الشريعة التي حدّدها الله ورسوله، فيتّسم بالغلوّ أو التفريط في العقائد أو العبادات أو المعاملات"[2]۔

دینی انتہا پسندی وہ ہے جو شریعت کی ان حدود سے دوری ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مقرر کیں؛ اور اس میں عقائد، عبادات یا معاملات میں غلو یا قصر(تفریط) شامل ہوتا ہے۔

انگریزی زبان میں انتہا پسندی کے لیے "Extremism" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ کتب لغات Dictionaries میں مختلف معانی بیان کیے گئے ہیں۔

According to the Oxford Advanced Learner's Dictionary:

"Extremism: Political, Religious, etc. ideas or actions that are extreme and not normal, reasonable or acceptable to most people.[3]

ایسے سیاسی، مذہبی خیالات یا اقدامات جو نارمل کیفیت سے نکل کر انتہا تک پہنچ جائیں اور لوگوں کی اکثریت کے ہاں وہ معقول یا قابل قبول نہ ہوں انتہا پسندی کہلاتے ہیں۔

انتہا پسند کی ایک تعریف یہ ہے کہ:

"A person whose opinions, especially about religion or politics, are extreme, and who may do things that are violent or illegal for what they believe.[4]

---

(1) یوسف القرضاوی، الدکتور، الصحوۃ الإسلامیہ بین الجحود والتطرف، مؤسسۃ الرسالۃ ناشرون، مصر ص ۲۰

(2) الصاوي، د. صلاح. التطرّف الدینی: الرأي الآخر. القاهرة: الآفاق الدولية للإعلام، (الطبعة الأولى ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۹۳ء)؛ ص: ۱۵

(3) Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English A S Hornby ,seventh edition Oxford University Press,P.541

(4) Ibid., s.v. extremist

وہ شخص جس کی آراء، خاص طور پر مذہب اور سیاست کے بارے میں، شدید ہوں، اور جن باتوں پر وہ یقین رکھتا ہے ان کی بنیاد پر وہ ایسے کام کر سکتا ہو جو پُر تشدد اور غیر قانونی ہوں۔

انتہا پسندی کی دونوں تعریفوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ یہ صرف ایک نظریاتی یا فکری تصور نہیں بلکہ ایک ایسا رویہ ہے جو انسان کو اعتدال اور توازن سے ہٹا کر شدت کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ پہلی تعریف میں انتہا پسندی کو عملی اور قانونی زاویے سے بیان کیا گیا ہے، جس کے مطابق مذہب یا سیاست کے میدان میں غیر متوازن خیالات رکھنے والا شخص کسی بھی حد تک جا سکتا ہے، حتیٰ کہ وہ تشدد اور غیر قانونی اقدامات کو بھی درست سمجھنے لگتا ہے۔ یہ تعریف انتہا پسندی کے عملی پہلو اور اس کے سنگین نتائج کو نمایاں کرتی ہے۔

ان دونوں تعریفات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ انتہا پسندی ایک ایسا رویہ ہے جو عدم توازن، شدت اور غیر لچکدار سوچ پر مبنی ہوتا ہے۔ اعتدال پسندی کی راہ ترک کر کے انتہا پسندی کو اپنانا نہ صرف معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتا ہے بلکہ یہ نظریاتی، فکری اور عملی سطح پر بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔

لغوی و اصطلاحی مفاہیم کا باہمی تعلق

انتہا پسندی کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم ایک دوسرے سے گہرا تعلق رکھتے ہیں، جو اس کے فکری اور عملی اثرات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ لغوی طور پر "غلو"، "تطرف" اور "تصلب" جیسے الفاظ اس کیفیت کو ظاہر کرتے ہیں جس میں انسان اعتدال اور میانہ روی سے ہٹ کر شدت، سختی یا افراط کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ عربی لغات میں یہ الفاظ اس طرزِ عمل کے لیے استعمال ہوئے ہیں جو توازن کھو کر حد سے تجاوز کرنے کو ظاہر کرتا ہے۔ یہی لغوی مفہوم آگے چل کر اصطلاحی معنی میں "انتہا پسندی" (Extremism) کی بنیاد بنا۔ اصطلاحاً، جب کوئی فرد یا گروہ اپنے عقیدے یا نظریے کو اس قدر شدت کے ساتھ اختیار کرتا ہے کہ وہ دوسروں کی رائے یا آزادی کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے موقف کو طاقت یا جبر کے ذریعے منوانے کی کوشش کرتا ہے، تو یہی طرزِ عمل انتہا پسندی کہلاتا ہے۔ جب یہ سوچ عملی سطح پر ظاہر ہوتی ہے اور شدت، عدم برداشت یا تشدد کی صورت اختیار کر لیتی ہے، تو یہ رویہ دہشت گردی میں بدل جاتا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو لغوی معانی جیسے "غلو" اور "تطرف" صرف الفاظ نہیں بلکہ ایسے نظریاتی اور معاشرتی رویوں کی عکاسی کرتے ہیں جو انسانی فکر اور معاشرتی توازن دونوں کو متاثر کرتے ہیں۔

غلو اور انتہا پسندی میں تعلق

غلو اور انتہا پسندی ایک ہی رجحان کے دو مختلف پہلو ہیں — غلو فکری انحراف کی نمائندگی کرتا ہے، جبکہ انتہا پسندی اسی انحراف کی عملی صورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں، غلو ایک نظریاتی سطح پر پیدا ہونے والا رویہ ہے، جب انسان دین یا کسی نظریے کے ایک پہلو کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر باقی اصولوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ یہ غلو جب شدت اختیار کر لیتا ہے اور عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، تو اسے انتہا پسندی کہا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ صرف اس کا فرقہ یا نظریہ درست ہے اور باقی سب گمراہ ہیں، تو یہ غلو ہے؛ لیکن جب وہ اسی سوچ کی بنیاد پر دوسروں پر کفر کے فتوے لگانے یا ان کے خلاف تشدد پر اتر آتا ہے، تو یہ انتہا پسندی ہے۔ یوں غلو فکری انحراف ہے اور انتہا پسندی اس کا عملی تسلسل، جو بالآخر معاشرتی انتشار اور فساد کا باعث بنتا ہے۔

انتہا پسندی اور دہشت گردی کا تعلق

انتہا پسندی اور دہشت گردی (Terrorism) آپس میں گہرا تعلق رکھتی ہیں، اور ایک دوسرے کے لیے محرک کا کام کرتی ہیں۔ انتہا پسندی دراصل وہ نظریاتی بنیاد ہے جو شدت، عدم برداشت، اور مخالفین سے نفرت کو جنم دیتی ہے۔ جب یہی نظریہ عملی صورت اختیار کر کے تشدد، دھمکی یا مسلح کارروائیوں کی شکل میں سامنے آتا ہے، تو وہ دہشت گردی کہلاتی ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ دہشت گردی، انتہا پسندی کا عملی نتیجہ ہے۔ انتہا پسند سوچ جب رویوں اور اعمال میں شدت پیدا کر دیتی ہے، تو معاشرہ عدمِ استحکام، خوف، اور تباہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے انتہا پسندی اور دہشت گردی کے باہمی تعلق کو سمجھنا نہ صرف علمی و فکری سطح پر ضروری ہے بلکہ ایک پُرامن، متوازن اور مستحکم معاشرے کی تشکیل کے لیے بھی بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

صابر مائیکل نے بالکل سچ کہا ہے:

"Terrorism is a tree and extremism provide balanced food to grow this tree properly.[(1)]

دہشت گردی ایک درخت ہے اور انتہاپسندی اس کی بہتر نشوونما کے لیئے متوازن خوراک مہیا کرتی ہے۔

انتہاپسندی سے مراد وہ طرزِ فکر اور عمل ہے جس میں فرد یا گروہ کسی نظریے یا عقیدے کو اس حد تک اپناتا

Sabir Michael, "Terrorism: A Socio-economic and Political Phenomenon with Special Reference to

(1) Pakistan", Journal of Management and Social Sciences, 1(2007), p.35-46.

ہے کہ وہ اعتدال اور توازن سے ہٹ کر سوچتا اور عمل کرتا ہے۔ یہ رویہ عام طور پر فکری شدت، تعصب، اور دوسروں کی رائے کو رد کرنے پر مشتمل ہوتا ہے۔ انتہا پسندی کا دائرہ کار صرف سوچ اور نظریے تک محدود ہو سکتا ہے اور ضروری نہیں کہ وہ تشدد کی طرف مائل ہو[1]۔

اور شدت پسندی (Violent Extremism) وہ مرحلہ ہے جب انتہا پسندی نظریاتی حدود سے نکل کر عملی اقدامات میں ڈھل جائے، جن میں زبردستی، تشدد، دھمکی یا جسمانی نقصان شامل ہو۔ یہ وہ کیفیت ہے جب کوئی فرد یا گروہ اپنے نظریات دوسروں پر زبردستی نافذ کرنے کے لیے طاقت، جبر یا خوف کا استعمال کرتا ہے تو یہ رویہ شدت پسندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جو بالآخر دہشت گردی، مسلح تصادم اور معاشرتی انتشار میں بدل جاتی ہے۔[2]۔

گویا انتہا پسندی ایسے ذہنی اور عملی رویے کو کہا جاتا ہے جس میں کوئی فرد یا گروہ اپنے مخصوص عقیدے، نظریے یا مقصد سے اس قدر وابستگی اختیار کر لیتا ہے کہ وہ خود کو معاشرے سے الگ یا برتر سمجھنے لگتا ہے۔ یہ طرزِ فکر عام طور پر تعصب، عدم برداشت اور سخت گیر رویے سے جنم لیتا ہے، جس کے نتیجے میں ایسے لوگ دوسروں کے خیالات، عقائد اور طرزِ زندگی کو تسلیم کرنے کے بجائے رد کر دیتے ہیں۔ جب یہی انتہا پسندی مزید شدت اختیار کر لیتی ہے اور اس کے ماننے والے اپنے نظریات کو دوسروں پر زبردستی نافذ کرنے لگتے ہیں، اور اس مقصد کے لیے جبر، دھمکی یا تشدد کا سہارا لیتے ہیں، تو یہ کیفیت دہشت گردی کہلاتی ہے۔ دہشت گردی دراصل انتہا پسندی کی انتہائی شکل ہے جو معصوم انسانوں کو نشانہ بناتی ہے اور معاشرتی امن، اتحاد اور استحکام کے لیے سنگین خطرہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا، کہا جا سکتا ہے کہ انتہا پسندی اور دہشت گردی ایک ہی تسلسل کے دو مرحلے ہیں، جن میں فکری شدت بالآخر عملی تشدد میں بدل کر پورے معاشرے کے امن و توازن کو تباہ کر دیتی ہے۔

انتہا پسندی شریعت کے تناظر میں

اسلام میں انتہا پسندی اور شدت پسندی کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں انتہا پسندی کے لیے "غلو" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو کسی معاملے میں حد سے تجاوز کرنے کو ظاہر کرتا ہے۔ غلو، اعتدال کے برخلاف ہے اور دین کو ناقابل برداشت بنا دیتا ہے۔ انتہا پسندی (التطرف) اور غلو (excessiveness) کی مذمت قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آئی ہے۔ غلو سے منع کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾[3]۔

---

[1] القرضاوی، الوسطیۃ فی الإسلام مفہومھا و مظاہرھا، ص:۱۱۰

[2] Shah, S. S. H., 2019. Religious Extremism in Pakistan. University of Warsaw.

[3] سورۃ النساء:۱۷۱

اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں حد سے تجاوز نہ کرو، اور اللہ کے بارے میں صرف وہی بات کہو جو حق اور درست ہو۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ دین میں حد سے بڑھنا (غلو) ممنوع ہے۔ دین میں غلو کا نتیجہ تحریف اور انحراف ہے، جیسا کہ اہلِ کتاب نے کیا۔ یہ حکم بالعموم مسلمانوں کو بھی شامل ہے، تاکہ وہ بھی غلو اور انتہا پسندی سے بچیں۔

ایک دوسری آیت کریمہ میں غلو کو ہلاکت اور گمراہی قرار دے دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَنْ سَوَاءِ السَّبِيلِ﴾[1]۔

کہہ دو: اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق حد سے آگے نہ بڑھو، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو خود بھی گمراہ ہوئے، دوسروں کو بھی گمراہی میں ڈالا، اور سیدھے راستے سے بھٹک گئے۔

غلو محض انفرادی گمراہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ گویا انتہا پسندی سے اجتماعی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

امام صنعانی رحمہ اللہ اس آیت کریمہ: ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾[2]۔ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"أي بالتوسط في كل أمر قصده العبد ولذا نهى عن الغلو في الدين"[3]۔

یعنی ہر کام میں اعتدال ہو جس کا بندہ ارادہ کرے اور اسی لیے غلو فی الدین کی ممانعت آئی ہے۔

عقائد میں غلو کی بڑی واضح مثال یہود و نصاری کا طرز عمل ہے کہ انھوں نے حضرت عزیزؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِـُٔوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ﴾.[4]

اسی طرح نصاریٰ نے عمل میں غلو کرتے ہوئے ایسے احکامات اپنے اوپر لازم کر لیے جو اللہ تعالی کی طرف سے نہیں تھے اور پھر ان کو نباہ بھی نہ سکے۔ ارشاد ربانی ہے :

﴿وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾[5]۔

---

[1] سورۃ المائدۃ:۷۷

[2] سورۃ النحل:۹۰

[3] محمد بن اسماعیل بن صلاح، التنویر شرح جامع الصغیر، مکتبہ دار السلام الریاض، ۱۴۳۲ھ، ج۳، ص ۲۴۳

[4] سورۃ التوبہ:۳۰

[5] سورۃ الحدید:۲۷

اور ترک دنیا جو انھوں نے خود ایجاد کی ہم نے وہ ان پر فرض نہیں کی تھی مگر انھوں نے رضائے الہیٰ حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا پس اسے نباہ نہ سکے جیسے نباہنا چاہیے تھا۔

مذہبی انتہا پسندی احادیث کی روشنی میں

احادیثِ مبارکہ میں دین کے معاملات میں سختی، غلو اور انتہا پسندی سے واضح طور پر منع فرمایا گیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح کی جائے کہ اسلام میں انتہا پسندی کی کوئی جگہ نہیں۔ اسلام ہمیشہ اعتدال، نرمی اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر ان تعلیمات کو اپنایا جائے تو معاشرے میں بڑھتی ہوئی شدت پسندی اور انتہا پسندانہ رویوں کا مؤثر طور پر خاتمہ کیا جاسکتا ہے.

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ، قَالَهَا ثَلَاثًا))[1]۔

تشدد و غلو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔ اور آپ نے تین بار یہ بات ارشاد فرمائی۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ دین میں شدت دورِ جاہلیت کا باعث بنی اور تشدد و انتہا پسندی کا انجام بد ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ: أي المتعمقون الغالون المجاوزون الحدود في أقوالهم وأفعالهم"[2]۔

یعنی وہ لوگ جو بہت زیادہ غلو کرنے والے اور اقوال و افعال میں حدود سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"المتنطعون جمع متنطع وهو المبالغ في الأمر قولا وفعلا"[3]۔

متنطعون متنطع کی جمع ہے اور اس کا مطلب کسی بھی معاملے میں قول اور فعل کے ذریعے مبالغہ کرنے والا۔

غلو و انتہا پسندی کی مختلف صورتیں ہیں جن کی ہر صورت کی اسلام مخالفت اور مذمت کرتا ہے، سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ))[4]

---

[1] صحیح مسلم، کِتَابُ الْعِلْمِ، باب هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُونَ،:۶۷۸۴

[2] النووی، شرح صحیح مسلم ج۱۶، ص۲۲۰

[3] ابن حجر، احمد بن علی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج۱، ص۱۹۶

لوگو! دین میں غلو سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو دین میں اسی غلو نے ہلاک کیا۔

یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ دین میں ضرورت سے زیادہ سختی اختیار کرنا یا حد سے بڑھ جانا امتوں کی بربادی اور زوال کا باعث بنتا ہے۔ پچھلی امتوں کی ہلاکت کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے دین میں اعتدال چھوڑ کر غلو اور شدت پسندی کا راستہ اپنایا۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت کو تنبیہ فرمائی کہ وہ بھی ایسی انتہا پسندی سے بچیں۔ اسلام نے اپنے تمام احکام اور معاملات میں اعتدال، توازن اور میانہ روی اختیار کرنے کی ہدایت دی ہے۔

امام ابن بطال رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "أن الغلو فی الدين مذموم والتشديد فيه غير محمود"[1]۔

بیشک دین میں غلو مذموم ہے اور اس میں سختی کرنا ناپسندیدہ ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس حدیث کی تشریح میں لکھتے ہیں:

"عام في جميع أنواع الغلو، في الاعتقاد والأعمال"[2]۔

یہ حدیث عقائد اور اعمال میں غلو کی تمام انواع کو شامل ہے۔

ایک دوسری روایت میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((صنفانِ من أُمَّتي لن تنالَهُما شفاعتي ، إمامٌ ظلومٌ غشومٌ ، و كلُّ غالٍ مارقٍ[3]

میری امت کے دو قسم کے لوگ ایسے ہیں جنہیں میری شفاعت نصیب نہیں ہوگی: ظالم اور جابر حکمران۔ اور ہر غلو کرنے والا (انتہا پسند) جو دین سے باہر نکل جائے۔

غلو کی اقسام

علماء کے درمیان اس بات پر اختلاف پایا جاتا ہے کہ غلو کی اقسام بیان کی جا سکتی ہیں یا نہیں۔ کچھ علماء کے نزدیک غلو دو قسم کا ہوتا ہے: ایک وہ جو حق کے بارے میں حد سے بڑھ جانا کہلاتا ہے، اور دوسرا باطل کے بارے میں۔ جبکہ بعض دیگر علماء کا خیال ہے کہ غلو کی کوئی تقسیم نہیں، بلکہ یہ ہر حالت میں ایک ہی چیز ہے۔ اور شریعت کی نظر میں ہر صورت میں ناپسندیدہ اور ممنوع عمل ہے۔

---

[4] ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، بَابُ قَدْرِ حَصَى الرمْيِ، ح:۳۰۲۹، الشیخ الألبانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ النسائی، ج۵، ص۲۶۸، (حدیث:۳۰۵۷)

[1] ابن بطال، علی بن خلف، ابو الحسن، شرح صحیح البخاری، الریاض، مکتبۃ الرشد، ۱۴۲۳ھ، ج۸، ص۴۰۵

[2] ابن تیمیہ الحرانی، ابو العباس، احمد بن عبد الحلیم، اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ اصحاب الجحیم، ج۱، ص۲۳۸

[3] الألبانی، السلسلہ الصحیحہ، مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع، ریاض ص، ۴۷۰

علمائے کرام آرا کی تطبیق اور راجح رائے

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ علماء کے درمیان یہ اختلاف دراصل مفہوم اور اندازِ بیان کا ہے، نہ کہ اصولی طور پر کوئی بڑا فرق۔ جن علماء نے "غلو فی الحق" کو درست قرار دیا ہے، ان کی مراد یہ ہے کہ اگر شدت اختیار کرنا شریعت کی مقررہ حدود کے اندر رہو اور ان سے تجاوز نہ کرے تو یہ غلو نہیں بلکہ دینی غیرت اور پختگی ہے۔ جیسے زمخشریؒ اور کچھ دوسرے علماء کے طرزِ فکر میں اگرچہ شدت نظر آتی ہے، مگر وہ دائرۂ دین سے باہر نہیں جاتے۔

دوسری طرف وہ علماء جو غلو کو ہر حال میں ناپسندیدہ سمجھتے ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی عمل شریعت کی حدود میں رہ کر کیا جائے تو اسے غلو نہیں کہا جا سکتا۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ امام زمخشریؒ وغیرہ کے نزدیک "غلو فی الحق" کا تصور لغوی یا عمومی معنی میں ہے، یعنی شدت کے مفہوم میں، جبکہ امام راغبؒ جیسے علماء نے غلو کو اس کے شرعی اور اصطلاحی مفہوم میں لیا ہے، جس میں ہر قسم کی زیادتی، خواہ حق میں ہو یا باطل میں، قابلِ مذمت ہے۔ اس طرح یہ اختلاف زیادہ تر لفظی نوعیت رکھتا ہے۔ قرآن و سنت میں جس غلو کی ممانعت کی گئی ہے، وہ دراصل "غلو باطل" ہے۔ البتہ دین کے مسائل میں گہری سمجھ بوجھ اور تحقیق کرنا، جیسا کہ نبی ﷺ، صحابہ اور تابعین سے منقول ہے، یہ غلو نہیں بلکہ علم و بصیرت کی علامت ہے، لیکن اگر تحقیق حد سے بڑھ جائے تو وہ بھی قابلِ اعتراض بن جاتی ہے۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ دین کی لازمی تعلیمات پر مکمل عمل کرنا انتہا پسندی کے زمرے میں نہیں آتا۔ مثلاً تمام بنیادی عقائد پر ایمان لانا ضروری ہے، چند پر اکتفا کرنا کافی نہیں۔ اسی طرح اسلام کے تمام ارکان — کلمہ، نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ — کی ادائیگی لازم ہے۔ لہٰذا جو شخص پورے دین پر عمل کرتا ہے، اسے انتہا پسند نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ طرزِ عمل شریعت کے عین مطابق اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔

فصل دوم

اسلام میں اعتدال وتوازن کی اہمیت

فصل دوم

اسلام میں اعتدال وتوازن کی اہمیت

اسلام ایک جامع اور عالمگیر نظامِ زندگی ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر پہلو میں توازن، اعتدال اور میانہ روی کو بنیادی اصول قرار دیتا ہے۔ اس دین کی حقیقی خوبصورتی اسی متوازن طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں پوشیدہ ہے جو زندگی کے تمام گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے ہر قسم کی انتہا پسندی کو رد کرتا ہے۔ اعتدال پسندی اسلام کی تعلیمات کا مرکزی نکتہ ہے، جس کا واضح مظاہرہ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں نظر آتا ہے۔ اسلام انسان کو نہ صرف ذاتی سطح پر ایک متوازن زندگی گزارنے کی ہدایت دیتا ہے بلکہ اجتماعی سطح پر بھی ایک ایسا منصفانہ اور پُرامن نظام فراہم کرتا ہے جو ہر فرد اور معاشرے کے لیے یکساں طور پر فائدہ مند ہے۔

اسلام کا یہ اعتدال صرف عبادات اور عقائد تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام میدانوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ چاہے سماجی معاملات ہوں، سیاسی نظام ہو، معیشت کا شعبہ ہو یا بین الاقوامی تعلقات — ہر جگہ اسلام اعتدال اور میانہ روی کی راہ دکھاتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں نہ سختی اور جبر کی اجازت ہے اور نہ ہی بے قید آزادی کی۔ اسی توازن کے باعث اسلام کو "صراطِ مستقیم" یعنی سیدھا اور متوازن راستہ قرار دیا گیا ہے۔

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو "امتِ وسط" کہا ہے، یعنی ایک ایسی امت جو اعتدال کا مظہر ہو، جو کسی بھی انتہا کی طرف نہ جھکے۔ نبی کریم ﷺ کی پوری زندگی اس اعتدال کی عملی مثال ہے۔ آپؐ نے ہمیشہ میانہ روی کو اپنایا اور اپنے صحابہ کرامؓ کو بھی اسی اعتدال کے راستے پر چلنے کی تاکید فرمائی۔ (ہم اگلے صفحات میں ان تعلیمات کے تفصیلی دلائل پیش کریں گے۔ ان شاءاللہ)۔

اسلام کی یہی اعتدال پسندی دراصل اس کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے جو اسے دوسرے مذاہب اور نظریات سے ممتاز کرتی ہے۔ اسلام زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی فراہم کرتا ہے اور ایک ایسا نظام قائم کرتا ہے جو عدل، مساوات، رواداری، برداشت اور سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیتا ہے۔ یہ دین نہ صرف روحانی ترقی کا ذریعہ ہے بلکہ مادی زندگی میں بھی انسان کو کامیابی، فلاح اور سکون کی راہ دکھاتا ہے۔

موجودہ دور میں، جب دنیا انتہا پسندی، شدت اور نظریاتی تعصب کے خطرات سے دوچار ہے، اسلام کی اعتدال پسندی کی اہمیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اسلام وہ دین ہے جو محبت، بھائی چارے اور پرامن بقائے باہمی کا پیغام دیتا ہے۔ اگر مسلمان اور دیگر انسانیت اس کے اصولوں پر عمل کریں تو یقیناً یہ دین پوری دنیا کو امن، انصاف اور ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتا ہے۔

اعتدال کا لغوی مفہوم

اعتدال عربی زبان میں "عدل" سے ماخوذ ہے، جس کا معنی و مفہوم ابن منظور بیان کرتے ہیں:

"الاعتدال: الاستقامة والتوسّط بين طرفي الإفراط والتفريط"[1]۔

اعتدال کا معنی ہے: سیدھا ہونا اور دو انتہاؤں یعنی زیادتی اور کمی کے درمیان درمیانی راستہ اختیار کرنا۔

امام زبیدی اعتدال" کے مادہ "ع دل" کے تحت لکھتے ہیں:

"الاعتدال هو التوسّط من غير ميلٍ إلى طرفٍ من الطرفين"[2]۔

اعتدال یہ ہے کہ آدمی درمیانی حالت میں رہے اور کسی ایک طرف زیادہ جھکاؤ اختیار نہ کرے۔"

علامہ راغب اصفہانی عدل مفہوم بیان کرتے ہیں:

"العَدلُ: ما قام في النفوس أنه مستقيم، وهو ضد الجَور، وبه سُمِّي الاعتدال"[3]۔

عدل وہ چیز ہے جو دلوں میں سیدھی اور درست سمجھی جائے، اور یہ جور (ظلم و کجی) کے مقابل ہے۔ اسی سے اعتدال ماخوذ ہے۔

فیروز آبادی لکھتے ہیں: "العَدلُ والاعتدال: التوسّط والإنصاف"[4]۔

عدل اور اعتدال کا مطلب ہے: درمیانی رویہ اور انصاف پر قائم رہنا۔

خلاصہ یہ کہ لغاتِ عربیہ کے مطابق اعتدال کے معانی میں سے سیدھا ہونا (استقامت)، توازن رکھنا، افراط و تفریط سے بچ کر درمیانی راستہ اپنانا، انصاف اور میانہ روی پر قائم رہنا وغیرہ ہیں۔

ابن سيدة "اعتدال" کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"توسُّطُ حالٍ بَيْنَ حالَينِ في كمٍّ أو كيفٍ"[5]۔

دو حالتوں کے درمیان کسی کیفیت یا مقدار میں درمیانہ حالت اختیار کرنا۔

فیروز آبادی نے اس کی تعریف یوں بیان کی ہے:

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، ج ۱۰ص، ۴۳۲، مادہ عدل

[2] الزبیدی، محمد مرتضی، تاج العروس، وزارت الارشاد الکویت، الطبعة المعتبرة، ج ۱۷، ص ۵۹۴

[3] راغب اصفہانی، مفردات القرآن، ج ۱، ص ۵۲۲

[4] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج ۴، ص ۱۳

[5] ابن سيدة، المحکم والمحیط الأعظم، ج ۲، ص ۱۴

"الاستقامةُ على الوَسَطِ دونَ إفراطٍ أو تفريطٍ"[1] -
درمیانی راستے پر قائم رہنا، بغیر افراط یا تفریط کے۔

اعتدال کا شرعی مفہوم

شرعی اعتبار سے "اعتدال" کا مطلب ہے: شریعت کے مقرر کردہ راستے پر میانہ روی اختیار کرنا، افراط و تفریط سے بچنا، اور دین و دنیا کے معاملات میں توازن قائم رکھنا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ انسان زندگی کے ہر پہلو میں میانہ روی اختیار کرے، خواہ وہ عبادات ہوں یا معاملات، سیاست ہو یا معیشت۔ اسلام نے افراط و تفریط دونوں کو ناپسند کیا اور "امتِ وسط" کے تصور کے ذریعے توازن اور انصاف کو معیارِ عمل قرار دیا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا:

"كل فضيلة هي وسط بين رذيلتين، إحداهما إفراط والأخرى تفريط"[2]-

ہر فضیلت دو برائیوں کے درمیان درمیانی درجہ رکھتی ہے؛ ایک زیادتی ہے اور دوسری کمی۔

امام راغب اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ اور الجرجانی رحمۃ اللہ علیہ نے اعتدال کی تعریف ان الفاظ سے کی ہے:

"التَّوسُّطُ بَيْنَ الإفراطِ والتَّفريطِ"[3]-

افراط اور تفریط کے درمیان میانہ روی اختیار کرنا۔

اعتدال وہ حالت ہے جو افراط (زیادتی) اور تفریط (کمی) کے درمیان ہو۔ یعنی اسلام نے ہر عمل میں توازن کا حکم دیا ہے نہ کہ انتہا پسندی یا سستی کا۔

امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: "الأمة الوسط: هم الخيار العدل ."[4]-

امتِ وسط سے مراد وہ امت ہے جو ہر معاملے میں اعتدال و انصاف پر قائم ہو۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ ارشاد فرمایا:

"الوسط هو العدل المختار الذي لا يميل إلى طرف الإفراط ولا إلى طرف التفريط "[5]

---

[1] فیروز آبادی، القاموس المحیط، ج۴، ص۱۳

[2] الغزالی ابو حامد محمد بن محمد الطوسی، الإحیاء، دار المعارف بیروت، ج۳، ص۵۷

[3] الجرجانی الشریف علی بن محمد بن علی الزین الحسینی، التعریفات دار الریان للتراث، طبعہ الأولی ۱۴۰۳ھ-/۱۹۸۳م، ص:۱۴۷، امام راغب اصفہانی، مفردات ألفاظ القرآن، ص۳۵۰

[4] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، دار طیبۃ، الریاض، ۱۹۹۹، ج۱، ص۱۴۳

وسط (اعتدال) وہ عدل ہے جو کسی طرف جھکاؤ کے بغیر سیدھا راستہ اختیار کرے۔ نہ افراط کی طرف نہ تفریط کی طرف۔

علامہ یوسف القرضاوی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"الاعتدال في الإسلام هو التوازن بين مطالب الروح والجسد، وبين الدنيا والآخرة، وبين الفرد والمجتمع[1]."

اسلام میں اعتدال کا مطلب ہے روح و جسم، دنیا و آخرت، فرد و معاشرہ کے درمیان توازن قائم رکھنا۔

لفظ "وسط" اور "اعتدال" دونوں قریب المعنی ہیں۔ مفسرین کے نزدیک "وسط" سے مراد کسی بھی چیز کا بہترین اور درمیانی حصہ ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو اور دو انتہاؤں کے درمیان ایک متوازن مقام رکھتا ہو۔ اسلام میں اسی توازن کو اعلیٰ درجہ حاصل ہے کیونکہ یہی اعتدال انسان کو راہِ مستقیم پر قائم رکھتا ہے اور اسے کسی بھی حد سے تجاوز کرنے سے روکتا ہے۔

اعتدال اور توسط کا مفہوم یہ ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں دو مخالف انتہاؤں کے درمیان ایسا موقف اپنایا جائے جو انصاف اور توازن پر مبنی ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نہ کسی معاملے میں ضرورت سے زیادہ سختی دکھائے اور نہ ہی حد سے زیادہ نرمی برتے، بلکہ ہر وقت ایک متوازن، پر حکمت اور دانشمندانہ راستہ اختیار کرے۔ یہی طرزِ فکر انسان کو درست فیصلوں کی طرف لے جاتا ہے اور زندگی میں سکون و استقامت پیدا کرتا ہے۔

اسلام نے اپنے پیروکاروں کے لیے اسی اصولِ اعتدال کو بنیادی راہنما اصول قرار دیا ہے تاکہ ان کی زندگی میں توازن، نظم اور میانہ روی برقرار رہے۔ یہ توازن ہمیں اسلام کی تمام تعلیمات میں نظر آتا ہے—چاہے عبادات کا معاملہ ہو، اخلاقیات کا یا معاشرتی تعلقات کا۔ اس کا مقصد ایک ایسی امت کی تشکیل ہے جو کسی بھی انتہا پسندی یا شدت پسندی سے محفوظ رہے اور ہر موقع پر بہترین اور معتدل راستہ اختیار کرے۔

جب ہم اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرتے ہیں تو واضح ہوتا ہے کہ شریعت نے ہمیشہ سختی، شدت اور افراط کے بجائے نرمی، آسانی اور میانہ روی کو ترجیح دی ہے۔ اسلام کی تمام ہدایات کا مرکزی نکتہ یہی اعتدال ہے، جو عبادات، اخلاق، معاشرت اور معاملات—زندگی کے ہر شعبے—میں نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ یہی اعتدال اسلام کو

---

[5] قرطبی، الجامع لأحکام القرآن، دار الکتب المصریہ، القاہرۃ ج ۲، ص ۱۵۳

[1] القرضاوی، الوسطیۃ في الإسلام، ص ۴۵

ایک ایسا مکمل اور قابلِ عمل نظامِ زندگی بناتا ہے جو انسان کو توازن، سکون اور کامیابی کی راہ دکھاتا ہے۔ لہٰذا ہر درمیانی رویہ لغوی سطح پر "وسط" کہلا سکتا ہے، لیکن شرعی اصطلاح میں صرف وہی رویہ "اعتدال" کہلائے گا جو دینی حدود سے ہم آہنگ ہو اور عدل و قسط کی حقیقی نمائندگی کرے۔

الوسطیہ

پیچھے گزر چکا ہے کہ فیروز آبادی نے اعتدال کے معنی میں ایک معنی توسط کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اعتدال کے لیے دوسرا لفظ جو میانہ روی کے لیے استعمال ہوتا ہے وہ توسط کا لفظ ہے۔

ابن فارس رحمہ اللہ "الوسطیہ "کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الواو والسين والطاء أصلٌ صحيح يدلُّ على العدلِ والنَّصف، وأعدَلُ الشيء أوسطُه ووسطُه، يقال: هذا أوسطُ الشيء، أي أعدَلُه وخيارُه"[1]۔

وسط) کا مادہ (و، س، ط) ایک صحیح اصل ہے جو عدل اور انصاف (نصف و توازن) پر دلالت کرتا ہے۔ کسی چیز کا سب سے زیادہ عادل اور بہتر حصہ اس کا درمیانی حصہ ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: یہ چیز کا 'اوسط' ہے یعنی سب سے زیادہ عادل اور بہترین حصہ۔

زین الدین الرازی رحمہ اللہ "الوسطیہ "کا معنی بیان کیا ہے۔

"الوَسَطُ: ما بين الطرفين، ويُستعمل في العدل والخيَار، يقال: شيءٌ وَسيط أي عدلٌ بين الشيئين..... "[2]۔

"الوسط "اس چیز کو کہتے ہیں جو دو انتہاؤں کے درمیان ہو، اور یہ لفظ عدل اور بہترین ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے: "چیزٌ وسیط "یعنی وہ چیز جو دو چیزوں کے درمیان عدل و توازن رکھتی ہو۔

الوسطیہ کا اصطلاحی مفہوم

علامہ راغب اصفہانی رحمہ اللہ الوسطیہ کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

"القَصدُ المصونُ عن الإفراطِ والتَّفريطِ"[3]۔ وہ میانہ روی جو افراط اور تفریط سے محفوظ ہو۔

---

[1] احمد بن فارس بن زکریا الرازی، معجم مقاییس اللغہ، تحقیق عبد السلام محمد ھارون، دار الفکر، ج ٦، ص ١٠٨

[2] الرازی، زین الدین محمد بن ابی بکر، مختار الصحاح، المکتبہ العصریہ، الدار النموذجیۃ، بیروت صیدا، ط ٥، ١٤٢٠ھ ج ٦، ص: ٣٣٨

[3] راغب اصفہانی، مفردات القرآن، ص ٨٦٩

یعنی ایسا معتدل راستہ جو زیادتی اور کمی دونوں سے بچائے رکھے۔ امام رازی رحمہ اللہ نے قدر مختلف اور آسان مختصر مفہوم یوں بیان کیا ہے:

"رعايةُ العَدلِ والوَسَطِ "[1]- عدل اور میانہ روی کی رعایت (پابندی / نگہبانی) کرنا۔

یعنی زندگی کے معاملات میں انصاف اور اعتدال کو قائم رکھنا۔

اعتدال کے لغوی اور اصطلاحی مفاہیم آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں، مگر دونوں کے دائرے اور اطلاق میں نمایاں فرق موجود ہے۔ لغوی اعتبار سے "اعتدال" کا مطلب کسی چیز کا درمیانی یا متوازن ہونا ہے، یعنی دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسا راستہ اختیار کرنا جو عدل، توازن اور انصاف کے قریب ہو۔ اہلِ لغت کے نزدیک "وسط" بھی اسی مفہوم میں آتا ہے، جو ہر معاملے میں بہتر، معتدل اور عدل کے قریب ترین پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ تاہم جب یہی اصطلاح اسلامی علوم میں استعمال ہوتی ہے تو اس کا مفہوم محض درمیانی پن تک محدود نہیں رہتا، بلکہ یہ قرآن و سنت کی تعلیمات اور شریعت کے مقاصد کے مطابق مخصوص معنویت اختیار کرلیتا ہے۔ اصطلاحی لحاظ سے اعتدال سے مراد وہ طرزِ عمل ہے جو افراط و تفریط سے پاک ہو، شریعت کے مقرر کردہ معیارِ عدل کے مطابق ہو، اور زندگی کے تمام پہلوؤں میں توازن اور انصاف کو قائم رکھے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ لغوی مفہوم عمومی اور وضاحتی نوعیت رکھتا ہے، جبکہ اصطلاحی مفہوم شرعی، معیاری اور اصولی بنیادوں پر استوار ہے۔ لہٰذا ہر درمیانی رویہ لغوی اعتبار سے "وسط" کہلایا جاسکتا ہے، لیکن شریعت کی نظر میں "اعتدال" صرف وہی ہے جو دین کی حدود، عدل اور قسط کے تقاضوں کے مطابق ہو اور عملی طور پر اسلامی اصولوں کی روح کی نمائندگی کرے۔

قرآن مجید میں اعتدال کا تصور

اعتدال اور توسط کا مفہوم دراصل یہ ہے کہ انسان کسی بھی معاملے میں دو انتہاؤں کے درمیان ایک ایسا معتدل راستہ اختیار کرے جہاں نہ سختی حد سے بڑھ جائے اور نہ نرمی ضرورت سے زیادہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے فیصلوں اور رویوں میں ہمیشہ توازن، حکمت اور انصاف برقرار رکھا جائے۔ لفظ "وسط" اور "اعتدال" دونوں ایک جیسے معنی رکھتے ہیں، یعنی وہ درمیانی اور بہترین مقام جہاں کسی چیز میں نہ زیادتی ہو نہ کمی۔ ائمہ تفسیر کے مطابق "وسط" کا مطلب ہر چیز کا بہترین حصہ ہے جو دو انتہاؤں کے بیچ اعتدال پر قائم ہو۔

[1] الرازی، ابو عبد اللہ محمد بن عمر، فخر الدین، مفاتیح الغیب، المطبعہ الخیریہ ج ۲۰، ص ۲۶۰

اسلام کے تصورِ وسطیہ و اعتدال کی بنیاد قرآنِ مجید میں جگہ جگہ بیان ہوئی ہے۔ یہ تصور صرف نظری تعلیم نہیں بلکہ عملی زندگی کے ہر پہلو کے لیے واضح رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ قرآن نے اُمتِ مسلمہ کو "اُمۃ وسطًا" قرار دے کر اسے اعتدال اور توازن کی علامت بنایا۔ عبادت میں ہدایت دی گئی کہ نہ تو رہبانیت اختیار کی جائے اور نہ دین سے غفلت برتی جائے۔ خرچ کرنے میں بھی اعتدال کو پسند کیا گیا ہے کہ نہ فضول خرچی کی جائے اور نہ بخل کیا جائے۔ اسی طرح بات چیت اور طرزِ عمل میں بھی میانہ روی کی تاکید کی گئی ہے کہ نہ تکبر ظاہر ہو اور نہ کمزوری۔ اسلام نے عدل و انصاف کو ہر معاملے میں توازن کا معیار قرار دیا ہے۔ یہ تمام تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ اسلام کا تصورِ وسطیہ ایک جامع اور عملی نظام ہے جو فرد کی ذات، اس کے تعلقات اور معاشرتی زندگی سب پر یکساں طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔

قرآنِ مجید میں "وسط"، "عدل"، "قصد"، "قوام" اور "عدمِ غلو" جیسے الفاظ کے ذریعے میانہ روی، انصاف، اور توازن کی تعلیم دی گئی ہے۔ مفسرین کے مطابق یہ تمام تصورات اعتدال کی اس روح کو ظاہر کرتے ہیں جو اسلام کی بنیاد ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا اصل مزاج انتہا پسندی سے ہٹ کر توازن، عدل، اور اعتدال پر قائم ہے۔ یہی طرزِ فکر انسان اور معاشرے دونوں کو اعتدال اور سکون کی راہ دکھاتا ہے۔

وسط

قرآنِ مجید میں میانہ روی اور اعتدال کے اظہار کے لیے جو اہم لفظ استعمال ہوا ہے وہ "وسط" ہے۔ اس لفظ کا مفہوم صرف درمیان ہونا نہیں بلکہ عدل، توازن اور بہترین درجہ رکھنا بھی ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت کریمہ ﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾[1] - میں اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ کو "اُمۃ وسطًا" قرار دیا، جس سے مراد ایک ایسی امت ہے جو انصاف پر قائم ہو، افراط و تفریط سے پاک ہو اور تمام معاملات میں توازن کی مظہر ہو۔ مفسرین کے نزدیک "وسط" سے مراد نہ صرف جغرافیائی یا سماجی توازن ہے بلکہ فکری، اعتقادی اور عملی زندگی میں بھی وہ راہِ اعتدال ہے جس کے ذریعے امت حق کی گواہ اور عدل کی نمائندہ بنتی ہے۔ اس طرح لفظ "وسط" اسلام کے اس جامع تصورِ اعتدال کو ظاہر کرتا ہے جو عبادات، اخلاق، معیشت اور معاشرت کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

---

[1] سورۃ البقرہ: ۱۴۳

امام طبری رحمة الله عليه آیت کریمہ ﴿ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"والصواب من القول في ذلك عندنا أن الله تعالى ذكره عنى بقوله: ﴿وَسَطًا﴾ وسطًا في الدِّين، لا هم أهلُ غلو فيه غلو النصارى في النصرانية، ولا هم أهلُ تقصير فيه تقصير اليهود في دينهم، ولكنهم أهلُ توسطٍ واعتدالٍ فيه "[1]۔

ہمارے نزدیک درست بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "امۃ وسطاً" سے مراد یہ ہے کہ یہ امت دین میں درمیانی امت ہے، نہ تو نصاریٰ کی طرح غلو کرنے والی، نہ ہی یہود کی طرح دین میں کوتاہی کرنے والی؛ بلکہ یہ امت دین میں توازن اور اعتدال پر قائم ہے۔

امام قرطبی رحمة الله عليه کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں:

﴿وَسَطًا﴾ "أي عدلًا خيارًا، والمعنى: لتكونوا ذوي توسط واعتدال، تشهدون على الناس وتقومون بالقسط بينهم ."[2]۔

وسط کا مطلب ہے عدل اور بہترین۔ یعنی تم لوگ میانہ روی اور اعتدال والے بنائے گئے ہو تاکہ لوگوں پر گواہ بنو اور ان کے درمیان انصاف قائم کرو۔

حافظ ابن کثیر آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾ أي عدولًا خيارًا، وما عدا الوسط مذموم، فأمة محمد صلى الله عليه وسلم وسط في الدين، بين الغالي فيه والجافي عنه ."[3]۔

یعنی عادل اور بہترین۔ درمیانی کے سوا ہر رویہ مذموم ہے۔ امتِ محمد ﷺ دین کے معاملے میں درمیان پر ہے؛ نہ اس میں غلو کرنے والی ہے اور نہ ہی دین سے منہ موڑنے والی۔

یہ آیتِ کریمہ اسلام کے تصورِ اعتدال کی اساس ہے، جس میں امتِ مسلمہ کو ایک ایسی امت قرار دیا گیا ہے جو توازن، میانہ روی اور انصاف پر قائم ہے۔ میانہ روی کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی زندگی میں ہر معاملے میں درمیانہ اور متوازن طرزِ عمل اپنائے، نہ اسراف کرے اور نہ بخل، نہ سختی میں حد سے بڑھے اور نہ نرمی میں کمزوری دکھائے۔ اسلام نے زندگی کے ہر پہلو—عبادت، خرچ، گفتگو، چلنے کے انداز اور برتاؤ—میں اعتدال کو اختیار کرنے

[1] الطبری، ابن جریر، جامع البیان عن تأویل آي القرآن، دار ہجر، القاہرہ، ۲۰۰۱ ج ۳، ص ۱۴۲

[2] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج ۲، ص ۱۵۳

[3] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ج ۱، ص ۳۹۴

کی تعلیم دی ہے۔ اس کے تمام احکام انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں، اسی لیے اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر شعبے میں توازن اور حسنِ عمل کی راہ دکھاتا ہے۔

عدل

مفسرین کے نزدیک لفظ "قصد" سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے طرزِ عمل میں نہ تکبر اور غرور دکھائے، نہ ہی کمزوری یا ذلت اختیار کرے، بلکہ ایک باوقار، متوازن اور سنجیدہ رویّہ اپنائے۔ یہ توازن صرف ظاہر میں نہیں بلکہ انسان کے اخلاق، سوچ، اور عادات تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح "قصد" دراصل اعتدال کی وہ عملی شکل ہے جو انسان کے کردار، چال ڈھال اور برتاؤ میں توازن اور شائستگی پیدا کرتی ہے، اور اسے ایک متوازن شخصیت بناتی ہے۔

قوام

قرآنِ مجید میں اعتدال اور توازن کے اظہار کے لیے لفظ "قَوام" بھی استعمال ہوا ہے، جو درست رویّے، استقامت اور اعتدال کی علامت ہے۔ یہ لفظ اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ مؤمن کی زندگی میں نہ انتہا پسندی کی گنجائش ہے اور نہ غفلت کی، بلکہ وہ ہمیشہ درمیانی اور منصفانہ راہ پر قائم رہتا ہے۔ "قوام" کا تصور عبادت، اخلاق، معیشت اور معاشرت کے تمام پہلوؤں میں توازن پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام اسی متوازن طرزِ زندگی کو مثالی قرار دیتا ہے کیونکہ یہی طریقہ فرد کی اصلاح، اخلاقی تربیت اور معاشرتی ہم آہنگی کا ذریعہ بنتا ہے۔۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ... ﴾[1]- اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔

امام قرطبی رحمہ اللہ آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"هذه الآية أجمع آية في القرآن للخير والشر، وهي قاعدة عظيمة في العدل والاعتدال؛ أمر الله بالعدل الذي هو التوسط بين الإفراط والتفريط"[2]-

یہ آیت قرآن میں بھلائی اور برائی کے تمام پہلوؤں کو جمع کرنے والی ہے۔ یہ عدل اور اعتدال کا ایک عظیم اصول ہے۔ اللہ نے عدل کا حکم دیا ہے، جو کہ افراط اور تفریط کے درمیان درمیانی راستہ ہے۔

یہ ایات کریمہ میانہ روی، اعتدال اور وسطیت پر دلالت کر رہی ہیں۔

([1]) سورۃ النحل: ۹۰

([2]) القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج ۱۰، ص ۲۵۳

ان اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے جہاں "امت وسط" کا ذکر کیا ہے، وہاں مفسرین نے اسے اعتدال، عدل اور توازن کے معنوں میں لیا ہے، اور اور "غلو" (انتہاپسندی) کی ہر شکل کو ممنوع قرار دیا ہے۔

قصد

قرآنِ مجید میں اعتدال اور میانہ روی کے لیے استعمال ہونے والے اہم الفاظ میں سے ایک "قصد" بھی ہے۔ قصد کے لغوی معنی ہیں: سیدھی راہ اختیار کرنا، میانہ روی اپنانا اور افراط و تفریط سے بچنا۔ قرآن کریم نے اس تصور کو مختلف مقامات پر بیان کیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ... ﴾[1]- چال میں میانہ روی اختیار کرو۔

امام طبری رحمہ اللہ (م ۳۱۰ھ) آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وأما قوله: ﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ يقول: واعدل في مشيك، ولا تسرع فيه، ولا تبطئ، ولكن بين ذلك"[2]-

اللہ تعالیٰ کے فرمان "اقصد فی مشیک" کا مطلب ہے: اپنی چال میں اعتدال اختیار کرو، نہ بہت تیز چلو اور نہ ہی حد سے زیادہ سست، بلکہ ان دونوں کے درمیان رہو۔

امام قرطبی رحمہ اللہ آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اقصد في مشيك: أي توسط فيه، لا تسرع إسراعًا مفرطًا ولا تبطئ بُطئًا شديدًا. وهو أدب حسن"[3]-

"اقصد" سے مراد درمیانی چال ہے، نہ بہت تیز دوڑنا اور نہ ہی حد سے زیادہ آہستہ چلنا۔ یہ اسلام کا حسنِ ادب ہے۔

مفسرین کے نزدیک یہاں "قصد" کا مطلب یہ ہے کہ انسان نہ تو غرور و تکبر کے ساتھ اکڑ کر چلے اور نہ ہی عاجزی و کمزوری کے ساتھ ذلیل ہو کر، بلکہ ایک متوازن اور شریفانہ انداز اختیار کرے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "قصد" کا مفہوم اعتدال اور توازن پر مبنی ہے جو صرف ظاہری طرزِ عمل تک محدود نہیں بلکہ انسانی زندگی کے تمام

([1]) سورۃ لقمان:۱۹

([2]) الطبري، جامع البیان، ج ۲۰، ص ۱۶۳

([3]) القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج ۱۴، ص ۶۸۴

رویوں اور عادات کو محیط ہے۔ یوں قرآنِ مجید میں "قصد" اعتدال کے عملی اور اخلاقی اظہار کی علامت کے طور پر بیان ہوا ہے۔

قوام

قرآنِ مجید میں اعتدال پسندی اور میانہ روی کے لیے "قَوام" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو توازن، استقامت اور درست رویّے کی علامت ہے۔ یہ لفظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مؤمن کی زندگی میں نہ افراط کی گنجائش ہے اور نہ تفریط کی، بلکہ اسے ہمیشہ اعتدال اور توازن کے راستے پر قائم رہنا چاہیے۔ قوام کا تصور عبادت، اخلاق، معیشت اور معاشرت، سب پہلوؤں میں توازن قائم رکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام انسان کو اس راہ پر چلنے کی تلقین کرتا ہے جو عدل، اعتدال اور حکمت پر مبنی ہو۔ یہی رویّہ فرد کی اصلاح اور معاشرتی استحکام کا ضامن بنتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا... ﴾[1]۔

اور جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں، بلکہ ان کا طرزِ عمل ہمیشہ اعتدال اور توازن پر قائم رہتا ہے۔

امام ابن جریر طبری رحمة الله عليه لفظ ﴿قَوَامًا﴾ تفسیر میں لکھتے ہیں:

"قَوَامًا: عَدْلًا بَيْنَ الْمُفْرِطِ وَالْمُفَرِّطِ "[2]۔

قواماً یعنی اسراف اور بخل کے درمیان عدل و توازن۔

امام فخر الدین رازی رحمة الله عليه (م ۶۰۶ھ) رحمة الله عليه اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قوله: ﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ أي توسط فيه، فلا تمش مشي المتكبرين، ولا مشي المفرطين في الذلة"[3]۔

اللہ تعالیٰ کے فرمان "اقصد فی مشیک" کا مطلب یہ ہے کہ چال میں میانہ روی اختیار کرو، نہ تو متکبرین کی طرح اکڑ کر چلو اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ عاجزی و ذلت کے ساتھ۔

امام قرطبی رحمة الله عليه ﴿وَكَانَ بَيْنَ ذَلِكَ قَوَامًا﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

([1]) سورۃ الفرقان: ۲۵:۶۷

([2]) الطبری، جامع البیان، ج ۱۹، ص ۲۲

([3]) الرازی، مفاتیح الغیب، دار إحياء التراث العربي، بیروت، ۱۴۲۰ھ، ج ۲۵، ص ۱۷۹

" أَيْ عَدْلًا بَيْنَ الْإِسْرَافِ وَالْإِقْتَارِ "[1]۔یعنی اسراف اور بخل کے درمیان اعتدال اختیار کرنا۔

ان تفاسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ "قصد" قرآنِ مجید میں اعتدال، میانہ روی اور توازن کے لیے نہایت جامع لفظ ہے۔ یہ صرف انسان کے ظاہری اندازِ چال یا حرکات تک محدود نہیں بلکہ اس کے اخلاق، رویّوں اور کردار میں بھی توازن، سنجیدگی اور وقار کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس آیت میں "قصد" سے مراد درمیانی چال ہے، یعنی نہ بہت آہستہ جیسے کمزوری اور سستی کا مظہر ہو، اور نہ ہی بہت تیز جو جلد بازی یا تکبر کی علامت بن جائے۔ بعض مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان سکون، وقار اور اعتدال کے ساتھ چلے، مگر تکبر اور غرور سے دور رہے۔

قسط

قرآنِ مجید میں اعتدال اور توازن کے مفہوم کو واضح کرنے کے لیے "قِسط" کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو عدل، انصاف اور اعتدال کے مفہوم کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ قسط کا مطلب صرف قانونی یا عدالتی انصاف نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں توازن اور حق تلفی سے بچنا ہے۔ یہ انسان کو سکھاتا ہے کہ وہ اپنے قول و عمل میں انصاف پر قائم رہے، کسی جانب زیادتی یا کوتاہی نہ کرے۔ اسلام کے نزدیک قسط کا قیام ہی ایک پرامن، منصفانہ اور متوازن معاشرے کی بنیاد ہے۔ یوں "قسط" کا تصور اسلام کے جامع اور اعتدال پسندانہ نظامِ حیات کی حقیقی روح کو ظاہر کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ... ﴾[2]۔

انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بنو۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ آیت کریمہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"يقول تعالى ذكره للمؤمنين به: يا أيها الذين صدّقوا الله ورسوله، ليكن قيامكم بالقسط، وهو العدل في جميع أحوالكم، مقيمين شهادة الله بالحق "[3]۔

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو حکم دیتے ہیں: اے لوگو جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہو، تمہارا اٹھنا بیٹھنا اور قیام و عمل سب عدل پر مبنی ہونا چاہیے، اور تم ہمیشہ اللہ کی رضا کے لیے حق پر گواہی دینے والے بنو۔

([1]) القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ، ۱۹۶۴، ج ۱۳، ص ۸۵

([2]) سورۃ النساء: ۱۳۵

([3]) تفسیر الطبری، جامع البیان، ج ۸، ص ۴۶۹

امام فخر الدین رازی ؒ (م۶۰۶ھ) لکھتے ہیں:

"اعلم أن المقصود من هذه الآية إيجاب العدل على المؤمنين، والعدل هو الوسط بين الإفراط والتفريط، فدخل في ذلك جميع أبواب الشرع"[1]۔

جان لو کہ اس آیت کا مقصد ایمان والوں پر عدل کو لازم کرنا ہے۔ اور عدل وہ ہے جو افراط و تفریط کے درمیان وسط ہو۔ اس طرح یہ حکم شریعت کے تمام ابواب کو شامل ہے۔

امام قرطبی ؒ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"القسط هو العدل، أمرهم أن يقوموا به على أنفسهم وعلى غيرهم، ولا تأخذهم في الله لومة لائم"[2]۔

قِسط سے مراد انصاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ انصاف پر قائم رہیں، خواہ اپنے خلاف ہو یا دوسروں کے بارے میں، اور (انصاف کرتے وقت) اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں۔

مفسرین کی وضاحتوں سے یہ بات نمایاں ہوتی ہے کہ قرآنِ مجید میں "عدل" کا حکم دراصل اعتدال اور میانہ روی کے عملی اظہار کی حیثیت رکھتا ہے۔ عدل کا مطلب صرف قانونی فیصلوں میں انصاف کرنا نہیں، بلکہ یہ انسان کی ذاتی زندگی، معاشرتی روابط، سیاسی نظم و نسق اور مالی معاملات تک پھیلا ہوا ایک جامع اصول ہے۔ اس طرح "عدل" اسلام میں اعتدال اور توازن کے مکمل اور ہمہ گیر تصور کو واضح کرنے والا بنیادی اور مرکزی مفہوم بن جاتا ہے۔

عدم غلو

قرآنِ مجید میں اعتدال اور میانہ روی کو واضح کرنے کے لیے ایک اہم تصور "عدمِ غلو" (یعنی دین میں حد سے تجاوز نہ کرنا) کے ذریعے بھی بیان کیا گیا ہے۔ غلو کا مطلب ہے کسی معاملے میں افراط، شدت یا حد سے بڑھ جانا، خواہ وہ عقیدہ ہو یا عمل۔ قرآن کریم نے کئی مقامات پر غلو کی مذمت کی ہے،

جیسا کہ سورۃ النساء میں اہلِ کتاب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا: ﴿لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾[3]۔ اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو۔ یہ حکم اہلِ کتاب کے لیے ہے جو عبادت یا عقیدہ میں غلو کرتے ہیں۔ اس آیت کے ذریعے نہ صرف پچھلی

([1]) الرازی، مفاتیح الغیب، دار إحیاء التراث العربي، بیروت، ۱۴۲۰ھ، ج۱۱، ص۱۸۹

([2]) القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۵، ص ۲۷۲، دار الکتب المصریہ، ۱۳۸۴ھ

([3]) سورۃ النساء: ۱۷۱

امتوں کو ان کے رویے پر متنبہ کیا گیا بلکہ امتِ مسلمہ کو بھی یہ تعلیم دی گئی کہ دین کے معاملے میں افراط و تفریط ممنوع ہے۔ مفسرین کے نزدیک "غلو" سے مراد اعتقادی اور عملی حدود سے تجاوز کرنا ہے، اور "عدم غلو" دراصل اسی اعتدال کا دوسرا نام ہے جو اسلام کی اصل روح ہے۔ یوں "عدم غلو" کا تصور اسلام کے متوازن اور فطری نظام کو ظاہر کرتا ہے، جس میں زندگی کے ہر پہلو میں اعتدال کو بنیادی معیار قرار دیا گیا ہے۔

امام طبری آیت ﴿لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"والغلوّ في الدين: هو مجاوزةُ الحدّ فيه، بأن يُزاد فيه أو يُنقَص منه"[1]۔

دین میں غلو یہ ہے کہ اس کی حد سے تجاوز کیا جائے، یعنی اس میں زیادتی یا کمی کی جائے۔

حافظ ابن کثیر آیت کریمہ ﴿لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ﴾ غلو فی الدین کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ينهى تعالى أهل الكتاب عن الغلو والإطراء، وهذا كثير في النصارى، فإنهم تجاوزوا الحد في عيسى حتى رفعوه فوق المنزلة التي أعطاه الله إياها "[2]۔

اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب کو دین میں غلو اور مبالغہ آرائی سے منع فرما رہا ہے۔ یہ بات خاص طور پر نصاریٰ میں پائی جاتی ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حد سے بڑھ کر غلو کیا، یہاں تک کہ انہیں اس مرتبے سے بھی اوپر لے گئے جو اللہ نے انہیں دیا تھا۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ "عدمِ غلو" قرآنِ مجید کا ایک بنیادی اصول ہے، جس کے مطابق دین میں کسی بھی معاملے میں حد سے تجاوز کرنا—چاہے وہ زیادتی کی صورت میں ہو یا کمی کی — منع ہے۔ یہ تصور اسلام کے توازن اور اعتدال کے پیغام کو نمایاں کرتا ہے اور امتِ مسلمہ کو اس بات کی تعلیم دیتا ہے کہ وہ ہمیشہ درمیانی راہ اختیار کرے، نہ شدت پسندی کی طرف مائل ہو اور نہ ہی غفلت کا شکار بنے۔ یہی رویہ اسلام کی اصل روح اور اس کے عملی نظام کی بنیاد ہے۔

احادیث میں اعتدال کا تصور

نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کا مقصد انسان کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں توازن اور اعتدال کی طرف رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کو تاکید فرمائی کہ وہ افراط و تفریط سے بچ کر ایک متوازن اور معتدل طرزِ عمل اپنائے، تاکہ نہ ضرورت سے زیادہ سختی ہو اور نہ ہی دین میں سستی یا لاپرواہی پیدا ہو۔ آپ ﷺ نے وضاحت

([1]) تفسیر الطبری، ج۸، ص۵۲۸

([2]) تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص۳۸۰

فرمائی کہ دین کا حسن اسی اعتدال میں پوشیدہ ہے، جو انسان کے اعمال، اخلاق، عبادات اور معاشرتی معاملات کو درست سمت عطا کرتا ہے۔ یوں احادیث میں اعتدال کو نہ صرف ایک اخلاقی قدر بلکہ ایک مکمل طرزِ حیات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا وَأَبْشِرُوا وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ))[1]۔

یقیناً دین آسان ہے، اور جو شخص اس میں سختی یا شدت اختیار کرے گا، وہ خود اس کے بوجھ تلے دب جائے گا اور اس کا جوش باقی نہیں رہے گا۔ لہٰذا میانہ روی اور اعتدال کو اپناؤ، دل خوش رکھو، اور صبح، دوپہر، شام اور رات کے اوقات میں عبادت کے ذریعے روحانی طاقت حاصل کرو۔

یہ حدیث ہمیں ایک بنیادی اور نہایت اہم اصول سکھاتی ہے کہ دین میں حد سے تجاوز، چاہے سختی کی صورت میں ہو یا زیادتی کی، درست نہیں۔ اس میں وضاحت کی گئی ہے کہ اسلام آسانی اور انسانی فطرت کے مطابق دین ہے، اور جو شخص ضرورت سے زیادہ عبادت یا سختی اختیار کرتا ہے، وہ آخرکار تھک کر اس راہ سے ہٹ جاتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ عبادت اور تقویٰ میں میانہ روی اختیار کی جائے تاکہ انسان دین پر قائم رہتے ہوئے دل کا سکون اور روح کی تازگی برقرار رکھ سکے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ توازن اور اعتدال کی تاکید فرمائی، تاکہ مسلمان دین کی پیروی کو بوجھ نہیں بلکہ رحمت محسوس کریں۔ مزید یہ کہ آپ ﷺ نے عبادات کو دن اور رات کے مختلف اوقات میں تقسیم کرنے کی ہدایت دی، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی و ذہنی آرام اور روحانی ترقی کے درمیان توازن ضروری ہے۔

اعتدال دراصل اسلام کا عملی معیار ہے، جو صرف ایک نظریہ نہیں بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ چاہے وہ عبادت ہو، اخلاق ہو یا روزمرہ کے معاملات، ہر چیز میں توازن قائم رکھنا ضروری ہے۔ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات اور مقاصدِ شریعت سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ شریعت کا مقصد انسان کو مشقت یا تکلیف میں ڈالنا نہیں بلکہ آسانی، نرمی اور سہولت فراہم کرنا ہے، تاکہ دین پر عمل انسان کی زندگی میں راحت اور برکت کا سبب بنے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے وضاحت کے ساتھ ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللهَ لَمْ يَبْعَثْنِي مُعَنِّتًا وَلَا مُتَعَنِّتًا،وَلَكِنْ بَعَثَنِي مُعَلِّمًا مُيَسِّرًا)) [2]۔

([1]) مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث: ۲۸۱، ج۱، ص ۱۴۰

([2]) مسند احمد بن حنبل، المسند، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، ۲۰۰۱ء، حدیث: ۲۴۵۲۹، ج۳۹، ص ۴۵۲

اللہ نے مجھے سختی یا مشقت میں ڈالنے والا نہیں بنایا، بلکہ ایک معلم اور آسانی پیدا کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کو اس دنیا میں آسانی اور نرمی کے ساتھ دین سکھانے کے لیے بھیجا گیا تھا، نہ کہ سختی اور شدت پیدا کرنے کے لیے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ امت کو نرمی، برداشت، اور میانہ روی کی تعلیم دی اور ان لوگوں پر ناراضگی کا اظہار کیا جو دین میں شدت پیدا کرتے تھے۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالی عنہ سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں:

((يَا عَائِشَةُ! إِنَّ اللَّهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ وَمَا لَا يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ))[1]۔

اے عائشہ! بے شک اللہ تعالیٰ نرمی والا ہے اور نرمی ہی کو پسند کرتا ہے اور نرمی کی بنا پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو درشت مزاجی کی بنا پر عطا نہیں فرماتا، وہ اسکے علاوہ کسی اور بات پر اتنا عطا نہیں فرماتا۔

آنحضرت نے اپنی امت کو ہمیشہ نرمی اور میانہ روی اختیار کرنے کی تلقین فرمائی۔ اور نہ صرف تلقین فرمائی بلکہ نرمی کرنے والے کو دعا اور سختی کرنے والے کو بددعا سے نوازا۔ چنانچہ آپ ﷺ کی دعا ہے کہ:

((اللَّهُمَّ! مَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئًا فَشَقَّ عَلَيْهِمْ، فَاشْقُقْ عَلَيْهِ. وَمَنْ وَلِيَ مِنْ أَمْرِ أُمَّتِي شَيْئًا فَرَفَقَ بِهِمْ، فارفق به)) [2]۔

اے اللہ! جو شخص میری امت کے کسی معاملے کا ذمہ دار بنے اور ان پر سختی برتے، تو تُو بھی اس کے ساتھ سختی فرما، اور جو شخص ان کا نگہبان بنے اور ان کے ساتھ نرمی و شفقت سے پیش آئے، تو تُو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ فرما۔

یہ حدیث اسلامی قیادت اور طرزِ حکمرانی کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول کو بیان کرتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کے رہنماؤں، حکمرانوں، قاضیوں اور منتظمین کو نصیحت فرمائی کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ نرمی، شفقت اور انصاف کا برتاؤ کریں۔ ایک اچھا سربراہ وہ ہے جو اپنے اختیار کو طاقت کے طور پر نہیں بلکہ خدمت کے طور پر استعمال کرے اور عوام کے مسائل کو محبت اور رحم دلی سے حل کرے۔

([1]) البخاری، صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب: الرفق فی الأمر کلہ، دار ابن کثیر، بیروت، ۱۹۸۷ء، حدیث: ۶۰۲۴، ج۸، ص ۳۳

([2]) مسلم بن حجاج، صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، ، حدیث: ۱۸۲۸

اعتدال انسان کی زندگی میں ایک ایسی خوبصورت صفت ہے جو اسے سکون، توازن اور سمجھداری عطا کرتی ہے۔ جب انسان افراط و تفریط سے بچ کر میانہ روی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنی خواہشات اور جذبات کو قابو میں رکھ کر بہتر فیصلے کرتا ہے۔ تعلیم کے میدان میں اعتدال یہ ہے کہ انسان نہ تو علم سے غفلت برتے اور نہ ہی صرف معلومات کے انبار میں الجھ جائے، بلکہ ایسا علم حاصل کرے جو کردار اور عمل دونوں کو بہتر بنائے۔ اسی طرح خرچ میں بھی درمیانہ روی ضروری ہے کہ نہ فضول خرچی کرے نہ بخل، بلکہ ضرورت اور استطاعت کے مطابق خرچ کرے۔

معاشرتی تعلقات میں بھی اعتدال کی بہت اہمیت ہے۔ یہ انسان کو دوسروں کے حقوق ادا کرنے اور اپنی ذمہ داریاں نبھانے میں مدد دیتا ہے۔ اگر معاشرے کے لوگ میانہ روی اختیار کریں تو وہاں انصاف، سکون اور بھائی چارہ قائم رہتا ہے، جبکہ شدت پسندی اور خود غرضی سے معاشرہ انتشار اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے اعتدال نہ صرف فرد کے کردار کو سنوارتا ہے بلکہ پورے معاشرے میں خوشحالی اور امن کا سبب بنتا ہے۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں توازن اور اعتدال کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کا مقصد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جو انصاف، امن اور محبت پر مبنی ہو۔ اسلام میں نہ شدت پسندی کی گنجائش ہے اور نہ ہی بے عملی کی، بلکہ یہ دین ہمیں درمیانی راہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔ غلو، فرقہ واریت اور انتہا پسندی امت کے اتحاد کو کمزور کرتی ہیں، جبکہ اعتدال، برداشت اور حکمت ہی ترقی، اتحاد اور فلاح کی اصل بنیاد ہیں۔

فصل سوم

انتہا پسندی کے اسباب و عوامل

فصل سوم

انتہا پسندی کے اسباب و عوامل

انتہا پسندی ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جو مختلف عوامل اور حالات کے اثر سے جنم لیتی ہے۔ یہ صرف کسی ایک نظریے یا گروہ تک محدود نہیں بلکہ سماجی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی حالات کی مجموعی صورتحال میں پروان چڑھتی ہے۔ جب افراد یا گروہ خود کو کسی خاص عقیدے یا نظریے کے مطابق محدود دیکھتے ہیں اور باقی دنیا کو اس سے الگ سمجھتے ہیں، تو وہ شدت پسندی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ اس کے پیچھے نفسیاتی عوامل بھی کارفرما ہوتے ہیں، جیسے ناکامی، مایوسی یا غصہ، جو بعض اوقات دہشت گردانہ کارروائیوں یا انتہا پسند گروہوں میں شمولیت کا سبب بنتے ہیں۔

مزید یہ کہ سماجی و سیاسی عدم استحکام، معاشی مشکلات، غربت، بے روزگاری اور مواقع کی کمی نوجوانوں کو انتہا پسندانہ نظریات کی طرف راغب کرتی ہیں۔ عالمی سطح پر طاقتور ممالک کی مداخلت یا دباؤ بھی اس رجحان کو فروغ دیتا ہے۔ علاوہ ازیں، مذہبی شدت پسندی، فرقہ واریت، تعصب، اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں انتہا پسندی کے پھیلاؤ میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

لہٰذا انتہا پسندی کی وجوہات کا تجزیہ کرنے کے لیے ہمیں تمام محرکات یعنی سیاسی، معاشی، سماجی اور مذہبی عوامل پر غور کرنا ہو گا، تاکہ ایسے اقدامات کیے جا سکیں جو پرامن اور متوازن معاشرے کے قیام میں معاون ہوں۔

۱- فکری جمود اور اجتہاد کے دروازے بند ہونا

مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کے فکری و دینی اسباب میں سب سے اہم فکری جمود (Intellectual Stagnation) اور تنگ نظری (Intolerance) ہیں۔ فکری جمود سے مراد یہ ہے کہ انسان یا معاشرہ اجتہاد، تحقیق اور علمی مکالمے کے دروازے بند کر دے، اور صرف ماضی کے جامد سانچوں میں فکر کو محدود کر دے۔ جب فکری ارتقاء رک جاتا ہے تو دین کی تعبیر و تشریح صرف تقلیدی اور جمود زدہ صورت میں باقی رہتی ہے، جس سے نئے مسائل کے حل اور معاشرتی تبدیلیوں کے جواب میں شدت پسندی جنم لیتی ہے۔

لغوی مفہوم

سوچنے، غور و خوض کرنے اور عقل کے استعمال کو فکر کہتے ہیں، ابن منظور فکر کا لغوی مفہوم بیان کرتے ہیں: "الفِكْرُ: إعمالُ الخاطر في الشيء "[1]- فکر کسی چیز میں غور و خوض کرنے کو کہتے ہیں۔

---

[1] ابن منظور، لسان العرب، ج۵، ص۶۵۷، مادة: فكر

المعجم الوسیط میں جمود کا معنی یوں بیان ہوا ہے:

"جَمَدَ الشيءُ: صار صلبًا متوقفًا عن الحركة"[(1)]۔

جمود کا مطلب ہے کسی چیز کا سخت اور حرکت سے رُک جانا۔

لہٰذا لغوی اعتبار سے "فکری جمود" کا مطلب ہے: سوچ و فکر کا رک جانا یا علمی و ذہنی ارتقاء کی صلاحیت سے محروم ہو جانا۔

اصطلاحی مفہوم

ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ فکری جمود کا اصطلاحی مفہوم بیان کرتے ہیں:

"إنّ تعطيل ملكة الاجتهاد، والركون إلى التقليد الجامد، هو السبب الأكبر في ركود الحياة الفكرية عند المسلمين "[(2)]۔

اجتہاد کی صلاحیت کو معطل کر دینا اور جامد تقلید پر اکتفا کرنا مسلمانوں کی فکری زندگی کے جمود کا سب سے بڑا سبب ہے۔

یہاں ابو الحسن رحمۃ اللہ علیہ علی ندوی بتاتے ہیں کہ فکری جمود اجتہاد کی معطلی اور تقلید پر انحصار کا نتیجہ ہے۔ یعنی اجتہاد کی صلاحیت کو معطل کر دینا اور جامد تقلید پر اکتفا کرنا مسلمانوں کی فکری زندگی کے جمود کا سب سے بڑا سبب ہے۔

محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ فکری جمود کے نقصانات کے بارے میں لکھتے ہیں:

"أكبر بلاء أصاب المسلمين هو الجمود الفكري الذي جعل عقولهم تعيش في قوالب الماضي،وتضيق بكل جديد، وكأنّ الدين لا يطيق حركة ولا اجتهاد "[(3)]۔

مسلمانوں پر آنے والی سب سے بڑی مصیبت فکری جمود ہے جس نے ان کے اذہان کو ماضی کے سانچوں میں قید کر دیا اور ہر نئی چیز کے لیے تنگ کر دیا، گویا دین حرکت اور اجتہاد برداشت ہی نہیں کرتا۔

---

(1) المعجم الوسیط، مجمع اللغہ العربیہ القاہرۃ ج ۱، ص ۱۴۶

(2) ابو الحسن الندوی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، دار القلم، دمشق، ص ۱۱۲

(3) محمد الغزالی، الإسلام المفترى علیہ، دار الشروق، القاہرۃ، ص ۸۹

الغزالی فکری جمود کو ماضی کی سختی اور تنگ نظری سے جوڑتا ہے۔ یعنی مسلمانوں پر آنے والی سب سے بڑی مصیبت فکری جمود ہے جس نے ان کے اذہان کو ماضی کے سانچوں میں قید کر دیا اور ہر نئی چیز کے لیے تنگ کر دیا، گویا دین حرکت اور اجتہاد برداشت ہی نہیں کرتا۔

مالک بن نبی رحمۃ اللہ علیہ فکری جمود کے بارے میں لکھتے ہیں:

"إنّ الأفكار عندما تفقد حيويتها تتحوّل إلى أصنام فكرية، وحينئذٍ يبدأ الركود الحضاري والفكري." (1) ۔

جب افکار اپنی زندگی اور تازگی کھو دیتے ہیں تو وہ فکری بتوں میں بدل جاتے ہیں، اور اسی وقت فکری و تہذیبی جمود شروع ہو جاتا ہے۔

مالک بن نبی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک فکری جمود دراصل نظریات کا تعمیری اوزار سے سخت بت میں تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔ جب افکار اپنی زندگی اور تازگی کھو دیتے ہیں تو وہ فکری بتوں میں بدل جاتے ہیں، اور اسی وقت فکری و تہذیبی جمود شروع ہو جاتا ہے۔

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فکری جمود کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"جب مسلمان ماضی کے ادوار کی تقلید میں محصور ہو گئے اور اجتہاد کی روح کھو بیٹھے تو یہی فکری جمود ہے[2]۔

انتہا پسندی کے اسباب اور عوامل ایک پیچیدہ سماجی و ذہنی مسئلہ ہیں جو کسی ایک وجہ تک محدود نہیں کیے جا سکتے۔ یہ ایک ایسا رجحان ہے جو انسانوں کی ذہنی، جذباتی اور معاشرتی کیفیت کے مجموعی اثرات سے جنم لیتا ہے۔ اکثر افراد یا گروہ خود کو مخصوص عقائد یا نظریات کے پابند سمجھتے ہیں اور باقی دنیا کو اس نظریے سے ہٹ کر دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ اپنے نظریات کو نافذ کرنے کے لیے ہر ممکن اقدام اختیار کرنے کے لیے مائل ہو جاتے ہیں۔ اس رویے میں شدت پسندی کی ابتدا ہوتی ہے، جو کبھی پر امن ذرائع کے ذریعے، اور کبھی تشدد یا جارحانہ عمل کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔

نفسیاتی اور ذاتی عوامل بھی انتہا پسندی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب افراد اپنی توقعات یا مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہ جاتے ہیں تو مایوسی، غصہ اور بے چینی ان کے رویے پر اثر ڈالتی ہے۔ یہ جذبات اکثر انتہا پسند گروہوں کی جانب رغبت پیدا کرتے ہیں، جو ان کی بے چینی کو ایک مخصوص نظریاتی بنیاد فراہم کر کے شدت پسندی

---

[1] مالک بن نبی، شروط النهضہ، دار الفکر، دمشق، ص ۵۷

[2] علامہ اقبال، تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ص: ۱۵۴

میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ یوں انسانی نفسیات اور سماجی محرکات کا ایک پیچیدہ امتزاج انتہا پسندی کے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

مزید برآں، سماجی و سیاسی عدم استحکام، معاشی مشکلات، غربت اور مواقع کی کمی بھی شدت پسندی کو پروان چڑھانے والے عوامل ہیں۔ جب افراد، خاص طور پر نوجوان، اپنی زندگی کے مواقع اور وسائل کی کمی محسوس کرتے ہیں تو وہ ایسے گروہوں کی جانب راغب ہو جاتے ہیں جو ان کے احساسِ محرومی اور مایوسی کو ایک طاقتور نظریے کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ فرقہ واریت، تعصب، اور انسانی حقوق کی پامالی بھی انتہا پسندی کو بڑھاوا دیتی ہے۔ اس طرح، انتہا پسندی کے مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے ہمیں سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ذہنی محرکات سب پر غور کرنا ضروری ہے تاکہ ایسے اقدامات کیے جا سکیں جو ایک پرامن، متوازن اور ہم آہنگ معاشرے کی تشکیل میں مددگار ہوں۔

بقول ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ

"فکری جمود سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ نئے حالات اور مسائل کو سمجھنے کے بجائے قدیم آراء پر اصرار کرے اور تبدیلی کو قبول نہ کرے[1] "۔

۲-تنگ نظری اور عدم برداشت

انتہا پسندی کے عوامل میں تنگ نظری اور برداشت کی کمی ایک نہایت اہم عنصر ہے۔ جب افراد یا گروہ اپنے نظریات اور عقائد میں سخت روی اختیار کرتے ہیں اور دوسروں کے موقف کو سمجھنے یا قبول کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، تو یہ رویہ معاشرتی اور فکری انتشار کا سبب بنتا ہے۔ تنگ نظری نہ صرف مکالمے اور اختلافِ رائے کے دروازے بند کر دیتی ہے بلکہ سماجی ہم آہنگی اور برادری کے رشتوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ اس کی وجہ سے لوگ صرف اپنی سوچ کو درست سمجھتے ہیں اور مخالفانہ نقطہ نظر کو غلط یا نقصان دہ قرار دیتے ہیں، جو رفتہ رفتہ شدت پسندی اور انتہا پسندی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

انتہا پسندی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب اور عامل تنگ نظری اور عدم برداشت ہے:

لغوی مفہوم

لغوی اعتبار سے تنگ نظری کا مطلب ہے محدود نظر اور فکر، یعنی محدود سوچ اور دوسروں کی آراء کو رد کرنا۔ ابن منظور لکھتے ہیں:

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ص ۴۵

"النَّظَر: تقليب البصر والبصيرة لإدراك الشيء ورؤيته... وضده ضيق النظر[1] "

نظر کا مطلب ہے عقل و آنکھ سے غور کر کے کسی چیز کو سمجھنا... اور اس کا ضد ہے تنگ نظری (محدود سوچ)۔

المعجم الوسیط میں ہے:"ضَيِّقُ الأُفُق: محدود التفكير، قليل الاطّلاع[2] ".

ضیق الافق وہ ہے جو محدود سوچ رکھتا ہو اور کم علم یا کم فہم ہو۔

اصطلاحی طور پر یہ رویہ ہے جس میں انسان اپنی رائے کو مطلق حق سمجھے اور دوسروں کے اختلاف کو برداشت نہ کرے۔ الشیخ محمد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ تنگ نظری کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

"التعصب وضيق الأفق هو أن يرى المرء رأيه وحده حقًّا، ويُبطل ما عدا[3] "

تعصب اور تنگ نظری یہ ہے کہ انسان اپنی رائے کو ہی حق سمجھے اور باقی سب کو باطل قرار دے۔

مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق

"التعصب هو أن يظنّ الإنسان أنّ رأيه هو الحقّ المطلق، فلا يحتمل سواه[4] "

تعصب (تنگ نظری) یہ ہے کہ انسان یہ گمان کرے کہ صرف اس کی رائے ہی مطلق حق ہے اور وہ کسی اور رائے کو برداشت نہ کرے۔

تنگ نظری لغوی طور پر محدود سوچ، اور اصطلاحی طور پر اختلافِ رائے کو برداشت نہ کرنا اور اپنی رائے کو مطلق حق سمجھنا ہے۔

فکری جمود اور تنگ نظری کے اثرات

قرآن کریم نے غلو اور تنگ نظری سے بچنے کی ہدایت دی ہے ارشاد باری تعالی ہے:﴿وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾[5] -اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانی امت بنایا۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:((هلك المتنطعون))[6] -غلو کرنے والے ہلاک ہو گئے۔

---

[1] لسان العرب، ج۵، ص، ۳۲۰، مادۃ: نظر

[2] المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیہ بالقاہرہ، ج۲، ص۵۴۰

[3] محمد غزالی ، فقہ السیرۃ، ص۱۱۲

[4] شبلی نعمانی، علم الکلام، ص۶۷

[5] البقرہ:۱۴۳

یہ نصوص واضح کرتی ہیں کہ تنگ نظری اور جمود دین کی روح کے منافی ہیں، کیونکہ اسلام اعتدال، وسعت اور اجتہاد کا مذہب ہے۔ لیکن جب فکر میں تازگی اور اجتہاد کا جذبہ ختم ہو جائے اور وہ تقلید و تعصب کی زنجیروں میں جکڑ جائے، تو ایک جامد ذہن پروان چڑھتا ہے جو نہ مکالمہ قبول کرتا ہے اور نہ مختلف آراء کو برداشت کرتا ہے۔ یہی کیفیت انتہا پسندی کے جنم لینے کا بنیادی سبب ہے۔ امام ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"فإذا تَقَلَّصَ العَقلُ عن النَّظرِ، واقتَصرَ على ما وَرِثَهُ مِن غَيرِ بَصيرةٍ، تَحَوَّلَ إلى عُقودٍ جامدةٍ، تُنتِجُ الغُلوَّ والتشدُّد " [1]۔

جب عقل غور و فکر سے دستبردار ہو جائے اور بغیر بصیرت کے صرف وراثت میں ملے ہوئے علم پر اکتفا کرے تو وہ سخت اور جامد عقائد میں بدل جاتا ہے جو غلو اور تشدد کو جنم دیتے ہیں۔

اسی طرح، تنگ نظری اور رائے پر اصرار دوسرے کو رد کرنے اور یہاں تک کہ کافر قرار دینے کا باعث بنتا ہے۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مَن جَعَلَ المختلِفَ فيه مِن مسائلِ الدِّينِ كالمجمَعِ عليه، فَقَد ضَلَّ وأضلَّ، وكانَ هذا أصلُ فِتنِ الأُمَّةِ وبِدَعِها [2]۔

جو شخص دینی اختلافی مسائل کو اجماعی مسائل کے برابر قرار دیتا ہے، وہ گمراہ بھی ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے، اور یہی فتنوں اور بدعتوں کی اصل ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ جب افراد اپنی رائے پر سختی سے اصرار کرتے ہیں اور دوسروں کی آراء کو رد کرتے ہیں، تو یہ معاشرتی اور فکری انتشار کو جنم دیتا ہے، جو بالآخر انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اس رویے کے نتیجے میں مکالمہ، برداشت اور فکری لچک معدوم ہو جاتی ہے اور انسان اپنے عقائد اور نظریات کو سخت اور محدود انداز میں دیکھنے لگتا ہے، جو دین کے حقیقی مقاصد سے دور لے جاتا ہے۔

فکری جمود اور تنگ نظری دراصل وہ زمین ہے جس پر انتہا پسندی پروان چڑھتی ہے۔ جب اجتہاد کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور تجدیدِ فکر کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے، تو تعصب غالب آ جاتا ہے اور اختلافِ رائے کو

---

[6] البقرہ:۱۴۳ صحیح مسلم، حدیث:۲۶۷۰

[1] ابن خلدون، المقدمہ، دار الفکر، بیروت، ص۳۴۵

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۱۹، ص۱۹۱

قبول کرنے کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دین ایک محدود اور سخت شکل اختیار کر لیتا ہے، اور لوگ اسے محض ظاہری شعائر یا چند فقہی اختلافات تک محدود دیکھنے لگتے ہیں۔

اس صورتحال میں دین کو نئے حالات اور بدلتی ہوئی ضروریات کے مطابق سمجھنے اور پیش کرنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ علمی اور فکری جمود کے اثرات ایسے ہیں کہ اجتہاد کو بدعت اور تنقید کو کفر قرار دیا جانے لگتا ہے۔ جب اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کیا جاتا تو یہ رویہ غلو، شدت پسندی اور تشدد کے لیے سازگار ماحول پیدا کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں معاشرے میں انتہا پسندی کے رجحانات مستحکم ہو جاتے ہیں۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جب اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا تو امت نے جمود اختیار کر لیا۔ نئے مسائل کا حل نہ نکل سکا اور نتیجتاً فرقہ واریت اور شدت پسندی کو فروغ ملا[1]۔

اسی طرح تنگ نظری ایک ہی مذہبی گروہ دوسرے کو نہ صرف غلط بلکہ "کافر" یا "گمراہ" کہنے لگتا ہے۔ یہی سوچ تکفیر اور باہمی نفرت کو جنم دیتی ہے۔ امام غزالی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"تکفیر کا دروازہ کھولنا سب سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ یہ مسلمانوں کے درمیان خونریزی اور عداوت کا سب سے بڑا سبب ہے"[2]۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے:

"إهمالُ مقاصِدِ الشريعةِ والاشتغالُ بالقشورِ يُفضي إلى الغُلوِّ والتنطّع" [3]۔

شریعت کے مقاصد کو نظر انداز کرنا اور ظاہری سطحی امور میں الجھ جانا غلو اور شدت پسندی کا باعث بنتا ہے۔

فکری جمود اور تنگ نظری نے مسلم معاشروں میں اختلافِ رائے کو دشمنی میں تبدیل کر دیا، اجتہاد کو محدود اور سوال و تنقید کو کفر کے زمرے میں ڈال دیا۔ یہ رویے وقت کے ساتھ دینی انتہا پسندی کے پھیلاؤ کے اہم عوامل بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر عباسی دور کے بعد فقہی مکاتب کو جامد کرنے اور اجتہاد کو محدود کرنے سے علمی جمود

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ترجمان القرآن پبلیکیشنز، ص ۴۵

[2] امام غزالی، فیصل التفرقہ بین الاسلام والزندقہ، دارالفکر، بیروت ص ۱۳۰

[3] الغزالي، إحياء علوم الدين دار المعرفہ، بیروت، ج ۱، ص ۳۶

نے جنم لیا، جس کے نتیجے میں فرقہ واریت اور تکفیری رجحانات سامنے آئے۔ آج کے دور میں بھی بعض شدت پسند گروہ اپنی تعبیرات کو "حق" اور باقی سب کو "باطل" قرار دیتے ہیں، جس کی بنیادی وجہ فکری جمود اور تنگ نظری ہے۔

کلاسیکی علماء جیسے ابن خلدون، ابن تیمیہ، اور امام غزالی کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ فکر کی بندش اور آراء پر تعصب دین کے اعتدال پسندانہ پہلو کو کس طرح متاثر کرتا ہے۔ اگر امت مسلمہ نے قرآن و سنت کے اصل پیغام، اعتدال اور وسعتِ نظر کو اپنانے کے بجائے جمود اور تنگ نظری کو جاری رکھا تو انتہا پسندی کے خاتمے کا مقصد کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

تنگ نظری، جسے ضیق الأفق بھی کہا جاتا ہے، دراصل فکری جمود کی ایک شکل ہے جو مختلف آراء اور تنوع کو رد کر کے معاشرت میں سختی، تعصب اور تشدد کو فروغ دیتی ہے۔ یہ رویہ سماجی ہم آہنگی، مکالمہ اور برداشت کے اصولوں کے خلاف ہے اور انتہا پسندی کے فروغ کا ایک اہم محرک ہے۔

۳-مذہب کا سیاسی استعمال

مذہب کا سیاسی استعمال (تسییس الدین) اس رویے کو کہا جاتا ہے جب مذہبی تعلیمات کو عوامی حمایت حاصل کرنے یا سیاسی اقتدار کے لیے بطور ذریعہ استعمال کیا جائے۔ اس صورت میں دین کے حقیقی مقاصد پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور اصل توجہ صرف طاقت کے حصول پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کا استعمال انتہا پسندی کو مزید بڑھا دیتا ہے، کیونکہ یہ دین کی اصل روح کو متاثر کرتا اور شدت پسندی کو ایک ہتھیار کے طور پر ابھارتا ہے۔ تاریخ میں بھی ایسے ادوار دیکھنے کو ملے ہیں جہاں مذہب کو اقتدار حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا گیا، جس نے معاشرت میں شدت پسندی اور فرقہ واریت کو جنم دیا۔ جب مذہب سیاسی فائدے کے لیے استعمال ہوتا ہے تو یہ فطری طور پر معاشرے میں انتہا پسندی اور تشدد کے امکانات کو بڑھا دیتا ہے۔ انسانی تاریخ ایسے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے جن میں اہل اقتدار کی ظلم و زیادتی، جبر، بربریت، اور استحصالی پالیسیوں کے باعث عوام بغاوت پر مجبور ہو گئے۔ ناانصافی، حکومتی نااہلی اور ریاستی جبر وہ بنیادی عوامل ہیں جو کسی بھی معاشرے میں انتہا پسندی کے فروغ کا سبب بنتے ہیں۔ جب ایک ریاست میں سیاسی ناانصافی عام ہو جاتی ہے، اور عوام کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا جاتا ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ عوامی بے چینی، عدم استحکام، اور شدت پسندی کی صورت میں نکلتا ہے۔

ایک قابل اور اہل حکومت کسی بھی ریاست کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ ایک انسان کے لیے متوازن خوراک اور مناسب دیکھ بھال۔ جب کسی ملک میں سیاسی عدم استحکام پیدا ہوتا ہے، تو عوام کے اندر بے چینی، اضطراب، اور عدم تحفظ کا احساس جنم لیتا ہے۔ سیاسی انتشار اور غیر یقینی صورتِ حال معاشرے میں خوف و ہراس

پیدا کرتی ہے، جس سے شدت پسند عناصر کو اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا موقع ملتا ہے۔ امام غزالی نے اس خطرے کی طرف اشارہ کیا:

"اتِّخاذُ الدِّينِ ذريعةً إلى الدُّنيا هو أساسُ الفسادِ في الأرضِ" [1]۔

نیاوی مقاصد کے لیے دین کو ذریعہ بنانا زمین میں فساد کی جڑ ہے۔

جب مذہب کو اقتدار کا ذریعہ بنایا جاتا ہے تو دین کا اعتدال پسند پیغام پس پشت چلا جاتا ہے اور شدت و سختی غالب آ جاتی ہے۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے خبردار کیا:

"مَن جَعَلَ الدِّينَ وسيلةً لطلبِ الرئاسةِ والمالِ، أضاعَ مقاصدَهُ وأدخلَ الأُمَّةَ في الفتنِ" [2]۔

جس نے دین کو سربراہی اور مال کے حصول کا وسیلہ بنایا اس نے دین کے مقاصد ضائع کیے اور امت کو فتنوں میں ڈال دیا۔

ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مقدمہ میں واضح کیا کہ جب سیاست مذہب کے نام پر ہو لیکن مقصود طاقت کا حصول ہو تو معاشروں میں فتنہ اور تنازع بڑھ جاتا ہے:

"إذا استُعمِلَ الدِّينُ في طلبِ الملكِ كانَ ذلكَ سبباً للفرقةِ والشقاقِ" [3]۔

جب دین کو بادشاہت اور اقتدار کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ تفرقہ اور اختلاف کا سبب بنتا ہے۔

اور جب مذہب کو سیاسی رنگ دیا جاتا ہے تو عوامی سطح پر بھی سخت گیر تعبیرات فروغ پاتی ہیں۔ فقہی اختلافات کو سیاسی ہتھیار بنا کر "کفر" اور "ایمان" کے پیمانے طے کیے جاتے ہیں۔

الماوردی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھتے ہیں:

"إذاصارتِ السِّياسةُ مُرتبطةً بالهوى والمطامعِ، انقلبت شريعةُ العدلِ إلى وسيلةٍ للظلمِ" [4]۔

جب سیاست خواہشات اور مفادات کے تابع ہو جائے تو عدل کی شریعت ظلم کے آلے میں بدل جاتی ہے۔

---

[1] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج 3، ص ۳۸۲

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۱۶

[3] الماوردی، الأحکام السلطانیہ، ص ۲۱۲

[4] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۲۰ الماوردی، الأحکام السلطانیہ، ص ۲۱۲

۴- استعماری دور اور سیاسی محرومیاں

مسلم معاشروں پر استعمار کے اثرات نہ صرف سیاسی بلکہ سماجی اور ثقافتی سطح پر بھی گہرے رہے۔ سیاسی خود مختاری کے زوال نے امت میں مایوسی اور بے بسی کے جذبات پیدا کیے، جس کے نتیجے میں لوگ اپنی قوت اور شناخت کو دوبارہ مضبوط کرنے کے خواہاں ہوئے۔ معاشرتی اور اقتصادی ڈھانچے میں زوال نے غربت، بے روزگاری اور مواقع کی کمی پیدا کی، جس نے نوجوان نسل میں ناامیدی اور بے چینی کو جنم دیا۔ ایسے حالات میں بعض افراد اور گروہ مذہبی اور نظریاتی شدت پسندی کی طرف مائل ہوئے، کیونکہ یہ انہیں اپنی طاقت اور اثر قائم رکھنے کا ذریعہ محسوس ہوئی۔

استعمار نے مسلم معاشروں کی تہذیب، تعلیم اور ثقافت پر بھی اثر ڈالا، جس سے لوگوں کی تاریخی شناخت اور فکری آزادی محدود ہو گئی۔ اقتدار سے محرومی اور ثقافتی پس پردہ دباؤ نے ردِ عمل کے طور پر شدت پسندانہ رویوں کو فروغ دیا۔ اس تمام عمل نے ایسے ماحول کو جنم دیا جہاں مذہبی اور فکری انتہا پسندی پھیلنے لگی، اور افراد و گروہ اپنے نظریات کو نافذ کرنے کے لیے کبھی پرامن اور کبھی جارحانہ راستے اپنانے لگے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ استعمار کی سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی مداخلت مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کے فروغ کا ایک اہم سبب بنی۔

استعماری طاقتوں نے مسلم دنیا میں نہ صرف سیاسی اقتدار چھینا بلکہ فکری و تہذیبی برتری کو بھی مجروح کیا گویا استعماری دور کی یلغار اور فکری زوال کا سبب بنی۔

ابن خلدون اس حقیقت کو یوں بیان کرتے ہیں:

"المغلوبُ مولَعٌ أبداً بالاقتداءِ بالغالبِ في شِعارِهِ وزِيِّهِ وسائرِ أحوالِه"[1]۔

مغلوب ہمیشہ غالب کی نقالی کرنے پر مائل رہتا ہے، خواہ وہ لباس ہو یا طریقِ زندگی۔

سیاسی استبداد اور عوام کو بنیادی حقوق سے محروم کرنا معاشرتی بے چینی اور ردِ عمل کو فروغ دیتا ہے۔ جب شہریوں کی رائے کو دبا دیا جائے اور ان کے مسائل حل کرنے کے کوئی راستے نہ ہوں، تو مایوسی اور غصہ شدت پسندی میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ اس محرومی کے اثر سے بعض افراد دین کو اپنے مقاصد کے لیے بطور ہتھیار استعمال کرنے لگتے ہیں اور سخت گیر تعبیرات اختیار کرتے ہیں۔ اس طرح سیاسی ناانصافی ایک ایسی زمین پیدا کرتی ہے جو دینی غلو اور انتہا

---

[1] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۴۵

پسندی کے فروغ کے لیے زرخیز ثابت ہوتی ہے۔ تاریخ بھی اس امر کی گواہ ہے کہ جہاں استبداد بڑھا، وہاں شدت پسندی نے بھی اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ ابن خلدون کے الفاظ ہیں:

"الظلمُ مؤذنٌ بخرابِ العمرانِ"[1]۔ ظلم تمدن کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

جب مسلمانوں کو اقتدار اور فیصلہ سازی کے حق سے محروم کر دیا گیا تو ان کے اندر احساسِ محرومی نے جنم لیا ،اور وہ اپنی شناخت سے محروم ہو کر مغربی استعمار کے ردِ عمل میں شدت پسندی کی طرف مائل ہوئے۔

سید قطب نے اس محرومی کو شدت پسندی کے اسباب میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الاستبدادُ السياسيُّ والحرمانُ من حقوقِ الأمّةِ يُنتِجُ بيئةً خصبةً للتطرّفِ والغُلوِّ"[2]۔

سیاسی استبداد اور امت کو حقوق سے محروم کرنا ایک ایسی زمین تیار کرتا ہے جہاں انتہا پسندی اور غلو پروان چڑھتے ہیں۔

سیاسی محرومی کے ردِ عمل میں مسلم معاشروں میں مذہبی بنیادوں پر قائم تحریکیں ابھریں، جو استعمار کے خلاف مزاحمت کا ذریعہ بنیں۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ان تحریکوں میں شدت اور سختی پیدا ہوئی۔

سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"جب مسلمان سیاسی غلبے سے محروم ہو گئے تو ان کے اندر یہ احساس بیدار ہوا کہ محض دینی بقا اسی وقت ممکن ہے جب وہ اپنی سیاسی حاکمیت واپس حاصل کریں" [3]۔

یہ سوچ رفتہ رفتہ بعض حلقوں میں سخت گیر اور انتہا پسندانہ رویوں میں ڈھل گئی۔ استعماری طاقتوں نے مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی بنیادوں کو جان بوجھ کر کمزور کیا، جس کے نتیجے میں معاشرتی محرومی اور ناانصافی میں اضافہ ہوا اور انتہا پسندی کو فروغ ملا۔ ظلم، جبر اور استبدادی حکمرانی نے مسلم معاشروں کو نہ صرف سیاسی طور پر کمزور کیا بلکہ فکری اور مذہبی سطح پر بھی بحران سے دوچار کر دیا۔ اس سیاسی و سماجی شکست نے سخت گیر اور شدت پسندانہ رویوں کے لیے مواقع پیدا کیے۔ نتیجتاً، استعمار کے اثرات نے امت مسلمہ میں فکری جمود، محرومی اور انتہا پسندی کو تقویت دی۔ اس مسئلے کے حل کے لیے ضروری ہے کہ عدل، خود مختاری اور اعتدال پر مبنی سیاسی و سماجی نظام کو دوبارہ قائم کیا جائے۔

---

[1] ایضاً، ص ۲۶۵

[2] سید قطب، معالم فی الطریق، ص ۳۲

[3] سید ابو الاعلیٰ مودودی، اسلامی ریاست، ص ۴۱

۵-کمزور اور یک رُخی تعلیمی نظام

مسلم معاشروں میں فکری اور دینی انتہاپسندی کی ایک اہم وجہ کمزور اور یک رُخی تعلیمی نظام بھی ہے۔ جب تعلیم میں توازن، تنقیدی سوچ اور وسعتِ نظر کی کمی ہو، تو نوجوان نسل آسانی سے انتہاپسندانہ نظریات کے اثر میں آجاتی ہے۔ تعلیم کسی بھی معاشرے کی فکری اور اخلاقی بنیاد مضبوط کرنے کا سب سے اہم ذریعہ ہے، مگر جب یہ یک رُخی اور محدود ہو جائے تو وہ جمود، تنگ نظری اور شدت پسندی کو فروغ دیتا ہے۔ جب مسلم معاشروں میں تعلیم صرف محدود دائرے تک محدود رہ گئی اور تخلیقی سوچ، اجتہادی فکر اور وسعتِ نظر کو نظر انداز کیا گیا، تو معاشرہ علمی و سائنسی ترقی سے محروم رہ گیا۔ ایسے حالات میں برداشت، مکالمہ اور تنوع کی اقدار کمزور ہو گئیں اور شدت پسندی نے جگہ پائی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایک متوازن، ہمہ جہت اور تخلیقی تعلیمی نظام کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔

کمزور اور یک رُخی تعلیمی نظام نے امت کے فکری و عملی توازن کو مجروح کیا۔ امام الغزالی نے علم کے صحیح مقصد پر زور دیتے ہوئے کہا:

"العِلمُ بلا عملٍ جنونٌ، والعملُ بلا عِلمٍ لا يكون والغُلوّ" [1]۔

علم بغیر عمل کے جنون ہے، اور عمل بغیر علم کے ممکن ہی نہیں۔

یک رُخی تعلیم نے عقل و نقل کے درمیان توازن بگاڑ دیا۔ ابن خلدون نے المقدمۃ میں واضح کیا:

"فإذا اقتصَر التعليمُ على الحفظِ دونَ الفَهمِ، أورثَ الجمودَ والعجزَ عن الإبداعِ" [2]۔

جب تعلیم صرف حفظ تک محدود ہو اور فہم شامل نہ ہو تو وہ جمود اور تخلیقی صلاحیت کے فقدان کو جنم دیتی ہے۔

کمزور تعلیمی ڈھانچے نے علم کو عمل اور اخلاق سے جدا کر دیا یہی جمود بعد میں انتہا پسندی کے رجحانات کے لیے زمین ہموار کرتا ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے علم کی جامعیت کے بارے میں لکھا:

"مَن اقتصرَ على نوعٍ واحدٍ من العلمِ ضلَّ، وكانَ سبباً للانحرافِ" [3]۔

جو شخص علم کی صرف ایک قسم پر اکتفا کرے وہ گمراہ ہو جاتا ہے اور یہ انحراف کا سبب بنتا ہے۔

نتیجتاً معاشرے میں برداشت، تنوع اور اجتہادی فکر کی جگہ شدت اور جمود نے لے لی۔

---

[1] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۵۳

[2] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۳۴۷

[3] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۱۰، ص ۳۶۳

یوں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کمزور اور یک رُخی تعلیمی نظام نے مسلم معاشروں کو علمی جمود، فکری انحراف اور شدت پسندی کی طرف مائل کر دیا۔ اس سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم کو صرف نصابی حد تک محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کے اصل مقاصد، یعنی اخلاق، عملی تربیت اور اجتہادی سوچ کے ساتھ جوڑا جائے، تاکہ معاشرہ اعتدال، وسعتِ نظر اور توازن کی راہ اختیار کرے۔ یک رُخی نظام نے مختلف علوم کے امتزاج کو ختم کر کے فکری پسماندگی کو بڑھایا، اس لیے تعلیم کو ہمہ جہت، متوازن اور زندگی کے ہر پہلو کو شامل کرنے والا بنایا جانا ضروری ہے۔

٦-غربت اور سماجی ناانصافیاں

معاشی محرومیاں، بے روزگاری اور سماجی ناہمواریاں بھی انتہا پسندی کو فروغ دینے والے اہم عوامل ہیں۔ جب افراد اپنی بنیادی ضروریات پوری نہیں کر پاتے اور انصاف کے نظام میں کمزوری ہو تو معاشرتی محرومی، بے چینی اور شدت پسندی پیدا ہوتی ہے۔ اسلامی تعلیمات میں غربت کے خاتمے، عدلِ اجتماعی اور معاشرتی توازن کے قیام پر خاص زور دیا گیا ہے۔ غربت اور ناانصافی نہ صرف افراد کی ذاتی زندگی کو متاثر کرتی ہیں بلکہ یہ معاشرتی استحکام کے لیے بھی خطرہ ہیں اور انہیں انتہا پسندانہ رجحانات کی طرف مائل کر دیتی ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالعَدلِ وَالإِحسانِ ﴾[1]- بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے۔

حضرت علیؓ نے فرمایا: "ما جاعَ فقيرٌ إلّا بما مُتِّعَ به غنيٌّ" [2]-

کوئی فقیر بھوکا نہیں رہتا مگر اس لیے کہ کسی امیر نے اس کا حق کھالیا۔

ابن خلدون نے ظلم اور ناانصافی کو معاشرتی تباہی کا سبب قرار دیا:

"الظلمُ مؤذنٌ بخرابِ العمرانِ" [3]-ظلم تمدن کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔

علامہ الغزالی کا قول ہے: " لو كان الفقرُ رجلاً لقتلته" [4]-اگر فقر ایک آدمی ہوتا تو میں اسے قتل کر دیتا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ غربت صرف ایک معاشی مسئلہ نہیں بلکہ انسانی وقار اور معاشرتی استحکام کے لیے بھی ایک سنگین خطرہ ہے۔ جب سماجی ناانصافی عدل و مساوات کے اصولوں کو ختم کر دیتی ہے تو اس کے نتیجے میں معاشرتی انتشار جنم لیتا ہے، اور اسی انتشار کے ماحول میں انتہا پسندی کی جڑیں مضبوط ہو جاتی ہیں جو امن وامان کو تباہ کر

---

[1] النحل: ۹۰

[2] نہج البلاغہ، تحقیق: صبحی صالح، بیروت، حکمت ۳۲۸

[3] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۶۵

[4] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۲، ص ۱۸۳

دیتی ہیں۔ مسلم معاشروں میں غربت اور استحصال نے محرومی اور مایوسی کو فروغ دیا، خاص طور پر نوجوان نسل کو شدت پسندی اور انتہا پسند نظریات کی طرف مائل کیا۔ اس لیے پائیدار امن اور معاشرتی توازن قائم کرنے کے لیے عدل، مساوات اور فلاحی نظام کی ضرورت ناگزیر ہے، تاکہ ہر فرد کو زندگی کے مساوی مواقع حاصل ہوں اور معاشرہ اعتدال و توازن کی راہ پر گامزن ہو۔

۷۔مغربی تہذیب کا ردعمل

مسلم معاشروں میں انتہا پسندی اور شدت پسندی صرف داخلی عوامل کا نتیجہ نہیں بلکہ بیرونی اثرات نے بھی اس کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ خاص طور پر مغربی تہذیب، اس کے ثقافتی اور سیاسی دباؤ نے ایک ردِ عمل کو جنم دیا جس نے فکری جمود، معاشرتی انتشار اور دینی شدت پسندی کو فروغ دیا۔ استعماریت (Colonialism)، مغربی بالادستی اور جدیدیت کے یکطرفہ اثرات نے مسلم دنیا میں ردِ عمل کے جذبات کو بھڑکایا، جس کے نتیجے میں بعض گروہوں نے شدت پسندی کو اپنی تہذیبی اور مذہبی شناخت کے تحفظ کا ذریعہ بنایا۔

اس ردِ عمل کے دوران بعض حلقوں کا ماننا تھا کہ موجودہ مسلم معاشرے "جاہلیت" کی حالت میں ہیں اور مغربی فکر اور اثرات کی غلامی سے نجات کے بغیر حقیقی اسلامی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ ردِ عمل بعض اوقات تشدد اور انتہا پسندی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، جس سے معاشرتی استحکام اور اعتدال پسندی کے فروغ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ سید قطب لکھتے ہیں:

"إن العالم يعيش اليوم في جاهلية من ناحية الأصل الذي تنبثق منه مقومات الحياة وأنظمتها" [1]۔

دنیا آج ایک نئی جاہلیت میں جی رہی ہے، اس بنیاد کی وجہ سے جس سے زندگی کے اصول اور نظام نکلتے ہیں۔

مودودی مغربی سیاسی و تہذیبی اثرات کو اسلامی معاشرت کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں اور اسلامی نظام کے قیام پر زور دیتے ہیں لکھتے ہیں:۔

"اسلام کا نصب العین محض روحانی یا انفرادی نجات نہیں بلکہ اجتماعی نظام کی اصلاح اور حاکمیتِ الٰہیہ کا قیام ہے۔" [2]۔

---

[1] قطب، معالم في الطريق، ص ۲۱

[2] مودودی، تجدید و احیائے دین، اسلامی پبلیکیشنز لاہور، ص ۳۵

گیلز کیپل (Gilles Kepel) کے بقول، سیاسی اسلام مغربی جدیدیت اور عالمی نظام کے ردِ عمل کے طور پر سامنے آیا۔ گیلز کیپل لکھتا ہے:

"The explicit objective of these multiple attacks in the West is to provoke reprisals targeting Muslims living in Europe and the United States"(1)-

مغرب میں ان متعدد حملوں کا واضح مقصد یورپ اور امریکہ میں مقیم مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے لیے انتقامی کارروائیوں کو اکسانا ہے۔

گیلز کیپل کے بیان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مغربی ممالک میں ہونے والے دہشت گردانہ حملے محض فوری جانی یا مالی نقصان کا سبب نہیں بنتے، بلکہ ان کے پیچھے ایک طویل المدت سماجی و نفسیاتی حکمتِ عملی بھی چھپی ہوتی ہے۔ شدت پسند عناصر چاہتے ہیں کہ ان حملوں کے ردِ عمل میں یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے خلاف نفرت، امتیازی سلوک اور سخت اقدامات بڑھ جائیں۔ اس طرح کے اقدامات سے نوجوان مسلمان خود کو غیر محفوظ، الگ تھلگ اور محروم محسوس کرنے لگتے ہیں، جو انہیں انتہا پسندی کی طرف دھکیل سکتا ہے۔ نتیجتاً یہ حملے مغربی معاشروں میں اسلاموفوبیا کو ہوا دیتے ہیں اور ساتھ ہی مسلم نوجوانوں میں بیگانگی اور غصے کو بڑھا کر شدت پسندی کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ ان کا اصل ہدف وقتی تباہی نہیں بلکہ معاشرتی تقسیم اور طویل مدتی نفسیاتی نقصان پیدا کرنا ہوتا ہے۔

اولیور رائے Olivier Roy کہتا ہے:

This is not the radicalization of Islam, but the Islamization of radicalism"(2)-

یہ اسلام کی انتہا پسندی نہیں بلکہ انتہا پسندی کی اسلامائزیشن ہے۔

یہ جملہ "یہ اسلام کی انتہا پسندی نہیں بلکہ انتہا پسندی کی اسلامائزیشن ہے" اس بات کی نمائندگی کرتا ہے کہ موجودہ دور میں جو شدت پسندی یا دہشت گردی دیکھی جاتی ہے، وہ براہِ راست اسلام کی تعلیمات یا عقائد کا نتیجہ نہیں ہے۔ در حقیقت، معاشرتی، سیاسی اور نفسیاتی محرومیوں کا شکار بعض نوجوان پہلے ہی انتہا پسندی یا بغاوت کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ جب یہ افراد اپنی بغاوت یا عدم مطابقت کو کسی جواز کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، تو وہ مذہب

---

(1) Gilles Kepel Terror in France: The Rise of Jihad in the West, Princeton University Press, 2017

(2) Roy, Olivier. Islamic Extremism Is Not the Root Cause of Europe's Terror Problem. The Nation, August 20, 2018

کو ایک آلہ یا پردہ کے طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بنیاد "انتہا پسندی" ہے، اور اسلام صرف اس کو ظاہر کرنے یا شناخت دینے کا فریم ورک فراہم کرتا ہے، نہ کہ اس کا سبب بنتا ہے۔

ان کے مطابق یورپ میں ہونے والی شدت پسندی کی جڑیں براہِ راست مذہب اسلام میں تلاش کرنا درست نہیں، بلکہ یہ پہلے سے موجود انتہا پسندانہ اور بغاوتی رویوں کی عکاسی ہے جنہیں مذہبی رنگ دے دیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، نوجوان جو سماجی، معاشی یا سیاسی محرومی کا شکار ہیں، وہ اپنی بغاوت کو مذہبی علامات اور شعارات کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر مغربی تہذیب کے رد عمل کے تناظر میں بھی اہم ہے، کیونکہ جب مغرب مسلمانوں پر پابندیاں یا نفرت انگیز رویّے اپناتا ہے تو یہ نوجوان اپنی محرومی اور عدم تحفظ کو مذہبی شناخت کے ساتھ جوڑ کر شدت پسندی کی طرف راغب ہو جاتے ہیں۔

جان ایل ایسپوزیٹو (John L. Esposito) نے مغربی تہذیب کے ردِ عمل اور مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کے حوالے سے کہتا ہے:

"The 1990s 'will be a decade of new alliances and alignments in which the Islamic movements will challenge rather than threaten their societies and the West"[1].

۱۹۹۰ کی دہائی نئی اتحادیوں اور موافقتوں کا دور ہو گا، جس میں اسلامی تحریکیں مغلوب نہیں بلکہ اپنی معاشروں اور مغرب کو چیلنج کریں گی۔

۸- مذہبی قیادت میں تقسیم

امت مسلمہ کی فکری اور مذہبی یکجہتی ہمیشہ سے معاشرتی استحکام اور دین کے اعتدال پسندی کے فروغ کے لیے نہایت اہم رہی ہے۔ تاہم، تاریخی طور پر علماء کے مابین مسلکی اور فکری اختلافات، فتوے بازی اور تعصب نے بعض اوقات عوام کی رہنمائی کو مشکل بنا دیا اور انہیں مختلف تشریحات اور نظریات کے درمیان الجھا دیا۔ ایسے حالات میں عوام اکثر اپنی سوچ اور عمل کے لیے محدود ذرائع پر انحصار کرنے لگتی ہے، جس سے بعض افراد یا گروہ شدت پسند نظریات کے لیے آسان شکار بن جاتے ہیں۔ مذہبی قیادت میں اختلافات نہ صرف اختلافِ رائے تک محدود رہتے ہیں بلکہ فرقہ واریت اور تشدد کی شکل اختیار کرنے لگتے ہیں، جو انتہا پسندی کے فروغ میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ قرآنِ مجید نے واضح انداز میں امت اور مذہبی قیادت کو یہ ہدایت دی ہے کہ اختلاف و تفرقہ سے بچا جائے، اور امت میں اتحاد، تعاون اور اعتدال کو قائم رکھا جائے۔ اس طرح یہ نقطہ بھی انتہا پسندی

---

[1] John L. Esposito,, The Islamic Threat: Myth or Reality 1992,P207

کے عوامل اور اسباب کی فہرست میں ایک اہم عنصر کے طور پر سامنے آتا ہے، کیونکہ فکری انتشار اور قیادت میں تقسیم براہِ راست شدت پسند رویوں کے ابھار کا سبب بنتی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾[1]-

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو واضح دلائل آنے کے بعد بھی آپس میں پھٹ گئے اور اختلاف کرنے لگے۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

"ينهى الله تعالى هذه الأمة أن تكون مثل الأمم الماضية في تفرّقهم واختلافهم بعد قيام الحجة عليهم، بل أمرهم بالاجتماع على الدّين والتعاون على البرّ والتقوى."[2]-

اللہ تعالیٰ اس امت کو منع فرماتا ہے کہ وہ پچھلی امتوں کی طرح اختلاف اور تفرقے میں نہ پڑے، بلکہ دین پر اجتماع اور نیکی و تقویٰ میں باہمی تعاون کرے۔

مذہبی قیادت جب متحد نہ رہے تو عوام مختلف نظریاتی گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ یہی تقسیم دین کے اصل مقصد وحدتِ امت کو ختم کر دیتی ہے، اور نتیجتاً فکری شدت پسندی جنم لیتی ہے۔ سورۃ الروم میں ہے:

﴿مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾[3]-

ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، ہر گروہ اپنی ہی راہ پر خوش ہے۔

علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ اس ایت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"أي لا تكونوا مثل من اختلفت آراؤهم في دين الله، فتشيّعوا وتفرّقوا أحزابًا، كلّ فرقة ترى أنّ الحقّ معها، فذلك سبب الضلال والعداوة."[4]-

یعنی تم ان لوگوں کی طرح نہ بنو جنہوں نے دینِ الٰہی میں اپنی آراء کو بنیاد بنا کر مختلف گروہ بنا لیے، ہر گروہ اپنے آپ کو حق پر سمجھنے لگا، یہی گمراہی اور دشمنی کا سبب ہے۔

---

[1] آل عمران:۱۰۵

[2] تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص۹۳

[3] الروم:۳۲

[4] تفسیر الطبری، ج۲۱، ص۵۸

جب مذہبی رہنما اپنی آراء کو دین سے بڑھا کر پیش کرنے لگتے ہیں، تو ہر مسلک دوسرے کو باطل سمجھنے لگتا ہے۔یہی رویہ انتہاپسندی، نفرت اور تکفیر کے بیج بوتا ہے۔سورۃ الانعام میں ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾[1]۔

بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے، اے نبی! آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

تفسیر القرطبی میں ہے:

"هذا وعيدٌ شديدٌ لمن أحدث في الدين ما ليس منه، وتفرّق عن جماعة المسلمين، فإنّ التفرّق في الدين سبب الفساد والعداوة والبغضاء."[2]۔

یہ آیت ان لوگوں کے لیے سخت وعید ہے جنہوں نے دین میں نئی باتیں ایجاد کیں اور مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو گئے، کیونکہ دین میں تفرقہ فساد، دشمنی اور بغض کا سبب بنتا ہے۔

مسلم معاشروں میں فکری اور دینی انتہاپسندی کے پیچھے متعدد باہمی عوامل کام کرتے ہیں۔سب سے اہم سبب دینی فہم میں تنگ نظری اور دوسروں کے نقطۂ نظر کو برداشت نہ کرنے کا رویہ ہے، جو معاشرتی اور فکری انتشار کو جنم دیتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ تعلیمی پسماندگی اور علمِ دین کے ساتھ دنیاوی وفکری علوم سے دوری بھی ایک اہم سبب ہے، کیونکہ اس سے نوجوان نسل میں متوازن سوچ اور اجتہادی رویہ پیدا نہیں ہوتا۔مذہبی قیادت میں اختلافات اور گروہ بندی نے عوام کو الجھایا اور بعض اوقات شدت پسندی کی طرف مائل کیا۔سیاسی محرومیاں، سماجی ناانصافیاں، اور اقتصادی محرومی بھی اس رجحان کو تقویت دیتی ہیں۔مزید برآں، خارجی اثرات، میڈیا پروپیگنڈا، عالمی طاقتوں کے سیاسی اور معاشی مفادات، اور دینی تعلیم کی غلط تشریحات نوجوانوں میں محرومی اور احساسِ کمتری کو بڑھا کر انتہاپسندی کو مضبوط کرتے ہیں۔

یہ سب عوامل مل کر ایک ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں جہاں علم، فہم، اور اعتدال پسندی کے اسلامی اصول کمزور پڑ جاتے ہیں۔نوجوان نسل غیر متوازن سوچ اور محدود رہنمائی کے سبب شدت پسند نظریات کی گرفت میں آ جاتی ہے، جس سے معاشرتی ہم آہنگی اور فکری توازن متاثر ہوتا ہے۔اس صورتحال سے نجات کے لیے ضروری ہے کہ امت مسلمہ میں دینی تعلیم کو اجتہاد، عقل و فکر، اور اخلاقی اصولوں کے ساتھ جوڑا جائے، تاکہ نوجوان متوازن رویہ اختیار کریں اور معاشرہ اعتدال، عدل اور فہم پر قائم ہو۔

---

[1] سورۃ الأنعام:۱۵۹

[2] تفسیر القرطبی، ج۷، ص۲۵۹

خلاصہ کلام یہ ہے کہ انتہا پسندی کے اسباب محض ایک وجہ سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ یہ مختلف سماجی، سیاسی، تعلیمی، اور دینی عوامل کے باہمی اثرات کا نتیجہ ہیں۔ امت مسلمہ کی فلاح اور استحکام کے لیے لازم ہے کہ ہم فکری اصلاح، تعلیم میں توازن، سماجی عدل، اور دینی اصولوں کی وسعت کو فروغ دیں، تاکہ نوجوان نسل کو اعتدال، برداشت، اور علمی روشنی کی راہ پر گامزن کیا جا سکے۔ اس طرح نہ صرف انتہا پسندی کا خاتمہ ممکن ہو گا بلکہ اسلامی معاشروں میں امن، ہم آہنگی اور ترقی کے راستے بھی کھلیں گے۔

فصل چہارم

انتہا پسندی کا تاریخی پسِ منظر

فصل چہارم

انتہا پسندی کا تاریخی پسِ منظر

تاریخِ انسانی کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انتہا پسندی خواہ فکری ہو، عملی ہو یا سماجی کسی ایک قوم، مذہب یا تہذیب تک محدود نہیں رہی، بلکہ ہر دور اور ہر معاشرے میں یہ رجحان کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔ اور یہ کہ انتہا پسندی محض ایک عارضی یا مقامی مسئلہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اور قدیم انسانی رویہ ہے۔

جب افراد یا اقوام اپنے نظریات، عقائد اور جذبات میں اعتدال سے انحراف کرتے ہوئے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ انتہا پسندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ انتہا پسندی کبھی مذہبی سخت گیری، کبھی نظریاتی جمود اور کبھی سیاسی و سماجی شدت پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جو بالآخر معاشرتی بگاڑ، انتشار اور تصادم کا موجب بنتی ہے۔ تاریخی شواہد اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ انتہا پسندی بالعموم جہالت، تعصب اور غیر متوازن جذباتی وابستگی سے پروان چڑھتی ہے، اور اسی کے نتیجے میں معاشرے تقسیم، جنگوں اور بالآخر تہذیبی زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ قدیم مذاہب میں انتہا پسندی کے شواہد ملتے ہیں۔ ہر مذہب کا اصل پیغام ہمیشہ امن، رواداری اور انسانیت کی فلاح پر مبنی رہا، مگر جیسے جیسے انسانی معاشرے ترقی کرتے گئے، کچھ گروہوں نے اپنے مذہبی عقائد میں شدت اور غلو پیدا کر لیا۔ یہی غلو وقت کے ساتھ ساتھ انتہا پسندی میں تبدیل ہو گیا اور نتیجتاً ان مذاہب کے اصل پیغام کو بھی مسخ کر دیا گیا۔

بنی اسرائیل کی انتہا پسندی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر الزامات قرآن نے متعدد مقامات پر واضح کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں حد سے بڑھ کر غلو اور انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے ان کی رسالت کو تسلیم کرنے کے بجائے ان پر سنگین الزامات عائد کیے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ولد الزنا ہونے کا الزام لگایا، قرآن میں حضرت مریم علیہا السلام پر یہودیوں کی تہمت کا ذکر ہے:

﴿وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا﴾[1]۔

اور ان کے کفر کے سبب اور مریم علیہا السلام پر ان کی بہتانِ عظیم کے سبب (ہم نے ان پر لعنت کی)۔

مفسرین کی آراء کے مطابق آیت سے مذکور ﴿ بُهْتَانًا عَظِيمًا ﴾ بہتان عظیم سے مراد "ولد الزنا" کا الزام ہے جو یہود نے حضرت مریم علیہا السلام پر لگایا ہے۔ (معاذ اللہ)

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

---

[1] سورۃ النساء:۱۵۶

"أي رموها بأنها بغت، وحاشاها وبراها الله، فهم كذبة في قولهم ذلك. ولهذا قال: "بُهْتَانًا عَظِيمًا""[1]۔

انہوں نے (مریم علیہا السلام) پر زنا کا الزام لگایا، حالانکہ وہ اس سے پاک تھیں اور اللہ نے ان کو بری کر دیا۔ پس وہ اپنے اس قول میں جھوٹے ہیں، اور اسی لیے اللہ نے فرمایا "بہتان عظیم"۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے بھی یہی وضاحت کی ہے:

"أي قذفوها بولدها عيسى عليه السلام، وأنها أتت به من غير زوج، وهذا من أعظم الكذب وأفحش البهتان"[2]۔

انہوں نے مریم علیہا السلام پر تہمت لگائی کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر شوہر کے لے آئیں، اور یہ سب سے بڑا جھوٹ اور سب سے بھاری بہتان ہے۔

اسی طرح یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی ماننے کے بجائے (معاذ اللہ) جادوگر اور مفتری قرار دیا۔ اس طرزِ عمل کا ذکر انجیل میں بھی ہے، اور مفسرین کے مطابق قرآن کے اشارات سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ وہ ان پر جادو کا الزام لگاتے تھے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ اس پر لکھتے ہیں:

"وذلك أن اليهود عليهم لعائن الله اجتمعوا على بغض عيسى عليه السلام، وسعوا في أذاه بكل ما أمكنهم، ونسبوه وأمه إلى أمور عظيمة فبرأهما الله منها، ورموه بأنه ساحر، كذاب، وأنه ولد زنية"[3]۔

یہود (علیہم لعائن اللہ) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بغض میں جمع ہو گئے اور ہر طرح انہیں اذیت دینے کی کوشش کی۔ انہوں نے ان اور ان کی والدہ پر جھوٹے الزامات لگائے، اور کہا کہ وہ جادوگر ہیں، جھوٹے ہیں اور (معاذ اللہ) ولد الزنا ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"وقالت اليهود: إنه ساحر كذاب، وأرادوا قتله وصلبه، فصان الله نبيه ورفعه إليه"[4]۔

---

[1] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۷۰

[2] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج ٦، ص ۲۱

[3] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۷۰

[4] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج ٦، ص ۲۲

یہود نے کہا کہ وہ (عیسیٰ علیہ السلام) جادوگر اور جھوٹے ہیں، اور وہ انہیں قتل اور صلیب دینا چاہتے تھے، لیکن اللہ نے اپنے نبی کی حفاظت فرمائی اور انہیں اپنی طرف اٹھالیا۔

مصلوب کرنے کا دعویٰ قرآن میں یہودیوں کے اس دعوے کو بھی نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل اور صلیب پر چڑھادیا:

﴿ وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ اللَّهِ وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ﴾[1]۔

اور ان کے اس دعوے کی وجہ سے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ بن مریم، جو اللہ کے رسول تھے، کو قتل کر دیا، حالانکہ نہ انہوں نے انہیں قتل کیا اور نہ ہی سولی پر چڑھایا، بلکہ ان کے لیے معاملہ مشتبہ بنادیا گیا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ "شُبِّهَ لَهُمْ" کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ کی مشابہت کسی دوسرے شخص کے ساتھ کر دی ہے، اور یہود نے اسی کو مصلوب کر دیا۔

امام قرطبی رحمہ اللہ "شُبِّهَ لَهُمْ" کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"والصحيح أن الله تعالى ألقى شبه عيسى على غيره، وأرفع عيسى ببدنه وروحه إلى السماء. وقال وهب: ألقى شبهه على رجل منهم فأخذ وقتل وصلب"[2]۔

صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مشابہت کسی دوسرے شخص پر ڈال دی اور حضرت عیسیٰ کو جسم وروح سمیت آسمان پر اٹھالیا۔ وہب (بن منبہ) کا قول ہے کہ ان میں سے ایک شخص پر ان کی شباہت ڈال دی گئی، چنانچہ اسے پکڑ کر قتل اور صلیب دے دی گئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہود کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ رویے اور انتہا پسندی کی وضاحت کی ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((ما من نبي إلا وقد أوذي، وإن منهم من ضرب، وإن منهم من قتل، وإن منهم من نشر بالمناشير))"[3]۔

کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کو ایذا نہ دی گئی ہو؛ بعض کو مارا گیا، بعض کو قتل کیا گیا اور بعض کو آروں سے چیرا گیا۔

---

[1] سورۃ النساء:۱۵۷

[2] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۶، ص ۲۲

[3] مسند احمد، حدیث ۲۳۴۰۸

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل نے انبیاء کرام کے ساتھ جس ظلم وزیادتی کا سلسلہ قائم کیا، وہ انتہا پسندی کی انتہائی مثال ہے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل یا صلیب پر چڑھانے کی کوشش بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو تسلیم کرنے کے بجائے ان پر سنگین الزامات عائد کیے:

۱۔ حضرت مریم پر تہمت لگا کر انہیں ولد الزنا کہا،

۲۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جادوگر اور جھوٹا قرار دیا،

۳۔ اپنے گمان میں انہیں مصلوب کرنے کا دعویٰ کیا۔

تاہم قرآن نے ان تمام الزامات کو غلط قرار دیا اور واضح فرمایا کہ نہ تو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا اور نہ ہی صلیب پر چڑھایا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حفاظت میں آسمان پر اٹھالیا۔

یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں حد سے تجاوز کرتے ہوئے انکار اور الزام تراشی کی، جبکہ عیسائیوں نے محبت کے جذبے میں افراط کرتے ہوئے انہیں خدا کا بیٹا اور الوہیت کا درجہ دے دیا۔ یہ دونوں انتہا پسندانہ رویے اس بات کی واضح مثال ہیں کہ کس طرح افراط و تفریط نے اصل الہامی تعلیمات کو مسخ کر دیا۔

اس کے برعکس، اسلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مقام و مرتبے کے بارے میں ایک نہایت متوازن اور معتدل موقف اپنایا، جس کی بہترین وضاحت سورہ مریم کی ابتدائی آیات میں بیان کی گئی ہے، جہاں ان کی فضیلت اور پیغام کو اعتدال اور حقیقت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قرآنِ مجید نے یہود و نصاریٰ میں پائے جانے والے غلو کی نشاندہی کی ہے اور مسلمانوں کو اس روش سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں یہود و نصاریٰ کو ان کے غلو پر تنبیہ کی۔

﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ ۖ وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ﴾[1]۔

اے کتاب والو! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو اور اللہ پر سچ کے سوا کوئی بات نہ کہو۔ بیشک مسیح، مریم کا بیٹا عیسیٰ صرف اللہ کا رسول اور اس کا ایک کلمہ ہے جو اس نے مریم کی طرف بھیجا اور اس کی طرف سے ایک خاص روح ہے تو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور نہ کہو (کہ معبود) تین ہیں۔ (اِس سے) باز رہو، (یہ) تمہارے لئے بہتر ہے۔ صرف اللہ ہی ایک معبود ہے۔

---

[1] سورۃ النساء: ۱۷۱

امام قرطبی رحمہ اللہ اہل کتاب کے غلو کے بارے میں کہتے ہیں:

"... فنهوا عن غلوهم في دينهم، وذلك نحو قول النصارى في عيسى: إنه رب، أو ابن الله، أو ثالث ثلاثة، وقول اليهود في عزير إنه ابن الله، وقولهم في أنبيائهم وأحبارهم ما لا يحل لهم"[1]۔

پس اہلِ کتاب کو اپنے مذہب میں انتہا پسندی سے منع کیا گیا تھا۔ یہ غلو ان کے عقیدوں میں اس طرح ظاہر ہوا کہ نصاریٰ نے کہا: عیسیٰ رب ہیں، یا اللہ کے بیٹے ہیں، یا تین میں سے ایک ہیں۔ اسی طرح یہود نے کہا: عزیر اللہ کے بیٹے ہیں۔ نیز انہوں نے اپنے انبیاء اور علما کے بارے میں ایسی باتیں کہیں جو ان کے لیے جائز نہیں تھیں۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"يقول تعالى ناهياً أهل الكتاب عن الغلو والإطراء، وهذا كثير في النصارى، فإنهم تجاوزوا الحد في عيسى حتى رفعوه فوق المنزلة التي أعطاه الله إياها، فنقلوه من مقام النبوة إلى أن جعلوه إلهاً من دون الله، يعبدونه كما يعبدونه، بل قالوا فيه أقوالاً باطلةً"[2]۔

اللہ تعالیٰ اہلِ کتاب کو دین میں غلو اور مبالغہ سے روکتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر عیسائیوں میں زیادہ پائی گئی ہے، کیونکہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حد سے تجاوز کیا اور انہیں اس مرتبے سے بلند کر دیا جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا تھا۔ یہاں تک کہ انہیں نبوت کے مقام سے اٹھا کر معبود بنا دیا، اور انہیں اللہ کے ساتھ پوجنا شروع کر دیا۔ بلکہ ان کے بارے میں کئی باطل اور بے بنیاد عقیدے گھڑ لیے۔

قرآنِ مجید نے یہود و نصاریٰ کے عقائد میں پائے جانے والے غلو کو نہایت واضح اور تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کا غلو خاص طور پر انبیاء کرام کے مقام و مرتبہ میں حد سے تجاوز کرنے اور الوہیت کے تصور کو مسخ کرنے کی شکل میں ظاہر ہوا۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں "ابن اللہ" اور "ثالثُ ثلاثۃ" جیسے عقائد اختیار کر کے توحید کے خالص تصور کو بدل دیا، جبکہ یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا ماننے کے ساتھ اپنے احبار و رہبان کو بھی دین میں مطلق اختیار کا درجہ دے دیا۔

یہ رویّے نہ صرف وحیِ الٰہی کے اصل پیغام کو مٹا گئے بلکہ انسانوں کے عقائد کو انحراف اور شرک کی طرف

---

[1] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۶، ص۲۱

[2] ابن کثیر، تفسیر کثیر، ج۲، ص۴۲۱

موڑ دیا۔ قرآنِ کریم نے ان واقعات کو صرف تاریخی پس منظر کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ امتِ مسلمہ کے لیے ایک رہنمائی اور تنبیہ کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ مسلمان بھی کسی نبی، ولی یا عالم کے بارے میں ایسی انتہا پسندی یا تعظیم نہ کریں جو انہیں توحید سے ہٹا کر بدعت یا شرک کی طرف لے جائے۔

یوں قرآنِ کریم نے اعتدال کو دین کی بنیاد اور غلو کو دین کی بگاڑ کی جڑ قرار دیا ہے، اور امت کو ہدایت دی ہے کہ عقائد اور ایمان میں اعتدال کو برقرار رکھا جائے، ہر معاملے میں حدِ میانہ روی اپنائی جائے، اور کسی بھی شخص یا شخصیت کے بارے میں ایسے خیالات یا عمل سے گریز کیا جائے جو دین کے خالص تصور اور توحید کے اصول کے منافی ہوں۔

دورِ جاہلیت میں انتہا پسندی کی صورتیں

۱۔ فکری جمود

فکری جمود انسانی سوچ اور معاشرتی ترقی کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جب کسی قوم یا فرد کے عقائد و رویے اندھی تقلید، تعصب یا محدود سوچ کی قید میں رہ جائیں تو وہ عقل و استدلال کی روشنی سے محروم ہو جاتا ہے۔ فکری جمود نہ صرف علم و تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے بلکہ انسان کو اپنی رائے پر غیر ضروری طور پر ڈٹ جانے، اختلاف برداشت نہ کرنے، اور شدت پسندانہ رویوں کو اپنانے کی طرف مائل کرتا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ وہ اقوام جو اندھی تقلید اور سخت تعصب میں مبتلا رہیں، اصلاح، انصاف اور اعتدال کے اصولوں سے دور رہیں اور اجتماعی ترقی سے محروم ہوئیں۔

قبل از اسلام عرب معاشرہ اسی فکری جمود اور قبائلی تعصب کی واضح مثال تھا۔ اس دور میں لوگ اندھی تقلید کے عادی تھے اور عقل و استدلال یا وحیِ الٰہی کی کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اندھی تقلید انسان کی تحقیق اور سوچنے کی صلاحیت کو ختم کر دیتی ہے، جس کے نتیجے میں ہر رائے یا عقیدے کو مطلق سچائی سمجھ کر شدت سے اپنایا جاتا ہے۔ انتہا پسند شخص کے نزدیک اس کی تقلید شدہ بات سے اختلاف کفر یا بغاوت کے مترادف ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ معاشرہ اصلاح اور ترقی سے محروم رہتا ہے۔ اسلام نے اس کے برعکس عقل، تدبر اور بصیرت کی دعوت دی تاکہ انسان دلیل کی روشنی میں حق تک پہنچے، اور معتدل سوچ پروان چڑھے۔ اندھی تقلید کو انتہا پسندی کی جڑ قرار دینا بالکل بجا ہے، کیونکہ یہی رویہ فکری آزادی اور معاشرتی اعتدال کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ قرآن مجید اس رویے پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا﴾[1]۔

([1]) سورۃ البقرہ:۱۷۰

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"هذا إنكار من الله تعالى على من قلد في دين الله آباءه وأسلافه فيما كانوا عليه من الضلال"[1]۔

اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر نکیر فرمارہے ہیں جو دینِ الٰہی میں اپنے آباء و اجداد کی گمراہی پر اندھی تقلید کرتے ہیں۔

قرآن میں ہے: ﴿ بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ ﴾[2]۔

ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک مخصوص راستے پر پایا ہے، اور ہم بھی انہی کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں۔

دورِ جاہلیت کا عرب معاشرہ فکری طور پر شدید طور پر محدود اور ذہنی جمود کا شکار تھا۔ لوگ نہ صرف وحیِ الٰہی سے ناآشنا تھے بلکہ عقل و استدلال کے بجائے اندھی تقلید کے پابند تھے۔ وہ اپنے آباء و اجداد کی رائے، رسوم و رواج کو بغیر کسی تنقیدی جائزے کے تسلیم کرتے، چاہے وہ اخلاق و فہم کے معیار پر پورے نہ اُترتے۔ یہ رویہ جمود اور جہالت کی علامت تھا، جہاں دلیل و منطق کی کوئی اہمیت نہ تھی اور صرف روایت ہی حتمی حق کے طور پر قبول کی جاتی تھی۔ یہی فکری جمود افراد کو اسلام کی معقول اور معتدل تعلیمات قبول کرنے سے روکتا تھا اور شدید مزاحمت اور تنگ نظری کی بنیاد بنتا تھا۔ اندھی تقلید تحقیق، سوال اور سچ کی تلاش کے دروازے بند کر دیتی ہے، اور اس کے نتیجے میں انسان ہر بات کو غیر مشروط سچ مان کر اس پر سخت رویہ اپناتا ہے۔ اسی طرح فکری آزادی کے فقدان نے انتہا پسندی کے بیج بو دیے، کیونکہ اعتدال اور میانہ روی صرف عقل، تدبر اور تحقیق کی روشنی میں ہی پروان چڑھ سکتی ہے۔

۲-قبائلی تعصب و عصبیت

دورِ جاہلیت کا دوسرا نمایاں پہلو قبائلی تعصب تھا، یعنی اپنی قوم یا قبیلے کو سب سے اعلیٰ اور دوسروں کو کمتر سمجھنا۔ ہر قبیلہ اپنی عظمت کا دعویٰ کرتا اور چھوٹی سے چھوٹی تلخ کشمکش پر بھی جنگ و جدل کو جنم دیتا۔ اس تعصب کی وجہ سے انسان اپنے قبیلے کی عزت اور سردار کی حرمت کے لیے اپنی جان تک قربان کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ قبائلی بنیادوں پر یہ رویہ شدت پسندی اور عملی تشدد کا سبب بنتا تھا۔ فکری جمود نے نئی ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت کو محدود کر دیا جبکہ قبائلی تعصب نے

---

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص ۲۱۲

[2] سورۃ الزخرف: ۲۳

حق و باطل کی تمیز مٹادی، اور اندھی حمایت کے نتیجے میں ظلم و غلو شدت اختیار کر گئے۔ اسلام نے آکر ان دونوں خطرناک رویوں کو ختم کیا: ایک طرف اجتہاد، تدبر اور تحقیق کی دعوت دے کر فکری جمود کا خاتمہ کیا، اور دوسری طرف عدل، مساوات اور اخوت کی بنیاد رکھ کر قبائلی تعصب کو ختم کیا، تاکہ معاشرے میں اعتدال، توازن اور انسانی وقار قائم ہو سکے۔

ابن ہشام کے مطابق، عرب جاہلیت میں اطاعت کا مرکز صرف قبائلی حمیت اور ضد تھی۔ آپ لکھتے ہیں:

"وكانت العرب في الجاهلية لا يُقِيمُونَ إلا على الحمية والأنفة، لا يُطِيعُونَ إلا العصبية" [1]

جاہلیت کے زمانے میں عرب صرف حمیت اور ضد پر قائم رہتے تھے اور وہ اطاعت بھی صرف تعصب اور قبائلی بنیاد پر کرتے تھے۔

عرب معاشرہ جاہلیت میں قبیلہ پرستی اور نسبی فخر میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان کے لیے حق و باطل کا معیار قبیلہ نہیں بلکہ اپنے قبیلے کی حمایت تھا۔ ظلم یا انصاف کی بجائے ان کے فیصلے قبیلے کی بنیاد پر ہوتے۔ قبائلی حمیت میں انسان اپنے قبیلے یا گروہ کو "مطلق حق" سمجھ کر اس کی حمایت میں حد سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ غیر معقول حمایت (Blind Loyalty) اصل میں غلو کی شکل ہے، کیونکہ انسان ظلم و باطل کو بھی درست ٹھہراتا ہے۔ جاہلیت میں قبیلوں کے جھگڑے اکثر اسی انتہاپسندی سے بڑھ کر جنگوں میں بدل جاتے تھے۔ **جنگِ داحس وغبراء**[2]۔ حرب الفجار[3]، بعاث کی جنگ[4]۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَن نَصرَ قَوْمَهُ عَلَى غَيْرِ الْحَقِّ فَهُوَ كالبَعِيرِ الَّذِي انْزَلَ فَهُوَ يُنْزَعُ بِذَنَبِهِ))[5]۔

جو شخص اپنے قبیلے کی ناحق مدد کرے، وہ اس اونٹ کی طرح ہے جسے دم سے پکڑ کر کھینچا جا رہا ہو۔

یہ تشبیہ بتاتی ہے کہ قبائلی تعصب کس طرح انسان کو ہلاکت کی طرف لے جاتا ہے۔

([1]) ابن ھشام، السیرۃ النبویہ، دار المعرفہ، ج۱، ص ۱۲۳

([2]) چھٹی صدی کی ایک طویل خانہ جنگی تھی جس نے متعدد قبائل کو نسلاً برباد کیا۔

([3]) ایک اور قبائلی تصادم، جس نے جنونی قتل و غارت اور نسلی تعصب کو بڑھاوا دیا۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، دار المعرفہ، بیروت، ج ۱، ص ۲۲۸

([4]) جنگ بُعاث اوس و خزرج کے درمیان یثرب میں ہجرت سے پہلے لڑی گئی ایک خونریز جنگ تھی جس نے دونوں قبائل کو کمزور کر دیا اور بعد میں اسلام کے قبول عام کی راہ ہموار ہوئی۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، ج۱، ص ۴۲۷

([5]) ابو داود، السنن، کتاب الآدب، حدیث: ۵۱۱۹

جاہلی معاشرہ شدید قبائلی عصبیت میں مبتلا تھا، جہاں انصاف یا حق و باطل کا معیار قبیلہ نہیں بلکہ محض اپنے قبیلے کی حمایت تھا۔ نبی کریم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے عصبیت جاہلیت کی موت قرار دیا ہے۔ آپ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

((مَن قَاتَلَ تَحْتَ رَايَةٍ عُمِّيَّةٍ، يَغْضَبُ لِعَصَبَةٍ، أَوْ يَدْعُو إِلَى عَصَبَةٍ، أَوْ يَنْصُرُ عَصَبَةً، فَقُتِلَ، فَقِتْلَةٌ جَاهِلِيَّةٌ))[1]۔

جو شخص اندھی جاہلی پرچم کے تحت لڑے، قبیلے کے تعصب میں غصہ کرے یا اس کی طرف بلائے یا اس کی مدد کرے اور پھر مارا جائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

۳-سماجی و اخلاقی تباہی

دورِ جاہلیت میں معاشرتی برائیاں اس حد تک عام ہو چکی تھیں کہ پورا معاشرہ بدامنی، ظلم اور ناانصافی کا شکار تھا۔ اس دور میں شراب نوشی ایک فخر کی علامت سمجھی جاتی تھی اور جوئے کو روزمرہ کی عادت قرار دیا جاتا تھا۔ عورتوں کو نہ تو وراثت کا حق حاصل تھا اور نہ ہی عزت و مقام دیا جاتا تھا، جبکہ بعض قبائل اپنی غیرت کے نام پر لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ کمزور طبقات مسلسل استحصال اور ظلم کے نشانے پر رہتے، اور طاقتور قبائل انہیں غلام بنا کر اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے۔ سود خوری نے معاشی ناہمواری کو فروغ دیا اور قبائلی حمیت کے نام پر انتقام و خون ریزی نسل در نسل منتقل ہوتی رہی۔ یوں یہ معاشرہ ظلم، اقتصادی و سماجی ناہمواری اور بدامنی کا گڑھ بن چکا تھا۔ اسلام نے آکر ان تمام برائیوں کا خاتمہ کیا، عدل، مساوات، انسانی حقوق اور عزتِ نفس کی تعلیمات کو رائج کر کے معاشرے کو متوازن، پرامن اور باعزت زندگی کی راہ دکھائی۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اس ظلم کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿إِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ﴾۔[2]

یہ اخلاقی زوال سماجی اور فکری انتہا پسندی کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتا تھا۔ جب انسان اور معاشرہ اپنی خواہشات اور نفسیاتی ضرورتوں پر بلا روک ٹوک عمل کرتے ہیں تو طاقت اور اثر و رسوخ کی بھوک میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے ماحول میں عدل، مساوات اور اخلاقی اقدار ختم ہو جاتی ہیں اور ظلم، استحصال اور ناانصافی عام ہو جاتی ہیں۔ کمزور طبقات اپنے حقوق سے محروم ہو کر انتقام یا ردعمل کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جبکہ طاقتور طبقہ اپنی بالادستی قائم رکھنے کے لیے سختی اور جبر کا سہارا لیتا ہے۔ علاوہ ازیں شراب نوشی، جوئے اور جنسی بے راہ روی جیسی برائیاں انسان کے اندر برداشت، صبر اور تحمل کی صلاحیت کو ختم کر دیتی ہیں اور اسے تشدد اور شدت پسندی کی طرف

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الإمارۃ، حدیث:۱۸۴۸

[2] سورۃ التکویر:۸

دھکیلتی ہیں۔ جب اس معاشرتی بگاڑ کے ساتھ قبائلی تعصب اور غیر معقول حمیت بھی شامل ہو جائے تو اختلافات دشمنی اور خونریزی میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یوں سماجی و اخلاقی زوال معاشرے کے اعتدال کی راہیں مسدود کر دیتا ہے اور انتہا پسندی اور غلو کی دلدل کو جنم دیتا ہے۔

اسی طرح فکری جمود اور قبائلی تعصب نے نہ صرف معاشرتی انصاف کو نقصان پہنچایا بلکہ انسانی اقدار کو بھی پامال کر دیا۔ اسلام نے ان دونوں رویوں کا رد کر کے تحقیق، اجتہاد اور عدل پر مبنی نظامِ حیات پیش کیا، جس نے انسانیت کو جاہلی بندشوں سے آزاد کر کے اعتدال و توازن کی راہ دکھائی۔ یہ وہ بنیادی کیفیت ہے جہاں تنقید برداشت نہیں کی جاتی اور ہر عقیدہ، روایت یا رائے کو بغیر غور و فکر کے مطلق سچ سمجھ لیا جاتا ہے۔ جاہلیت کا یہ دور فکری جمود (اندھی تقلید)، قبائلی تعصب اور سماجی و اخلاقی تباہی کی عملی تصویر پیش کرتا ہے۔ قرآن اور سنت نے انہی برائیوں پر سخت تنقید کی اور اسلام نے تحقیق، اجتہاد اور عدل پر مبنی اجتماعی اصول فراہم کر کے ان کے خاتمے کی راہ دکھائی۔

اگر ہم غور کریں تو یہ وہ بنیادیں ہیں جن سے انتہا پسندی اور غلو جنم لیتے ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر اخوت، مساوات، علم اور دلیل کو فروغ دیا تاکہ فکری جمود، قبائلی تعصب اور سماجی برائیوں کی بیماریوں کا علاج ممکن ہو اور معاشرے میں اعتدال، توازن اور اخلاقی سالمیت قائم رہے۔

امتِ مسلمہ میں انتہا پسندی

جیسا کہ سابقہ آسمانی مذاہب میں بعض افراد یا گروہوں نے انتہا پسندی اور غلو کا شکار ہو کر دین کے اصل پیغام کو مسخ کر دیا، اسی طرح امتِ مسلمہ بھی مختلف ادوار میں مختلف وجوہات کی بنا پر شدت پسندی کا شکار رہی ہے۔ تاریخی طور پر دیکھا جائے تو اسلام میں انتہا پسندی کی پہلی نمایاں مثال خوارج کے ظہور کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنے زمانے میں پیشین گوئی فرمائی تھی کہ امت میں ایسے گروہ ابھر کر سامنے آئیں گے جو شدت پسندی اور سخت نظریات اختیار کریں گے۔ یہ گروہ قرآن کی تلاوت ضرور کریں گے اور ظاہری طور پر دین پر عمل کرنے کا دعویٰ کریں گے، لیکن وہ اس کے اصل مفاہیم کو نہ سمجھیں گے اور دین کے اعتدال اور حسنِ تفسیر سے دور ہو جائیں گے۔

ان کا یہ رویہ امت کے لیے ایک چیلنج اور انتباہ کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ جب افراد یا گروہ دین کے بنیادی اصولوں کو سخت اور محدود تعبیرات تک محدود کر لیتے ہیں، تو وہ اپنے نظریات کو مطلق حق سمجھنے لگتے ہیں اور اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کرتے۔ یہی شدت پسندانہ رویہ فکری اور عملی سطح پر انتہا پسندی کا باعث بنتا ہے اور معاشرتی انتشار، تعصب اور فرقہ واریت کو جنم دیتا ہے۔ اس طرح خوارج کا ظہور ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ دین کی اصل روح، اعتدال اور وسعتِ نظر کو ہمیشہ محفوظ رکھنا ضروری ہے تاکہ کسی بھی زمانے میں انتہا پسندی کے اثرات سے امت کو

محفوظ رکھا جا سکے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالی عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے:

((يَخْرُجُ فِيكُمْ قَوْمٌ تَحْقِرُونَ صَلاَتَكُمْ مَعَ صَلاَتِهِمْ وَصِيَامَكُمْ مَعَ صِيَامِهِمْ وَأَعْمَالَكُمْ مَعَ أَعْمَالِهِمْ يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ وَلاَ يُجَاوِزُ حَنَاجِرَهُمْ يَمْرُقُونَ مِنَ الدِّينِ مُرُوقَ السَّهْمِ مِنَ الرَّمِيَّةِ تَنْظُرُ فِي النَّصْلِ فَلاَ تَرَى شَيْئًا وَتَنْظُرُ فِي الْقِدْحِ فَلاَ تَرَى شَيْئًا وَتَنْظُرُ فِي الرِّيشِ فَلاَ تَرَى شَيْئًا وَتَتَمَارَى فِي الْفُوقِ))[1]-

تم میں ایک ایسی قوم نکلے گی کہ تم اپنی نماز کو ان کی نماز کے مقابلے میں حقیر سمجھو گے، اور اپنے روزوں کو ان کے روزوں کے سامنے کم جانو گے، اور اپنے اعمال کو ان کے اعمال کے مقابلے میں ناقص پاؤ گے۔ وہ قرآن پڑھیں گے لیکن ان کا قرآن ان کے حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے پار نکل جاتا ہے۔ تم تیر کے نوک (نصل) کو دیکھو گے تو اس پر کوئی نشان نہیں پاؤ گے، پھر تیر کے درمیانی حصے (قدح) کو دیکھو گے تو وہاں بھی کچھ نظر نہیں آئے گا، پھر اس کے پر (ریش) کو دیکھو گے تو وہاں بھی کوئی اثر نہیں ملے گا، حالانکہ تمہیں یقین بھی نہیں ہو گا کہ تیر نے شکار کو چُھو کا ہے۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ خوارج کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ بظاہر قرآن کی تلاوت اور اس پر عمل کے بڑے خواہشمند تھے، مگر ان کی تفسیر اور فہم انتہائی ناقص تھا۔

یہ حدیث خوارج کے بارے میں ہے۔ محدثین و ائمہ حدیث نے صراحت کے ساتھ اس حدیث میں مذکور گروہ کو خوارج قرار دیا ہے۔

امام نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"هذا الحديث وما أشبهه صريح في ذم الخوارج، وأن صلاتهم وصيامهم وتلاوتهم لا تنفعهم مع كون اعتقادهم فاسدا "[2]-

یہ حدیث اور اس جیسی دوسری احادیث صاف دلیل ہیں کہ اس سے مراد خوارج ہیں، اور ان کی نماز، روزہ اور تلاوت اس وقت تک نفع نہیں دے گی جب تک عقیدہ درست نہ ہو۔

([1]) صحیح بخاری، حدیث نمبر ۵۰۵۸

[2]شرح صحیح مسلم، ج ۷ ص ۱۶۷

ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"المراد بهم الخوارج الذين خرجوا على علي رضي الله عنه، فوصفهم النبي ﷺ بكثرة عبادتهم وقلة فقههم، وأنهم يمرقون من الدين"[1]۔

اس حدیث میں مراد خوارج ہی ہیں جو حضرت علیؓ کے خلاف نکلے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی کثرتِ عبادت اور قلتِ فہم کا ذکر کیا اور بتایا کہ وہ دین سے نکل جائیں گے۔

حافظ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ نے اہل علم کا اتفاق نقل کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے مراد خوارج ہیں۔

"اتفق أهل العلم على أن المراد بقوله صلی اللہ علیہ وسلم «يمرقون من الدين» هم الخوارج الحرورية"[2]۔

امام ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان "وہ دین سے نکل جائیں گے" سے مراد خوارج حروریہ ہیں۔

علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ «يخرج فيكم قوم» کی شرح میں لکھتے ہیں:

"يعني الخوارج، سموا بذلك لخروجهم على الإمام الحق"[3]۔

یعنی مراد خوارج ہیں، انہیں خوارج اس لیے کہا گیا کہ وہ امامِ برحق کے خلاف خروج کریں گے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قال الملا علي القاري: أراد بهم الخوارج الذين اعتقدوا أنهم على الحق، وهم في الباطل، خرجوا عن طاعة الإمام وعن جماعة المسلمين"[4]۔

اس حدیث میں مراد وہ خوارج ہیں جو یہ گمان کرتے تھے کہ وہ حق پر ہیں، حالانکہ وہ باطل پر تھے۔ انہوں نے امام اور مسلمانوں کی جماعت سے خروج کیا۔

ائمہ حدیث نے اس حدیث میں جس گروہ کی نشاندہی کی ہے وہ خوارج ہیں:

خوارج کا ظہور

---

[1] ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، ۱۲ص، ۲۸۲

[2] ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، التمہید، لما فی الموطا من المعانی، تحقیق: مصطفی بن أحمد العلوي، محمد عبد الکبیر البکري، وزارۃ الأوقاف المغربیۃ، ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء، ج۲۳ص ۳۱۶

[3] علامہ علی القاری، عمدۃ القاری علی شرح صحیح البخاری، دار الکتب العلمیۃ، ۱۴۲۱ھ-۲۰۰۱م، ج۱۴ص ۱۸۵

[4] عینی، بدر الدین ابو محمد محمود بن أحمد، مرقاۃ المفاتیح، ج۹ص ۳۸۰۷

خوارج ایک شدت پسند مذہبی گروہ تھا جو حضرت علی بن ابی طالبؓ کے خلاف صفّین کی جنگ (۳۷ھ) کے بعد وجود میں آیا۔ یہ لوگ تحکیم (ثالثی) کے خلاف ہو گئے اور "لَا حُکْمَ اِلَّا لِلّٰہِ" (فیصلہ صرف اللہ کا ہونا چاہیے) کے نعرے کے ساتھ خروج کیا۔ بعد ازاں انہوں نے حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، اور حتیٰ کہ دیگر صحابہ کو بھی کافر قرار دینا شروع کر دیا۔ ان کی نمایاں صفات میں دینی معاملات میں غلو، شدت، اور دوسروں کی تکفیر شامل تھی۔

ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"نشأ الخوارج بعد معركة صفّين (٣٧هـ) حينما قبل عليّ رضي الله عنه التحكيم، فرفعوا شعارهم المشهور: «لا حكم إلا لله»، وخرجوا على الإمام الحق"[1]۔

خوارج کا آغاز جنگ صفین (۳۷ھ) کے بعد ہوا جب حضرت علیؓ نے تحکیم قبول کی۔ اس پر ایک گروہ نے علیؓ کی مخالفت کی اور نعرہ لگایا: "حکم تو صرف اللہ کا ہے"۔ یہیں سے ان کی پہچان بطور "خارجی" ہوئی۔

خوارج کے نظریات

خوارج کے بارے میں تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عبادت، پرہیزگاری اور زہد میں انتہا پسندانہ رویے کے حامل تھے۔ ان کی شب بیداری، روزہ داری اور دیگر دینی فرائض میں شدت اور خلوص دونوں موجود تھے اور ظاہر کی سطح پر ان کے اعمال پر کسی کو اعتراض نہیں تھا۔ تاہم ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ دین کی حقیقی روح اور اس کے گہرے مفاہیم سے بالکل بے بہرہ تھے۔ ان کے نزدیک ہر چیز کو صرف ظاہری شدت اور سختی کی بنیاد پر پرکھا جاتا تھا، اور یہی رویہ ان کے فکری تعصبات کی بنیاد تھا۔

اسی وجہ سے خوارج چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو بھی ایمان سے خروج یا کفر کے مترادف سمجھنے لگے، اور اسی بنا پر مسلمانوں کے قتل کو جائز تصور کرتے تھے۔ ان کے عقائد کے مطابق کبیرہ گناہ کرنے والا ہر حال میں ایمان سے خارج ہو جاتا ہے، اور معمولی لغزش یا خطا بھی دوسروں کو کافر قرار دینے کے لیے کافی تھی۔ یہ نظریہ اسلامی اصولوں کے خلاف تھا اور امت کے درمیان شدید تفرقہ اور خونریزی کو فروغ دیتا تھا۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ خوارج کے پاس عبادت، زہد اور ظاہری پرہیزگاری تو موجود تھی، لیکن علمِ دین، قرآن کے حقیقی مفاہیم اور معانی کو سمجھنے کی صلاحیت ان میں نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ قرآن کی تلاوت کرتے تھے ضرور تھے، لیکن اس کے پیچھے چھپے گہرے مطالب اور اعتدال پسندانہ احکام تک پہنچنے

[1] ابن حجر، فتح الباری، ج ۱۲ ص ۲۸۲

سے قاصر تھے، اور یہی کمزوری ان کے رویے کو شدت پسندی اور انتہاپسندی کی طرف لے گئی۔

(ا) تکفیر بالذنوب کے قائلین

خوارج کا سب سے بنیادی نظریہ یہ تھا کہ جو مسلمان کبیرہ گناہ (مثلاً: زنا، شراب نوشی، جھوٹ یا ناحق خون بہانا)، کرے وہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور کافر بن جاتا ہے۔ خوارج قرآن کی بعض آیات کو ظاہری مفہوم میں لیتے تھے، جیسے: ﴿وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾-[1]

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں۔

اس طرح کی آیات کو وہ عام مسلمانوں پر منطبق کر کے کہہ دیتے تھے کہ گناہ یا ظلم کا ارتکاب کفر ہے۔

ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"كانوا يُكفِّرون مرتكب الكبيرة ويُخرجونه من الإسلام"[2]-

وہ کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر قرار دیتے تھے اور اسے اسلام سے خارج سمجھتے تھے۔

(ب) امامت کے لیے قریشی ہونا ضروری نہیں

اسلامی تاریخ میں یہ اصول موجود تھا کہ امامتِ کبریٰ (خلافت) قریش میں ہو گی، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (الأئمة من قريش)[3]-امام قریش میں سے ہوں گے۔

اسی بنیاد پر اہلِ سنت والجماعت کے نزدیک خلافت کے لیے قریشی ہونا شرط ہے۔ خوارج نے اس اصول کو تسلیم نہیں کیا۔ ان کے نزدیک امامت صرف اہلیت، تقویٰ اور دینداری کی بنیاد پر تھی، قبیلہ یا نسب کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ وہ کہتے تھے: اگر کوئی غلام یا غیر قریشی بھی دین میں متقی اور نیک ہے تو وہ امام بن سکتا ہے۔

خوارج قرآن کی اس آیت سے دلیل لیتے تھے: ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾-[4]

بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

اس آیت کو وہ امامت پر منطبق کرتے اور کہتے کہ تقویٰ اصل معیار ہے، قریشی ہونا نہیں۔

([1]) سورۃ المائدۃ:۴۴

([2]) ابن عبد البر، التمہید ج۲۳ص۳۱۶

([3]) صحیح بخاری، حدیث:۷۱۳۹؛ صحیح مسلم، حدیث:۱۸۲۰

([4]) سورۃ الحجرات:۱۳

علامہ العینی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"أجازوا إمامة غير القرشي، واعتبروا شرط التقوى فقط"[1]۔

انہوں نے (خوارج نے) غیر قریشی کی امامت کو جائز قرار دیا اور صرف تقویٰ کو شرط سمجھا۔

(ج) **حاکم کے خلاف بغاوت کے جواز کے قائلین**

قتال حاکم اور اس کے خلاف بغاوت کو فرض سمجھتے تھے۔

ملا علی القاری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"رأوا الخروج على الأئمة بالسيف إذا خالفوا معتقدهم"[2]۔

انہوں نے (خوارج نے) یہ رائے اختیار کی کہ اگر حکمران ان کے عقیدے کے خلاف جائیں تو اُن کے خلاف تلوار کے ساتھ خروج کیا جائے۔

اہلِ سنت کا موقف

خوارج کے بارے میں اہلِ سنت کا موقف واضح اور یکسو ہے کہ وہ گمراہ اور فتنہ انگیز گروہ تھے۔ ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ شریعت اور دین کے اصل فہم سے محروم ہو گئے اور اپنی شدت پسندی اور سخت رویّوں کے ذریعے مسلمانوں کے درمیان فتنہ پیدا کرنے لگے۔ اسی وجہ سے اہلِ سنت نے ہمیشہ ان کے نظریات کو مسترد کیا اور امت کو ان کے فتنہ وفساد سے خبردار کیا۔

اہلِ سنت کا اجماع ہے کہ خوارج گمراہ اور بدعتی ہیں، کیونکہ انہوں نے نہ صرف معمولی خطاؤں بلکہ بڑے گناہوں پر بھی مسلمانوں کو کافر قرار دیا اور امت وامام کے خلاف خروج کیا۔ اگرچہ وہ بڑے گناہوں میں مبتلا تھے اور ان کے اعمال شدید تنقید کے مستحق تھے، لیکن اہلِ سنت کے نزدیک یہ لوگ مکمل طور پر دین سے خارج نہیں ہوئے تھے، اس لیے ان پر کافر کا حکم نہیں لگایا گیا۔ بلکہ انہیں گمراہ اور اہلِ بدعت قرار دیا گیا تاکہ امت یہ سمجھے کہ ان کے رویے دین کے خلاف ہیں اور ان سے محتاط رہنا ضروری ہے۔ اس فیصلے نے امتِ مسلمہ کے لیے ایک واضح اصول قائم کیا کہ شدت پسندی اور فتنہ انگیزی دین کے خارج ہونے کے مترادف نہیں، مگر ان کے نظریات اور اعمال پر انتباہ لازمی ہے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

---

[1] العيني، عمدة القاري، ۱۴/ص ۱۸۵

[2] الملا علي القاري، مرقاة المفاتيح، ۹/ص ۳۸۰۷

"أجمع أهل السنة على ذمِّ الخوارج، واعتبارهم من أهل البدع، لِمَا أحدثوه من تكفير المسلمين والخروج على جماعة المسلمين"[1]۔

اہلِ سنت کا اس پر اجماع ہے کہ خوارج کی مذمت کی جائے اور انہیں اہلِ بدعت شمار کیا جائے، کیونکہ انہوں نے مسلمانوں کی تکفیر اور مسلمانوں کی جماعت پر خروج (بغاوت) کی بدعت ایجاد کی۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"الخوارج قوم سوء، ولا نكفرهم ما داموا يقاتلوننا على التأويل"[2]۔

خوارج بدکار لوگ ہیں، لیکن ہم ان کی تکفیر نہیں کرتے جب تک وہ (باطل) تاویل کی بنیاد پر ہم سے قتال کرتے ہیں۔

یہ ایک نہایت اہم اور قابلِ غور حقیقت ہے کہ صرف عبادت، پرہیز گاری اور زہد موجود ہونے سے انسان یا گروہ دین کی اصل روح کو سمجھنے اور اعتدال کے راستے پر قائم رہنے کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ اگر علم و فہم، تحقیق اور صحیح بصیرت موجود نہ ہو تو حتیٰ کہ سب سے زیادہ پرہیز گار افراد بھی غلو اور شدت پسندی کی طرف مائل ہو سکتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی بارہا تصدیق کرتی ہے کہ ظاہری تقویٰ اور زہد رکھنے والے گروہ جب دین کی حقیقی تعلیمات اور اصولِ توحید سے غافل ہوئے تو وہ اپنی شدت پسندی کے ذریعے امت میں فتنہ اور انتشار پیدا کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے علم، اجتہاد، تدبر اور تحقیق کو دین کی بنیاد بنایا تاکہ انسان صرف ظاہری عبادات تک محدود نہ رہے اور ہر معاملے میں اعتدال، عدل اور میانہ روی اختیار کرے۔

اسی تناظر میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی فرد یا جماعت عبادت اور تقویٰ کے ساتھ ساتھ دین کے عمیق فہم اور درست بصیرت سے محروم ہو تو وہ آسانی سے انتہا پسندی اور غلو کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ ظاہری نیکی اور زہد کے باوجود علم و بصیرت کی کمی فکری جمود، تعصب اور شدت پسندی کو فروغ دیتی ہے، جس کا نتیجہ امتِ مسلمہ میں انتشار، اختلاف اور فتنہ کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لیے امت کی فلاح اور اعتدال کے لیے ضروری ہے کہ عبادت، نیکی اور پرہیز گاری علم، تدبر اور تحقیق کے ساتھ ہم آہنگ ہوں تاکہ مذہبی اصول اور اخلاقی اقدار اعتدال اور توازن کے ساتھ نافذ رہیں۔

عہدِ خلفائے راشدین میں خوارج کی سرگرمیاں

---

[1] النووی، شرح صحیح مسلم ج۷، ص ۱۶۷

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۳، ص ۲۷۹

حضرت علی بن ابی طالبؓ کے دورِ خلافت میں (واقعہ تحکیم کے بعد) فتنہ خوارج کا ظہور ہوا۔ صفّین کی جنگ (۳۷ھ) کے بعد تحکیم کے مسئلے پر ان لوگوں نے بغاوت کی اور "لا حکم الا اللہ "کا نعرہ لگا کر علیحدہ گروہ بن گئے۔

ابن الأثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وكان أولُ خروجِهم أنّهم أنكروا التحكيم يوم صفّين، وقالوا: لا حكم إلا لله، ففارَقوا علياً، واجتمعوا بحروراء، فكفَّروا علياً ومعاويةَ ومن معهما"[1]۔

ان کے خروج کی ابتدا اس وقت ہوئی جب انہوں نے صفین کے دن تحکیم کا انکار کیا اور کہا: 'حکم تو صرف اللہ کا ہے۔' پس وہ علیؓ سے الگ ہو گئے، حروراء میں جمع ہوئے اور علیؓ، معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کو کافر قرار دیا۔

خوارج کے فتنہ اور خونریزی کے باعث حضرت علیؓ نے ان کے خلاف لشکر کشی کی اور نہروان[2]۔ کے مقام پر ان کا سامنا ہوا۔ حضرت علیؓ نے پہلے انہیں سمجھانے کی کوشش کی مگر جب وہ نہ مانے تو جنگ چھڑ گئی۔ اس معرکے میں خوارج کی اکثریت ہلاک ہو گئی اور چند افراد ہی جان بچا سکے۔

امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وقاتلهم عليٌّ بالنهروان، فقتل عامّتَهم، ولم ينجُ منهم إلا القليل"[3]۔

حضرت علیؓ نے نہروان میں ان سے قتال کیا، ان کی اکثریت قتل کر دی گئی اور چند افراد کے سوا کوئی نہ بچا۔

اس طرح جنگِ نہروان خوارج کی تاریخ میں ایک اہم موڑ تھا جس نے ان کے بڑے حصے کو ختم کر دیا، مگر ان کا فتنہ بعد کے ادوار میں مختلف شکلوں میں باقی رہا۔ اس دور میں خوارج کی شدت پسندی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے ان کی شدت پسندی کے بارے میں لکھا ہے:

---

[1] ابن الأثیر، الکامل في التاریخ، ج۳، ص ۲۶۴، دار الکتب العلمیة، بیروت، ط۱، ۱۹۸۷م

[2] جنگِ نہروان سن ۳۸ھ میں حضرت علیؓ اور خوارج کے درمیان پیش آئی۔ واقعۂ صفین اور تحکیم کے بعد خوارج نے یہ نعرہ بلند کیا کہ "حکم صرف اللہ کا ہے" اور حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کو کافر قرار دے کر مسلمانوں سے الگ ہو گئے۔ وہ حروراء میں جمع ہوئے اور بعد میں مسلمانوں پر ظلم و زیادتی شروع کر دی، یہاں تک کہ حضرت عبد اللہ بن خبابؓ کو شہید کیا اور ان کی حاملہ زوجہ کا پیٹ چاک کر دیا۔ (الکامل فی التاریخ، ج۳، ص۲۶۸، ۱۹۸۷م)

[3] الطبري، تاریخ الأمم والملوک، دار التراث، بیروت، ۱۳۸۷ھ، ج۵، ص۶۷

"كانوا أهلَ عبادةٍ وقراءةٍ للقرآن، غير أنهم يتأوّلونه على غير وجهه، فاستحلّوا دماء المسلمين"[1]۔

وہ لوگ عبادت گزار اور قرآن پڑھنے والے تھے، لیکن وہ اس کی تفسیر غلط طریقے پر کرتے، اسی بنیاد پر انہوں نے مسلمانوں کے خون کو حلال سمجھ لیا۔

خوارج نے حضرت علیؓ پر حملے کی سازش بھی کی، ان کی شدت پسندی یہاں تک پہنچی کہ حضرت علیؓ کی شہادت کا سبب بھی وہی بنے۔ ابن الأثیر نے لکھا ہے:

"تواطأ ثلاثةٌ من الخوارج على قتل عليٍّ ومعاويةَ وعمرو بن العاص، فقتل ابنُ ملجم علياً وهو خارجٌ إلى الصلاة"[2]۔

خوارج کے تین افراد نے آپس میں یہ سازش کی کہ علیؓ، معاویہؓ اور عمرو بن العاصؓ کو قتل کیا جائے۔ ابنِ ملجم نے حضرت علیؓ کو اُس وقت شہید کیا جب آپ نماز کے لیے باہر نکلے۔

خوارج ان کے انتہا پسندانہ نظریات نے اسلامی معاشرے کو علمی، فکری اور عملی سطح پر تقسیم کیا، اور بعد میں کئی انتہا پسند گروہوں کے لیے نظریاتی بنیاد فراہم کی۔

اموی وعباسی دور میں خوارج کی سرگرمیاں

حضرت علیؓ کے دور کے بعد خوارج کا فتنہ ختم نہ ہوا بلکہ اموی خلافت کے دوران اس میں مزید شدت آ گئی۔ یہ گروہ مسلسل حکومت کے خلاف بغاوت اور شورش میں مصروف رہا، اور مختلف علاقوں میں اپنی طاقت اور نظریات کو مسلط کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ خاص طور پر حضرت معاویہؓ کے دور میں خوارج نے متعدد شورشیں برپا کیں، جنہوں نے معاشرتی عدم استحکام اور سیاسی انتشار کو بڑھا دیا۔ اموی دور میں سیاسی انتہا پسندی کی ایک نہایت نمایاں مثال واقعہ کربلا (۶۱ھ) ہے، جہاں اقتدار کی ہوس اور سیاسی تسلط نے اہلِ بیتؓ کے قتلِ عام تک کا سبب بنایا۔ بعد میں عبد الملک بن مروان اور حجاج بن یوسف کے دور میں خوارج کی بغاوتیں اور بھی شدید ہو گئیں۔ اس گروہ کا سب سے مشہور لیڈر نافع بن الأزرق تھا، جس کے پیروکار "ازارقہ" کہلائے۔ یہ افراد نہ صرف بڑے گناہ کرنے والوں بلکہ جو لوگ ان کے سخت نظریات کو نہ مانیں، انہیں بھی کافر اور واجب القتل سمجھتے تھے، جس سے امت میں انتشار اور شدت پسندی کی مثال قائم ہو گئی۔

---

[1] ابن کثیر، البدایۃ والنھایۃ، ج۷، ص۲۸۱

[2] ابن الأثیر، الکامل فی التاریخ، ج۳، ص۳۲۶

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وكانت الخوارج في أيام بني أمية يظهرون في كل وقت، ويخرجون على الولاة والأئمة، يكفرون بالذنوب، ويستحلون دماء المسلمين الصلاة"[1]۔

بنو امیہ کے دور میں خوارج بار بار ظاہر ہوتے اور حکمرانوں پر خروج کرتے، گناہوں کی وجہ سے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے اور ان کا خون حلال سمجھتے۔

اسی طرح عباسی دور میں بھی خوارج کی بغاوتیں جاری رہیں، خاص طور پر عراق اور بحرین کے علاقوں میں۔ عباسی خلفاء ان کے خلاف مسلسل لڑتے رہے۔عباسی دور میں فکری انتہا پسندی کا ظہور معتزلہ تحریک کی شکل میں ہوا۔ خلیفہ مامون الرشید نے "خلق القرآن" کے عقیدے کو سرکاری مذہب بنانے کی کوشش کی۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے خلاف آواز بلند کی، جس پر انہیں کوڑے مارے گئے اور قید میں رکھا گیا۔ یہ فکری انتہا پسندی اختلافِ رائے کو طاقت سے دبانے کی کوشش تھی، جس نے علمی آزادی اور اجتہاد کی روح کو متاثر کیا۔ عباسی دور میں خوارج کے مختلف گروہ بن گئے جیسے **اباضیہ، صفریہ**، ازارقہ وغیرہ۔ اگرچہ بعض گروہ نسبتاً نرم موقف رکھتے تھے، مگر اکثر خوارج بدستور شدت پسندی اور تکفیر کے نظریے پر قائم رہے۔[2]۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"ولم يزل أمر الخوارج مختلفاً في دولة بني العباس، يخرجون من كل ناحية، ويقطعون الطريق، ويكفرون المسلمين بالذنوب"[3]۔

بنی عباس کے دور میں بھی خوارج کا معاملہ مختلف علاقوں میں چلتا رہا، وہ بار بار خروج کرتے، راستے کاٹتے اور مسلمانوں کو گناہوں کی وجہ سے کافر قرار دیتے۔

اموی دور میں خوارج زیادہ تر مسلح بغاوتوں اور خونریز لڑائیوں میں سرگرم رہے۔ ان کا مقصد صرف حکومتی اقتدار کے خلاف شورش نہیں تھا بلکہ اپنے سخت گیر نظریات کو نافذ کرنا بھی تھا۔ عباسی دور میں ان کی سرگرمیاں صرف سیاسی بغاوت تک محدود نہ رہیں بلکہ فکری سطح پر بھی وہ نمایاں ہو گئے اور تکفیر و خروج کے اپنے نظریات کو

---

[1] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۷ھ، ج۹، ص۲۷۸

[2] خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج۵، ص۴۵، الذھبی، سیر أعلام، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، ۱۹۹۷ء، ج۱۱، ص۲۹۰

[3] الطبری، تاریخ الطبری، دار التراث، بیروت، ۱۳۸۷ھ، ج۷، ص۱۵۷

امت میں عام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ دونوں ادوار میں ان کی ایک خاص خصوصیت یہ رہی کہ وہ گناہگار مسلمانوں کو کافر قرار دے کر قتل کو جائز سمجھتے اور ریاستی نظام کے خلاف مسلسل بغاوت کرتے رہے۔

خوارج کی شدت پسندی نے اسلامی تاریخ کے ہر دور میں امت کو گہرے زخم پہنچائے۔ عہدِ صحابہؓ میں وہ سب سے پہلے حضرت علیؓ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، صحابہ کرام کو کافر قرار دیا اور جنگِ نہروان جیسی خوفناک لڑائی کی جس میں بے شمار مسلمان شہید ہوئے۔ اس دور میں ان کے سخت گیر نظریات اور تکفیر بالذنوب نے امت میں شدید انتشار اور اختلاف کو جنم دیا۔ بنو امیہ کے دور میں بھی خوارج بار بار شورشیں برپا کرتے، حکمرانوں کے خلاف تلوار اُٹھاتے اور مسلمانوں کا خون بہاتے رہے، جس سے ریاستی استحکام کمزور ہوا۔ شدت پسند گروہ جیسے ازارقہ اور صفریہ عام مسلمانوں کو بھی کافر قرار دے کر قتل کرتے اور معاشرتی امن وسکون کو برباد کرتے۔ عباسی دور میں بھی خوارج اپنی سرکشی سے باز نہ آئے؛ انہوں نے بغاوت کے ساتھ ساتھ فکری سطح پر بھی تکفیر اور شدت پسندی کو عام کیا، جس کے نتیجے میں امت کا اتحاد ٹوٹا اور داخلی طور پر مسلمانوں کی طاقت کمزور ہوئی۔ یوں ہر دور میں خوارج کی شدت پسندی نے نہ صرف سیاسی و عسکری اعتبار سے نقصان پہنچایا بلکہ فکری و اعتقادی سطح پر بھی اسلام کی اصل روح اور امت کے اتحاد کو بری طرح متاثر کیا۔

قرونِ وسطیٰ میں انتہا پسند تحریکیں

دسویں سے پندرویں صدی کے دوران کئی انتہا پسند گروہ سامنے آئے ۔ اسی دور میں باطنیہ[1] اور اسماعیلیہ[2] تحریک بھی سامنے آئی، جو ظاہری شریعت کو ترک کر کے خفیہ باطنی تاویلات پر زور دیتی اور عقائد کو بگاڑنے کے ساتھ ساتھ محرمات کو حلال قرار دیتی تھی۔[3]- ان کے بعد قرامطہ نے اپنی شدت پسندی کے ذریعے اسلامی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ انہوں نے موسمِ حج میں مکہ پر حملہ کر کے حاجیوں کو قتل کیا اور حجرِ اسود کو کعبہ سے نکال کر ہجر (بحرین) لے گئے ۔[4]- حشاشین[5] (Assassins) حسن بن صباح کی قیادت میں یہ فرقہ سیاسی قتل و دہشت کو

([1]) یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ شرعی نصوص کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اور وہ صرف باطن کو مقصود مانتے ہیں، ظاہر کو نہیں۔ ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۳۵، ص ۱۶۱

([2]) یہ وہ لوگ ہیں جو حضرت جعفر صادق کے بعد ان کے بیٹے اسماعیل کی امامت کے قائل ہوئے، پھر یہ کئی فرقوں میں تقسیم ہوگئے۔ ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۰۵

[3] الذهبي، سير أعلام النبلاء، ج۱۵، ص ۱۳۱

[4] ابن الأثیر، الکامل فی التاریخ، ج۸، ص ۱۱۹

جائز سمجھتا تھا۔ انہوں نے دشمنوں کو منظم طریقے سے قتل کیا تاکہ خوف پھیلے اور ان کی طاقت مستحکم ہو۔ ان گروہوں نے سیاسی نظام کو عدم استحکام کا شکار کیا اور اسلامی وحدت کو نقصان پہنچایا۔[1]

اسلامی تاریخ کے قرونِ وسطیٰ میں کئی ایسی انتہا پسند تحریکیں ظاہر ہوئیں جنھوں نے امتِ مسلمہ کو فکری، سیاسی اور معاشرتی طور پر شدید نقصان پہنچایا۔ ان میں سب سے نمایاں خوارج تھے، جنھوں نے کبیرہ گناہ کے مرتکب کو کافر قرار دے کر مسلمانوں کے خون اور مال کو مباح سمجھا اور ائمہ کے خلاف خروج کو اپنا شعار بنایا۔[2]

اہلِ سنت نے ان تمام تحریکوں کو گمراہی اور بدعت قرار دیا اور واضح کیا کہ یہ امت کے اتحاد اور شریعت کے صحیح فہم کے منافی ہیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"أجمع أهل السنة على ذمِّ الخوارج والباطنية والقرامطة، وعدُّوهم من أهل الأهواء والبدع" ۔[3]

اہل سنت متفقہ طور پر خوارج، باطنیہ اور قرامطہ کی مذمت کرتے ہیں اور انہیں بدعتی سمجھتے ہیں۔

اس طرح قرونِ وسطیٰ کی یہ انتہا پسند تحریکیں نہ صرف سیاسی و عسکری میدانوں میں خونریزی اور بغاوت کا باعث بنیں بلکہ فکری و اعتقادی سطح پر بھی دین کی اصل روح کو مجروح کرتے ہوئے امتِ مسلمہ کے اتحاد اور استحکام کے لیے مستقل خطرہ بن گئیں۔

استعماری دور میں انتہا پسندی

استعماری دور[4] میں جب یورپی طاقتوں نے مسلم ممالک پر قبضہ کیا تو اس کے نتیجے میں مسلمانوں میں ردِ عمل

([5]) ایک تاریخی اصطلاح ہے جو عموماً ایک باطنی اسماعیلی فرقے کے لیے استعمال کی جاتی ہے، جو ۱۱ویں سے ۱۳ویں صدی کے دوران ایران اور شام کے پہاڑی قلعوں میں سرگرم رہا۔ ان کی بنیاد حسن بن صباح (d. 1124) نے رکھی تھی۔ یہ گروہ اپنے خفیہ اور منظم اندازِ کار، سیاسی مقاصد کے لیے خفیہ قتل (Assassination) اور وفاداری کی شدت کی وجہ سے مشہور ہوا۔ ابن الاثیر، علی بن محمد، الکامل فی التاریخ، تحقیق: عمر عبد السلام تدمری، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۷ء، ج۸، ص. ۳۸۴

([1]) ابن اثیر، الکامل، ج۱۰، ص۳۲۰

[2] ابن کثیر، البدایہ والنھایہ، ج۱۰، ص۵۸۴

[3] ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، دار المعرفہ، بیروت، ۱۳۷۹ھ، ج۱۲، ص۲۹۲

[4] استعماری دور سے مراد وہ زمانہ ہے جب یورپی طاقتوں نے مسلم دنیا پر قبضہ کر کے سیاسی، عسکری اور فکری طور پر اسے غلام بنایا۔ یہ

کے طور پر مختلف انتہا پسند تحریکیں سامنے آئیں[1]۔ ان تحریکوں نے آزادی اور مزاحمت کے جذبے کو شدت پسندی کی شکل دے دی۔ بعض گروہوں نے ہر غیر مسلم کو بلا تفریق دشمن سمجھ کر ان کے خلاف اندھی جدوجہد کو فرض قرار دیا۔ محمد عمارة لکھتے ہیں:

"لقد ولّد الاحتلالُ الأجنبي حركاتٍ متطرفة، رأت أن مواجهة الاستعمار لا تكون إلا بالعنف، وكفّرت كل من خالفها من المسلمين"[2]۔

غیر ملکی استعمار نے ایسی انتہا پسند تحریکوں کو جنم دیا جن کا خیال تھا کہ استعمار کا مقابلہ صرف طاقت اور تشدد کے ذریعے ہی کیا جا سکتا ہے، اور انہوں نے اپنے مخالف مسلمانوں کو بھی کافر قرار دیا۔

اسی دور میں بعض اصلاحی علماء نے ان تحریکوں کی شدت پسندی کو رد کیا اور جہاد کو صرف شرعی اصولوں کے دائرے میں رہنے کی تلقین کی۔ رشید رضا رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الجهاد الشرعي إنما يكون تحت راية واضحة وضوابط شرعية، أما الفوضى والعنف بلا قيادة راشدة فهو من عمل الخوارج"[3]۔

شرعی جہاد وہی ہے جو واضح قیادت اور شرعی ضوابط کے تحت ہو، جبکہ قیادتِ راشدہ کے بغیر انتشار اور تشدد خوارج کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔

شرعی جہاد وہی حقیقت ہے جو واضح قیادت، معقول اہداف اور شرعی ضوابط کے تحت انجام پائے؛ بغیر نظام

دور بالخصوص اٹھارہویں صدی کے آخر سے بیسویں صدی کے وسط تک پھیلا رہا۔ اس کا آغاز سلطنتِ عثمانیہ کی کمزوری اور یورپی طاقتوں کی بڑھتی ہوئی قوت کے بعد ہوا۔ برصغیر میں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد برطانوی استعمار مضبوط ہوا جو ۱۹۴۷ء میں ختم ہوا، الجزائر پر فرانس کا قبضہ ۱۸۳۰ء سے ۱۹۶۲ء تک رہا، اور مصر پر انگریزوں کا تسلط ۱۸۸۲ء سے ۱۹۵۲ء تک قائم رہا۔ اسی طرح بیشتر عرب و افریقی خطے بھی یورپی نو آبادیات میں تبدیل ہو گئے۔ محمد عمارة، تیارات الفکر الإسلامي، دار الشروق، القاهرة، ۱۹۸۵ء ص ۲۱۰۔

[1] ۱۸ویں صدی کے اواخر سے ۲۰ویں صدی کے وسط تک، یورپی استعمار نے مسلم دنیا پر غلبہ حاصل کیا۔ اس کا ردعمل مختلف تحریکوں کی صورت میں سامنے آیا: برصغیر: تحریک مجاہدین (سید احمد شہید، شاہ اسماعیلؒ) نے سکھ و انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔ مقصد: اسلامی ریاست کا قیام۔ - شمالی افریقہ: عبد القادر الجزائری نے فرانسیسیوں کے خلاف مزاحمت کی۔ لیبیا: عمر مختار کی قیادت میں اٹلی کے خلاف جدوجہد ہوئی۔ سوڈان: مہدی تحریک نے خلافت کی بحالی کی کوشش کی۔ ان تحریکوں میں کچھ معتدل تھیں مگر کچھ میں شدت پسندی در آئی، خاص طور پر جب سیاسی اور دینی جدوجہد کے ساتھ تکفیر اور تشدد شامل ہوا۔

[2] محمد عمارة، تیارات الفکر الإسلامي، ص ۲۱۴، دار الشروق، القاهرة، ۱۹۸۵ء

[3] رشید رضا، تفسیر المنار، الھیئۃ المصریہ العامہ للکتاب، القاہرة، ۱۹۹۰ء، ج ۵، ص ۲۵۶

قیادت اور شرعی حدود کے اٹھایا گیا ہتھیار انتشار اور خود سر تشدد کی طرف جاتا ہے اور خوارج کے بے ضابطہ اعمال سے مشابہت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے استعماری دور میں بعض شدت پسندانہ تحریکیں اگرچہ ظلم و جبر کے خلاف ردِ عمل کی فطری صورت تھیں، مگر ان کی بے لگام شدت پسندی نے امت کے اندر مزید انتشار، فرقہ بندی اور بے اعتمادی کو جنم دیا۔ اہلِ سنت کے علما نے واضح کیا کہ استبداد یا استعماری تسلط کے خلاف مزاحمت جائز اور لازم ہو سکتی ہے، مگر یہ جدوجہد شریعت کے اصول، اجتہادی ضوابط اور اجتماعی قیادت کے موازین کے مطابق ہونی چاہیے؛ ورنہ وہی عملی پیٹرن دہرایا جائے گا جو خوارج نے اختیار کیا تھا — یعنی تکفیر، خودسرانہ تشدد اور ریاستی نظم کے خلاف مسلسل خروج۔

بیسویں صدی میں انتہا پسند تحریکیں

بیسویں صدی میں امتِ مسلمہ نے ایک نئی لہرِ شدت پسندی کا مشاہدہ کیا، جو بدلتے ہوئے سیاسی، سماجی اور فکری ماحول کا نتیجہ تھی۔ اس دور میں کچھ گروہوں نے خوارجانہ طرزِ فکر کی قدیم مثالیں دوبارہ زندہ کیں اور تکفیر و مسلح کارروائی کو اپنے طریقۂ کار میں شامل کر لیا۔ متعدد نظریاتی دھاروں نے حکمرانی، نظام اور جدید سیاسی تصورات کو دینی اطوار میں پڑھنے کی کوشش کی، اور بعض رہنماؤں کے افکار نے نوجوانوں میں اس حد تک جوش بھڑکا دیا کہ انہوں نے حاکمیتِ وقت کو طاغوت قرار دے کر خروج کو جائز سمجھ لیا۔ اس نتیجے میں نہ صرف مسلح بغاوتیں اور داخلی تشدد بڑھے بلکہ سیاسی استحکام اور اجتماعی رابطوں کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ بیسویں صدی کی یہ تحریکیں اس بات کی مثال ہیں کہ کس طرح سیاسی، معاشی اور فکری محرومی جب رہنمائی اور اعتدال کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوں تو شدت پسندی کو جنم دیتی ہیں — اس لئے اس دور کی تاریخ ہم سب کے لیے عبرت ہے کہ مزاحمت اور اصلاح شرعی پیمانوں، علمی بُنیاد اور اجتماعی قیادت کے بغیر تباہ کن ثابت ہو سکتی ہے۔ یوسف القرضاوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ظهرت في هذا العصر طوائف غالية، أعادت فكر الخوارج في صورة جديدة، فحكموا بالكفر على المجتمعات والحكام، واستباحوا الدماء باسم الدين"[(1)]۔

اس دور میں بعض انتہا پسند گروہ ظاہر ہوئے جنہوں نے خوارج کے نظریے کو نئی شکل میں زندہ کیا۔ انہوں نے معاشروں اور حکمرانوں کو کافر قرار دیا اور دین کے نام پر خونریزی کو جائز سمجھا۔

سید قطب کی فکر سے متاثر تحریکوں نے اسلامی معاشرے کو "جاهلیہ" قرار دیا، جو انتہا پسندی اور تکفیر کے

[(1)] یوسف القرضاوی، الصحوة الإسلامیہ بین الجحود والتطرف، ۱۹۸۲ء، ص ۱۰۱

پھیلاؤ کا سبب بنی، سید قطب بیان کرتے ہیں:۔

"إن المجتمع الجاهلي هو كل مجتمع لا يُحكم فيه بشرع الله، وهكذا يجب على المسلمين أن ينعزلوا عنه ويقيموا مجتمعهم الخاص"[1]۔

جاہلی معاشرہ وہ ہے جس میں اللہ کے شریعت سے حکومت نہ ہو، لہٰذا مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ ایسے معاشرے سے الگ ہوں اور اپنا خاص اسلامی معاشرہ قائم کریں۔

اہلِ سنت کے جمہور علماء نے اس طرزِ فکر کو رد کیا اور واضح کیا کہ یہ خوارج کی پرانی سوچ کا تسلسل ہے۔

ابن باز رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"التكفير بلا ضوابط شرعية أصل من أصول الخوارج، وهو سبب الفتن وسفك الدماء "[2]۔

شرعی ضوابط کے بغیر تکفیر کرنا خوارج کی بنیادی فکر ہے، اور یہی فتنوں اور خونریزی کا اصل سبب ہے۔

بیسویں صدی میں انتہاپسند تحریکوں نے مزید شدت اختیار کی، اور خاص طور پر فاشزم (Fascism)[3]۔ کے عروج نے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا۔ فاشزم دراصل ایک ایسا نظریہ تھا جو جمہوریت اور کمیونزم دونوں کا مخالف تھا اور آمرانہ حکومت اور قوم پرستی پر زور دیتا تھا۔ فاشزم کا سب سے بڑا مظہر نازی ازم (Nazism)[4]۔ تھا، جو جرمنی میں ابھرا اور ایڈولف ہٹلر کی قیادت میں دوسری جنگِ عظیم (۱۹۳۹-۱۹۴۵) کی بنیاد بنا۔ اسی طرح، کمیونزم (Communism)[5]۔ بھی ایک انتہاپسندانہ نظریہ بن کر ابھرا، جو سابقہ سوویت یونین اور مشرقی یورپ

---

[1] سید قطب، معالم في الطريق، دار الشروق، القاهرة، ۱۹۶۴ء، ص ۲۱

[2] ابن باز، مجموع الفتاوی، دار القاسم، الرياض، ۱۹۹۵ء، ج ۷، ص ۱۳۲

[3] Fascism is a political ideology and mass movement that dominated many parts of central, southern, and eastern Europe between 1919 and 1945, characterized by dictatorial power, forcible suppression of opposition, and strong regimentation of society and the economy.(Griffin, Roger. The Nature of Fascism. 1st ed. London: Pinter, 1991, pp. 56–85)

[4] Nazism, also spelled National Socialism, is the totalitarian movement led by Adolf Hitler as head of the Nazi Party in Germany. It emphasized aggressive nationalism, anti-Semitism, and the absolute authority of the Führer)".Encyclopaedia Britannica, “Nazism)

[5] ایک ایسا سیاسی و معاشی نظریہ ہے جو بنیادی طور پر کارل مارکس (Karl Marx) اور فریڈرک اینگلز (Friedrich Engels) کے افکار پر مبنی ہے۔ اس کا مقصد ایک ایسی معاشرت قائم کرنا ہے جس میں طبقاتی فرق، ذاتی ملکیت اور سرمایہ دارانہ استحصال ختم کر کے پیداوار اور وسائل سب کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیے جائیں۔

میں اپنے اثر و رسوخ کو بڑھاتا رہا۔

فاشزم ایک ایسا نظریہ تھا جس نے مطلق العنان حکومت، قوم پرستی، اور جمہوریت مخالف رویوں کو فروغ دیا، جس کے نتیجے میں جرمنی میں نازی ازم نے زور پکڑا اور دنیا کو دوسری جنگ عظیم جیسی تباہ کن صورتحال سے دوچار کیا۔ اسی طرح کمیونزم بھی انتہا پسندی کی ایک شکل تھا، جہاں سخت گیر ریاستی پالیسیوں کے تحت کسی بھی قسم کی مخالفت کو دشمنِ ریاست قرار دیا گیا اور شدید جبر، استبداد اور معاشرتی کنٹرول کے ذریعے اسے دبایا گیا۔ بیسویں صدی کی یہ سیاسی انتہا پسند تحریکیں، اگرچہ مختلف شکلوں میں نمودار ہوئیں، مگر فکری بنیادوں پر وہ خوارج کے قدیم نظریات کا تسلسل ہی تھیں۔ ان تحریکوں نے نہ صرف مسلم معاشروں میں داخلی انتشار اور تقسیم پیدا کی بلکہ امت کے اتحاد اور دین کی حقیقی روح کو بھی بری طرح متاثر کیا۔

یورپ میں انتہا پسندی

انتہا پسندی ایک عالمی رجحان ہے جو کسی بھی خطے میں، کسی بھی وقت پنپ سکتا ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ تقریباً ہر بڑے ملک، کسی نہ کسی دور میں، انتہا پسند نظریات، گروہوں یا تحریکوں کا سامنا کر چکا ہے۔ یہ لہر مختلف نظریاتی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی محرکات کے تحت ابھرتی ہے اور حالات کے مطابق اپنی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یورپ کی مثال سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انتہا پسندی صرف مخصوص مذہب یا ثقافت کا مسئلہ نہیں بلکہ یہ انسانی معاشروں کی فکری، سیاسی اور سماجی کمزوریوں کا ایک منفی عکاس ہے، جو اجتماعی بیداری، عدل اور تعلیم کی کمی کے نتیجے میں پروان چڑھتی ہے۔

رونالڈ ونٹروب (Ronald Wintrobe) یورپ میں انتہا پسندی کی تاریخی جڑوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Europe in particular has a long history of extremism. Perhaps, the first modern example of extremism in power was the "Terror" (the word was invented then) associated with the jacobin ascendancy during the French Revolution(1)"

یورپ میں انتہا پسندی کی ایک طویل تاریخ ہے۔ شاید جدید دنیا میں اقتدار میں انتہا پسندی کی پہلی مثال وہ 'دہشت (Terror)' ہے، جس کا لفظ اسی دور میں ایجاد ہوا اور جو فرانسیسی انقلاب کے

---

(1) Wintrobe, R. (2006). Rational extremism: The political economy of radicalism. Cambridge University Press, p: 12.

دوران جیکوبن حکمرانی سے وابستہ ہے۔

یورپ میں انتہا پسندی کی ابتدا فرانسیسی انقلاب (۱۷۸۹-۱۷۹۹) کے دوران ہوئی، جب جیکوبن حکومت نے اپنے مخالفین کے خلاف سخت ترین کارروائیاں کیں۔ اس وقت انتہا پسندی محض نظریاتی نہیں تھی بلکہ عملی طور پر تشدد اور سیاسی قتل وغارت گری کی شکل میں سامنے آئی۔

رونالڈ ونٹروب مزید لکھتے ہیں:

"More recently, extremist groups in Europe have remained much smaller and have never risen to power but have been important and destructive. Movements included those involving the Red Brigades on the left and Propaganda Due on the right in Italy in the 1970s, the Baader-Meinhot Gang of the 1970s in Germany, and the ant-immigration National Front of Le Pen in France, which continues today[1]"

حال ہی میں، یورپ میں انتہا پسند گروہ نسبتاً چھوٹے رہے ہیں اور کبھی اقتدار میں نہیں آئے، لیکن وہ اہم اور تباہ کن ضرور ثابت ہوئے ہیں۔ ان تحریکوں میں ۱۹۷۰ کی دہائی میں اٹلی میں بائیں بازو کی ریڈ بریگیڈز اور دائیں بازو کی پروپیگنڈا دو(Propaganda Due) ، جرمنی میں ۱۹۷۰ کی دہائی کی بادر-مائن ہوف گینگ، اور فرانس میں مہاجرین مخالف نیشنل فرنٹ (لی پین کی قیادت میں) شامل ہیں، جو آج بھی سرگرم ہے۔

1970 کی دہائی میں یورپ میں متعدد انتہا پسند گروہ سامنے آئے، جیسے) Red Brigades(اٹلی)): ایک بائیں بازو کی انتہا پسند تنظیم جو دہشت گردی اور سیاسی قتل میں ملوث رہی Propaganda Due[2] (اٹلی، ۱۹۷۰ کی دہائی): ایک خفیہ دائیں بازو کی تنظیم جو مختلف سازشوں اور غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث تھی[3]۔

([1])Abid

([2]) Meade, Robert C., Red Brigades: Story of Italian Terrorism, Palgrave Macmillan, 1990 p336

اٹلی کی Red Brigades ایک مارکسی-لینن اسٹ گروہ تھا جو دہشت گردی، اغوا اور سیاسی قتل میں ملوث رہا۔ اس کے مقابل دائیں بازو کی خفیہ تنظیم Propaganda Due حکومت کو اندر سے گرانے کی سازشوں میں شامل تھی۔

Willan, Philip, Puppetmasters: The Political Use of Terrorism in Italy, Constable, London, 1991,p 45)

([3])

Baader-Meinhof Gang (جرمنی)،[1]۔ اور National Front of Le Pen (فرانس)[2]۔ ستر کی دہائی میں یورپ میں کئی انتہا پسند گروہ سامنے آئے جنہوں نے سیاسی اور سماجی محاذوں پر شدید اقدامات کیے۔ اٹلی کی Red Brigades ایک بائیں بازو کی شدت پسند تنظیم تھی جو دہشت گردی اور سیاسی قتل میں ملوث رہی، جبکہ Propaganda Due نامی خفیہ دائیں بازو کی تنظیم نے سازشوں اور غیر قانونی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ جرمنی کی Baader-Meinhof Gang اور فرانس میں National Front of Le Pen، جو ایک قوم پرست اور امیگریشن مخالف گروہ تھا، نے بھی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے نام پر جارحانہ کارروائیاں کیں۔ یہ تمام گروہ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سرگرم تھے اور مختلف ادوار میں حکومتوں اور عوام کے لیے خطرہ بنے۔ آج بھی یورپ میں ایسے گروہ اور تحریکیں موجود ہیں جو سیاسی، سماجی یا مذہبی بنیادوں پر متحرک ہیں؛ بعض امیگریشن مخالف ہیں، بعض مخصوص نسلوں یا مذاہب کے خلاف نفرت انگیزی پھیلاتے ہیں، اور کچھ سوشلزم یا قوم پرستی کے شدت پسند نظریات کے حامل ہیں۔

یہ حوالہ جات واضح کرتے ہیں کہ انتہا پسندی کسی ایک خطے، قوم یا مذہب تک محدود نہیں بلکہ ایک عالمی اور پیچیدہ سماجی و سیاسی مسئلہ ہے، جو مختلف ادوار میں مختلف وجوہات کی بنیاد پر ابھرتا رہا ہے۔ بعض اوقات یہ نظریاتی شدت پسندی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جیسا کہ فاشزم اور کیمونزم، جو بظاہر مکمل طور پر متضاد ہونے کے باوجود اپنے ماننے والوں میں سخت گیر رویے پروان چڑھانے میں یکساں ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ، انتہا پسندی صرف بڑی سیاسی تحریکوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ چھوٹے گروہ اور تنظیمیں بھی اپنے مقاصد کے حصول کے لیے پر تشدد راستے اختیار کرتی ہیں۔

جرمنی میں (RAF) Baader-Meinhof Gang نے سرمایہ داری، امریکی مداخلت اور ریاستی طاقت کے خلاف مسلح جدوجہد کو اپنی پہچان بنایا۔
(Aust, Stefan, The Baader-Meinhof Complex, The Bodley Head, London, 2008,p23)
(1)

اسی طرح فرانس میں مہاجرین مخالف "نیشنل فرنٹ" جیسے گروہ اب بھی یورپی معاشرے میں نسلی تعصب اور قومی بالادستی کو فروغ دے رہے ہیں۔ ان سب گروہوں نے تشدد کو سیاسی ہدف کے حصول کا جائز ذریعہ سمجھا، جو واضح طور پر انتہا پسند سوچ کا مظہر ہے۔

(Davies, Peter, The National Front in France: Ideology, Discourse and Power, Routledge, London/New York,1999,p12)
(2)

اگر تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انتہا پسندی مشرق یا مسلم معاشروں تک محدود نہیں رہی، بلکہ مغربی دنیا، بالخصوص یورپ، بھی اس کے اثرات سے آزاد نہیں رہی۔ فرانسیسی انقلاب کے دوران، ۱۷۸۹ تا ۱۷۹۹، جب جیکوبن حکومت نے اپنے مخالفین کے خلاف شدید کریک ڈاؤن کیا، تو یہ دور جدید یورپ میں ریاستی سطح پر انتہا پسندی کے آغاز کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس وقت "تیرر" (Terror) کی اصطلاح وجود میں آئی، جب نظریاتی بالادستی کے لیے تشدد اور قتل عام کو بطور ہتھیار استعمال کیا گیا۔ یہ صرف ایک سیاسی جدوجہد نہیں تھی بلکہ ایک عملی اظہارِ انتہا پسندی تھا، جس نے بعد میں کئی انتہا پسند تحریکوں کے لیے نظریاتی بنیاد فراہم کی۔

بیسویں صدی میں یورپ میں فاشزم اور کمیونزم نے شدت پسندی کو نئی جہت دی۔ فاشزم، جو مطلق العنان حکومت، جمہوریت دشمنی اور نسلی برتری پر مبنی تھا، ایڈولف ہٹلر کے نازی ازم کی شکل میں خوفناک حد تک کامیاب ہوا اور دوسری جنگ عظیم (۱۹۳۹–۱۹۴۵) جیسے تباہ کن واقعات کا سبب بنا۔ دوسری طرف کمیونزم، جس نے مزدوروں کے حقوق اور سماجی مساوات کا دعویٰ کیا، سوویت یونین اور مشرقی یورپ میں اپنی گرفت مضبوط کرتے ہوئے کسی بھی مخالفت کو ریاست دشمنی تصور کر کے کچلنے کے لیے جبر اور استبداد کا سہارا لیتا رہا۔ دونوں نظاموں میں نظریاتی شدت پسندی، آزادی اظہار کی نفی اور ریاستی تشدد کے عناصر واضح تھے، جو انتہا پسندی کی بدترین شکلیں تھیں۔

آج کا یورپ بظاہر جمہوری، جدید اور ترقی یافتہ ہے، لیکن انتہا پسندی کے رجحانات اب بھی موجود ہیں۔ نسل پرستی، اسلاموفوبیا، امیگریشن مخالف تحریکیں، یا پاپولسٹ قوم پرست پارٹیاں، سب میں ایک مشترکہ عنصر پایا جاتا ہے: مختلف عقائد، ثقافتوں یا نسلوں کو خطرہ سمجھ کر ان کے خلاف منفی ردعمل اختیار کرنا۔ یہ رجحان صرف سیاسی تنظیموں تک محدود نہیں بلکہ سوشل میڈیا، تعلیمی اداروں اور عوامی و سیاسی مباحث میں بھی سرایت کر چکا ہے۔

پاکستانی معاشرے میں مذہبی انتہا پسندی کے مظاہر صرف فکری یا نظریاتی سطح تک محدود نہیں رہے بلکہ ان کے عملی اثرات زندگی کے ہر شعبے میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں طلبہ تنظیموں کے درمیان نظریاتی اختلافات کی بنیاد پر تصادم ایک واضح مظہر ہے، جس نے نہ صرف تعلیمی ماحول کو متاثر کیا بلکہ تشدد کو ایک "اظہارِ رائے" کا ذریعہ بنا دیا۔ اسی طرح عوامی اجتماعات میں شدت پسندانہ بیانیہ اور جذباتی نعروں کے ذریعے مخالف فکر کو کافر قرار دینے کے رجحانات نے معاشرت میں نفرت، تفریق اور تشدد کو بڑھاوا دیا۔ یہ عمل صرف فکری آزادی کو محدود نہیں کرتا بلکہ کئی بار قتل و غارت جیسے سنگین نتائج کا سبب بھی بنتا ہے، جس میں عام شہری بھی متاثر ہوتے ہیں۔

مزید برآں، بعض ریاستی اداروں میں ایسے عناصر کی موجودگی بھی دیکھی گئی ہے جو شدت پسندی کے نظریات سے ہمدردی رکھتے ہیں، جس کے نتیجے میں قانون کی بالادستی اور معاشرتی عدل و مساوات کا تصور متاثر ہوا۔ یہ تمام مظاہر اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مذہبی انتہا پسندی نہ صرف ایک فکری چیلنج ہے بلکہ ایک عملی، سماجی اور

قانونی مسئلہ بھی بن چکی ہے۔ جب کوئی نظریاتی انحراف عملی زندگی میں دخل انداز ہو جائے تو وہ محض علمی مسئلہ نہیں رہتا بلکہ ایک ہمہ گیر سماجی بحران میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں مذہبی انتہا پسندی کا جو چہرہ سامنے آیا، وہ صرف مذہبی جذبات سے متعلق نہیں بلکہ معاشی، سیاسی، تعلیمی اور عدالتی نظام پر بھی اثر انداز ہوا۔

یہ تمام حقائق واضح کرتے ہیں کہ انتہا پسندی ایک عالمی مسئلہ ہے، جو مخصوص خطوں یا عقائد تک محدود نہیں بلکہ وقت، حالات اور نظریاتی تبدیلیوں کے مطابق مختلف شکلیں اختیار کرتی رہی ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک جامع اور بین الاقوامی حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، جو برداشت، رواداری اور مکالمے کو فروغ دے کر انتہا پسندانہ رجحانات کی مؤثر روک تھام کر سکے۔

باب دوم

اعتقادات، عبادات اور معاملات میں انتہا پسندی

فصل اول اعتقادات میں نظری و فکری انحرافات
فصل دوم عبادات میں انتہا پسندی کی صورتیں اور رویّے
فصل سوم فقہی و دینی معاملات میں انتہا پسندی کے رجحانات
فصل چہارم معاشرتی اور معاشی معاملات میں عدم توازن

فصل اول

اعتقادات میں نظری و فکری انحرافات

فصل اول

اعتقادات میں نظری وفکری انحرافات

دین اسلام کا سب سے پہلا بنیادی اور اہم عقیدہ توحید ہے۔ یہ عقیدہ پورے اسلام اور اس کے عقائد کا نقطہ کمال ہے۔ توحید زندگی کی روح ہے جس سے انسانیت کی معراج تک پہنچا جا سکتا ہے۔ توحید سے مراد یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو سب سے اعلیٰ اور ساری کائنات کا خالق ومالک ماننا اور صرف اسی کو عبادت کے لائق سمجھنا یا اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات، صفات اور صفات کے تقاضوں میں یکتا ماننا توحید کہلاتا ہے۔ دین اسلام میں عقیدہ توحید کی درج ذیل اقسام ہیں۔

ذات میں توحید

ذات میں توحید سے مراد اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں واحد اور یکتا ہے وہ اکیلا ہے اور اکیلا ہی رہے گا۔ نہ کوئی اس کا باپ ہے اور نہ کوئی اولاد اور نہ کوئی رشتہ دار یعنی وہ حسب نسب سے بالکل پاک ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ﴾[1]۔ آپ کہہ دیجئے کہ وہ اللہ تعالیٰ ایک (ہی) ہے۔

صفات میں توحید

صفات میں توحید سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنی صفات میں بھی یکتا اور یگانہ ہے یعنی اس جیسی اور اتنی صفات کسی اور ذات میں نہیں ہیں۔ اس کی صفات اس کی ذاتی اور لامحدود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کو اسماء الحسنٰی کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ۹۹ صفاتی نام بیان کیے گے ہیں اور اس کی ان گنت صفات ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿ وَ لَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾[2]۔

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں۔

ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد فرمایا:

((إِنَّ لِلّٰهِ تِسْعَةً وَتِسْعِينَ اسْمًا، مِائَةً إِلَّا وَاحِدًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ))۔[3]

بے شک اللہ کے ننانوے نام ہیں، جو انہیں یاد رکھے گا وہ جنت میں داخل ہو گا۔

---

(1) سورہ الاخلاص:۱

(2) سورہ اخلاص:۳

(3) صحیح البخاری، کتاب الدعوات،، ج۸، ص ۱۷۵، حدیث: ۶۴۱۰، صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، حدیث: ۲۶۷۷

اسلامی تعلیمات میں اعتقاد کے باب میں اعتدال اور توازن کو بنیادی اصول قرار دیا گیا ہے، لیکن جب کوئی گروہ یا فرد اس اعتدال کو چھوڑ کر شدت اور سختی اختیار کرتا ہے تو یہ رویہ "اعتقادات میں انتہا پسندی" کہلاتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اعتقادات میں انتہا پسندی "الغلو في الاعتقاد" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فالغلو في الدين هو مجاوزة ما شرعه الله ورسوله من الاعتقاد والقول والعمل "[1]-

دین میں غلو یہ ہے کہ عقیدہ، قول اور عمل میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز کیا جائے۔

یعنی عقائد میں وہ بات مان لی جائے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کہی، اقوال میں اپنی طرف سے سختیاں یا اضافے کر لیے جائیں، اور اعمال میں ایسی شدت یا بدعت اختیار کر لی جائے جو شریعت کا حصہ نہ ہو۔ یوں دین میں غلو دراصل اعتدال کے راستے سے ہٹ کر افراط و تفریط اختیار کرنے کا نام ہے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے:

"كل بدعة يبتدعها الناس في الدين مردها إلى الغلو أو التفريط" [2]-

لوگ دین میں جو بھی بدعت ایجاد کرتے ہیں وہ یا تو غلو یا تفریط کی وجہ سے ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غلو دین کے بنیادی منہج کے خلاف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس رویے سے خبردار کرتے ہوئے فرمایا:

((إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ))-[3] دین میں غلو سے بچو۔

امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"النهي عن الغلو يشمل جميع أبواب الدين؛ من العقائد والعبادات والمعاملات، لأنه سبب الهلاك "[4]

دین میں غلو سے ممانعت دین کے تمام ابواب کو شامل ہے، چاہے وہ عقائد ہوں، عبادات یا معاملات؛ کیونکہ یہی ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔

---

(1) ابن تیمیہ، اقتضاء الصراط المستقیم، ج۱، ص ۳۲۸

(2) شاطبی، ابراہیم بن موسی الغرناطی، الاعتصام، تحقیق: سلیم بن عید الہلالی، دار ابن عفان، السعودیہ، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۲م ج۱، ص ۱۹۱

(3) سنن ابن ماجہ، حدیث ۳۰۲۹

(4) الشوکانی، نیل الأوطار شرح منتقی الأخبار، وزارۃ الأوقاف السعودیہ، ج۵، ص ۱۳۱

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اعتقادات میں انتہا پسندی نہ صرف انفرادی سطح پر فکری انحراف پیدا کرتی ہے بلکہ اجتماعی سطح پر فتنہ، فرقہ واریت اور تکفیر کا سبب بنتی ہے۔ اسلام کے اصل مزاج کے مطابق ایمان و عقائد میں اعتدال ہی امت کے اتحاد اور معاشرتی امن کا ضامن ہے۔ اسلام نے اس کے برعکس اعتدال (وسطیت) کی تعلیم دی ہے تاکہ ایمان و عقائد میں نہ افراط ہو نہ تفریط۔ اعتقادات میں انتہا پسندی کی مختلف صورتیں قرآن میں واضح کی گئی ہیں:

ا-الوہیت میں غلو

اولوہیت میں غلو کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات یا مقام کے بارے میں حد سے تجاوز کرنا اور اس کے دائرۂ قدرت و عظمت کو محدود یا بڑھا چڑھا کر پیش کرنا۔ بعض لوگ یا گروہ اللہ کی صفات میں ایسے اضافے یا مبالغہ آرائی کرتے ہیں جو نہ قرآن کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہیں اور نہ ہی سنتِ نبوی ﷺ سے۔ اس طرح کا غلو عقیدۂ توحید کو مسخ کر دیتا ہے اور انسان کو غلط نظریات کی طرف لے جاتا ہے، کیونکہ وہ اللہ کی حقیقت کو صحیح طور پر نہ سمجھ پاتا۔ اسلام میں واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اعتدال اختیار کرنا ضروری ہے: نہ اسے محدود سمجھنا صحیح ہے، نہ کسی تخیلاتی تصویر میں ڈالنا، اور نہ کسی مخلوق کے ساتھ اس کا موازنہ کرنا۔ توحید کا صحیح فہم ہمیں اللہ کی صفات کو ان کے اصل مفہوم اور مقام کے ساتھ تسلیم کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اور یہی انسان کے ایمان کو مضبوط اور عقلی و عملی طور پر درست راستے پر رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں اہل کتاب کو مخاطب کرتے ہوئے واضح طور پر ارشاد ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾[1]

اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو۔

"أي لا تجاوزوا الحد في اعتقادكم، كقول النصارى في عيسى أنه إله أو ابن الله، بل الزموا الحق فيما جاء به الأنبياء" [2]-

یعنی اپنے عقیدے میں حد سے آگے نہ بڑھو، جیسے کہ نصاریٰ نے عیسیٰؑ کے بارے میں کہا کہ وہ خدا یا خدا کا بیٹا ہے، بلکہ انبیاء جو حق لے کر آئے ہیں اسی پر قائم رہو۔

یہ آیت اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ غلو محض ذاتی انحراف نہیں بلکہ اجتماعی گمراہی کا ذریعہ ہے۔

---

[1] سورۃ المائدہ ۷۷

[2] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ۱۹۶۴ء، ج ۶، ص ۲۱

حضرت عیسیٰؑ کو الوہیت کا درجہ دینا، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾[1]

علامہ طبری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أي جاوزوا الحدّ في قولهم حتى جعلوا المخلوق إلهاً، فسمّاه الله كفراً "[2]

یعنی انہوں نے اپنے قول میں حد سے تجاوز کیا یہاں تک کہ مخلوق کو خدا بنا دیا، پس اللہ نے اسے کفر قرار دیا۔

سورۃ التوبہ میں ہے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ﴾[3]

یہودیوں نے کہا کہ عُزیر اللہ کا بیٹا ہے، اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔

یہ آیت براہِ راست اہلِ کتاب کے اعتقادی غلو کی نشاندہی کرتی ہے۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"هذا غلو في الاعتقاد حيث رفعوا المخلوق إلى مرتبة الخالق"[4]

یہ اعتقاد میں غلو ہے کہ انہوں نے مخلوق کو خالق کے درجے تک بلند کر دیا۔

امام قرطبی لکھتے ہیں:

"من نسب الولد إلى الله فقد جهل حقيقة الألوهية ووقع في أعظم الغلو"[5]

جس نے اللہ کی طرف اولاد منسوب کی اس نے الوہیت کی حقیقت کو نہ پہچانا اور سب سے بڑی انتہا پسندی میں گر گیا۔

---

[1] سورۃ المائدہ: ۷۲

[2] الطبری، جامع البیان، ج-۱۰، ص ۴۴۲

[3] سورۃ التوبۃ: ۳۰

[4] تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص ۳۵۰

[5] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن ج ۱۰، ص ۲۰۰

۲-اولیاء وصالحین میں غلو

اولیاء، علماء یا صالحین میں غلو سے مراد یہ ہے کہ انسان ان کی تعظیم میں حد سے بڑھ جائے اور ایسی صفات یا اختیارات ان کی طرف منسوب کرے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ آیت ﴿ وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴾[1]۔کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"المعنى: لا يجوز أن يُدعى فيها غير الله، لا ملك مقرب ولا نبي مرسل، فالنهي يتناول كل من دعا غير الله."[2]۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان (مساجد) میں اللہ کے سوا کسی کو نہیں پکارا جائے گا، نہ کسی مقرب فرشتے کو اور نہ کسی رسول کو۔ پس یہ ممانعت ہر اُس شخص کو شامل ہے جو اللہ کے علاوہ کسی کو پکارتا ہے۔

بعض لوگ قبور کی زیارت کو اس حد تک بڑھا دیتے ہیں کہ اسے عبادت کا درجہ دے بیٹھتے ہیں اور وہاں غیر شرعی رسوم ادا کرنے لگتے ہیں۔ وہ قبروں پر نذریں چڑھاتے، چراغاں کرتے اور اولیاء یا صالحین سے حاجتیں طلب کرنے لگتے، حالانکہ اسلام میں یہ عمل جائز نہیں اور شریعت کے خلاف ہے۔ اصل مقصد قبور کی زیارت عبرت حاصل کرنا اور نصیحت لینا ہے، نہ کہ اسے عبادت کا ذریعہ بنانا یا اولیاء کے لیے دُعا کی درخواست کرنا۔ اسلام نے قبور کی زیارت کی اجازت دی ہے، لیکن ہر قسم کے غلو اور بدعت سے سختی سے منع کیا گیا ہے تاکہ توحید کے تصور کو محفوظ رکھا جا سکے اور دین کی اصل روح برقرار رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا تَجْعَلُوا قَبْرِي عِيدًا))[3]۔میری قبر کو عید (میلہ) نہ بناؤ۔

۳-احکام دین میں غلو

احکامِ دین میں غلو سے مراد یہ ہے کہ انسان شریعت کے مقرر کردہ اعتدال سے بڑھ کر دین کو ضرورت سے زیادہ سخت اور مشکل بنا لے۔ بعض لوگ اپنے اجتہاد یا خواہش سے ایسے طریقے ایجاد کرتے ہیں جنہیں اللہ اور رسول ﷺ نے واجب نہیں کیا، جیسے بے جا عبادات یا خود ساختہ پابندیاں۔ یہ طرزِ عمل بدعت اور افراط کی شکل ہے جو دین کے اصل مقاصد کو مسخ کر دیتا ہے۔ قرآن نے اہلِ کتاب کو اسی روش پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

﴿يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾[4]۔

---

[1] سورۃ الجن:۱۸

[2] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۱۹، ص۲۸

[3] سنن أبی داود، کتاب المناسک، باب زیارۃ القبور، حدیث:۲۰۴۲

اے اہل کتاب! اپنے دین میں حد سے نہ بڑھو اور حق کے سوا کچھ نہ کہو۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"نهاهم الله عن الغلو والإطراء، وهو مجاوزة الحد، كما نهى عن ذلك النبي ﷺ فقال: لا تُطروني كما أطرت النصارى ابن مريم"[1]۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں دین میں غلو اور حد سے بڑھ جانے سے منع فرمایا، اور یہی ممانعت نبی ﷺ نے بھی فرمائی، جیسا کہ آپ ﷺ نے کہا: مجھے حد سے زیادہ نہ بڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے مریم کے بیٹے (عیسیٰ علیہ السلام) کو حد سے بڑھا دیا۔

۴-رہبانیت

رہبانیت ایک ایسا تصور ہے جس میں انسان نے عبادت کو اپنی زندگی کا مرکز بنا لیا اور دنیاوی زندگی سے مکمل طور پر کٹ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ اس طرزِ عمل میں انسان شادی، معاشرتی ذمہ داریوں اور فطری ضروریات سے کنارہ کش ہو جاتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ دنیا سے دوری اختیار کرنا ہی اللہ کی رضا حاصل کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔ ابتدائی طور پر یہ رجحان بعض لوگوں میں اخلاص اور روحانی پاکیزگی کے جذبے سے جنم لیتا ہے، لیکن جب یہ حد سے بڑھ جائے تو انسان کی فطری زندگی، معاشرتی تعلقات اور ذاتی ذمہ داریاں متاثر ہوتی ہیں۔

اسلامی تعلیمات میں عبادت اور ذکر اللہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا گیا، مگر اسلام نے واضح کیا کہ دین کی تقوی اور روحانیت کو دنیا کے فرائض اور معاشرتی ذمہ داریوں کے ساتھ متوازن رکھنا ضروری ہے۔ رہبانیت میں جو خود ساختہ شدت پیدا ہوتی ہے، وہ انسان کو حقیقی روحانی مقصد سے ہٹا کر خود پسندی اور دنیا سے کنارہ کشی کی طرف لے جاتی ہے، جس سے دین کا اصل پیغام متاثر ہوتا ہے۔ اسلام میں گوشہ نشینی یا عبادت کے لیے وقت نکالنا جائز ہے، لیکن اسے اس حد تک نہیں بڑھانا کہ انسان اپنی فطری زندگی، معاشرتی تعلقات اور اللہ کے دیے ہوئے حقوق سے محروم ہو جائے۔ قرآن مجید نے بنی اسرائیل کے بعض گروہوں کی اس روش کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿ وَرَهۡبَانِيَّةً ٱبۡتَدَعُوهَا مَا كَتَبۡنَٰهَا عَلَيۡهِمۡ إِلَّا ٱبۡتِغَآءَ رِضۡوَٰنِ ٱللَّهِ فَمَا رَعَوۡهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾[2]۔

---

[4] سورۃ النساء:۱۷۱

[1] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص۴۰۹

[2] سورۃ الحدید:۲۷

انہوں نے رہبانیت (ترکِ دنیا اور تجرد) خود گھڑ لی تھی، ہم نے ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا، مگر انہوں نے (اپنی طرف سے) اللہ کی رضاجوئی کے لیے اسے اختیار کیا، لیکن پھر اس کی پوری رعایت نہ کر سکے۔

تفسیر طبری میں ہے:

وأما الرهبانية فإنهم ابتدعوها من قبل أنفسهم، وما فرضها الله عليهم، ولكنهم التمسوا بذلك رضوان الله، فابتدعوا ما لم يشرع لهم "[1]۔

رہبانیت (ترکِ دنیا اور تجرد) تو انہوں نے اپنی طرف سے گھڑ لی تھی۔ اللہ نے ان پر اسے فرض نہیں کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا۔ پس انہوں نے ایسی چیز ایجاد کی جسے اللہ نے ان کے لیے مشروع نہیں کیا تھا۔

یہ طرزِ عمل بدعت تھا کیونکہ شریعت میں اس کی کوئی بنیاد نہ تھی۔ اسلام نے اس رہبانیت کو رد کرتے ہوئے انسان کو اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کرنے کی تعلیم دی، تاکہ دین اور دنیا دونوں میں توازن قائم رہے۔

نبی کریم ﷺ نے عقیدے میں اعتدال کی اہمیت کو بارہا واضح فرمایا اور اپنے بارے میں کسی قسم کے مبالغہ آمیز عقیدے سے منع فرمایا آپ کا ارشاد ہے:

((لا تُطْرُونِي كما أَطْرَتِ النَّصَارَى ابنَ مَرْيَمَ، فإنما أنا عبدُه، فقولوا عبدُ اللهِ ورسولُه)) [2]

مجھے اس طرح نہ بڑھاؤ جیسے عیسائیوں نے مریم کے بیٹے (عیسیٰؑ) کو بڑھا دیا۔ میں تو صرف اللہ کا بندہ ہوں، لہٰذا مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔

یہ حدیث ہمیں نبی اکرم ﷺ کے فکری اور اعتقادی اعتدال کی واضح مثال فراہم کرتی ہے، جس کے ذریعے آپ ﷺ نے امت کو عقیدے کی حدود اور روشنی دکھائی۔ آپ ﷺ نے نہ صرف توحید کو عقیدے کی بنیاد بنایا بلکہ اپنی ذات کو الوہیت یا مافوقِ بشری حیثیت میں پیش کرنے سے سختی سے منع فرمایا۔ اس واضح ہدایت کے ذریعے عقیدے میں غلو کی ہر شکل کی جڑ کاٹ دی گئی اور مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا کہ محبت اور تعظیم کی حد مقرر رہے۔

یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی کہ عیسائی امت نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے محبت میں مبالغہ کیا اور انہیں "ابن اللہ" یا خدا کا روپ قرار دے دیا، جس کے نتیجے میں شرک کا راستہ اختیار کیا گیا۔ اسلام نے اسی تاریخی غلطی کی

---

[1] الطبری، جامع البیان، ج ۲۳، ص ۴۴۳

[2]. البخاری، محمد بن إسماعیل. الجامع الصحیح. کتاب أحادیث الأنبیاء، حدیث ۳۴۴۵

روشنی میں امت کو متنبہ کیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی عزت اور اتباع اپنی جگہ ہے، لیکن ان کی ذات کو بندہ ورسول سے آگے بڑھا کر پیش کرنا عقیدے میں گمراہی ہے۔

یہاں عقیدے میں اعتدال کی دو بنیادی جہتیں واضح ہوتی ہیں:

۱- نبی کریم ﷺ کی ذات کی اعتدالی حیثیت: آپ ﷺ کا مرتبہ امت میں سب سے بلند ہے، لیکن آپ اللہ کے بندے اور رسول ہیں، نہ کہ اس کے شریک یا مافوقِ انسانی وجود۔ احادیث کی روشنی میں یہ واضح ہے کہ مسلمان آپ ﷺ سے بے پناہ محبت کریں، مگر یہ محبت عقیدے میں حد سے تجاوز نہ کرے۔

۲- توحید کے تحفظ کے لیے غلو سے اجتناب: نبی ﷺ نے بارہا ایسے الفاظ اور تعلیمات دی ہیں جو امت کو عقیدے میں غلو سے محفوظ رکھتی ہیں، تاکہ اللہ کی یکتائی اور بندگی کے تصور کو برقرار رکھا جاسکے۔ مثلاً:

((اللَّهُمَّ لا تَجْعَلْ قَبْرِي وَثَنًا يُعْبَدُ))[1]۔

اے اللہ! میری قبر کو معبود نہ بنا دینا کہ لوگ اسے پوجنے لگیں۔

اسلام عقیدے میں ایسا توازن چاہتا ہے جو نہ صرف توحید کی حفاظت کرے بلکہ رسول اللہ ﷺ کی عظمت کو بھی بجا طور پر تسلیم کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ﴾[2]

کہہ دو، میں تم جیسا بشر ہوں، البتہ مجھ پر وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔

یہی عقیدہ ہمیں ایک طرف نبی ﷺ کی غیر معمولی عظمت اور فضیلت کو سمجھنے کی اجازت دیتا ہے، اور دوسری طرف ہمیں شرک، بدعت اور تعظیم میں غلو کے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ اگر ہم نبی کریم ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا مطالعہ کریں تو پاتے ہیں کہ آپ ﷺ ہر معاملے میں اعتدال و توازن کی ایک زندہ اور مکمل مثال ہیں۔ آپ ﷺ نے زندگی کے ہر شعبے میں میانہ روی اختیار کی اور اپنی امت کو بھی اسی متوازن راہ پر چلنے کی ہدایت دی، تاکہ عقیدہ اور عمل میں افراط و تفریط سے بچا جاسکے۔

۵- حدودِ الٰہی سے تجاوز

اسلامی عقیدۂ توحید کی بنیاد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لا شریک ہے، ہر اعتبار سے بے نیاز ہے اور مخلوق کی تمام کمزوریوں اور محدودیتوں سے بالاتر ہے۔ تاہم جب اس بنیادی عقیدے سے انحراف کیا جائے، مثلاً اللہ کے لیے اولاد کا تصور پیش کرنا یا کسی مخلوق کو ربوبیت کے مرتبے تک بلند کرنا، تو یہ اعتقادی غلو کی انتہائی شدید صورت بن جاتی ہے۔

([1]) احمد بن حنبل، المسند، بیروت: مؤسسہ الرسالہ، ۲۰۰۱، حدیث ۷۳۵۰

([2]) سورۃ الکھف: ۱۱۰.

خاص طور پر اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد کا عقیدہ بنیادی توحید کے اصول سے انحراف اور غلو کی انتہا کا مظہر ہے، جو بالآخر کفر اور فکری گمراہی کی سب سے خطرناک شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ لَمْ يَكُنْ لَّه كُفُوًا اَحَدٌ ﴾[1]- نہ وہ کسی کو جنتا ہے اور نہ کسی سے جنا گیا ہے۔

اس کے باوجود اللہ کی اولاد کا تصور گھڑنا اللہ کی مقرر کردہ عقیدے کی حد سے آگے بڑھنا ہے۔

سورۃ مریم میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَنُ وَلَدًا. لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا . تَكَادُ السَّمَاوَاتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ﴾[2]

اور انہوں نے کہا کہ رحمان نے بیٹا بنا لیا ہے۔ یقیناً تم نے بڑی بھاری بات کہی، قریب ہے کہ آسمان اس سے پھٹ پڑیں۔

اللہ تعالیٰ کے لیے اولاد ثابت کرنا عقیدے میں غلو کی ایسی شکل ہے جو توحید کی بنیاد کو متزلزل کرتی ہے۔ یہ نہ صرف حدودِ شریعت سے تجاوز ہے بلکہ شرک اور کفر کی بدترین مثال ہے۔ اس میں اصل انحراف یہ ہے کہ انسان نے مخلوق کو الوہیت کے درجے پر فائز کر دیا، جو اسلامی عقیدے کے مطابق ناقابلِ معافی جرم ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾[3]-

انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا۔

ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أي أطاعوهم في معاصي الله حيث حرّموا عليهم الحلال وأحلّوا لهم الحرام فقلّدوهم في ذلك، فكانت تلك عبادتهم إياهم من دون الله"[4]-

یعنی انہوں نے اپنے علما اور راہبوں کی اطاعت اللہ کی نافرمانی میں کی۔ جب ان مذہبی پیشواؤں نے ان کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا، تو انہوں نے ان کی پیروی شروع کر دی، اور یہی دراصل اللہ کے سوا ان کی عبادت کے مترادف تھی۔

---

[1]سورہ اخلاص:۳

[2]سورۃ مریم:۸۸

[3]سورۃ التوبہ ۳۱

[4]ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۴، ص ۱۷۱

امام قرطبی رحمہ اللہ کا قول ہے:

"لم يعبدوهم بالسجود والركوع ولكن اتبعوهم فيما أمروا به ونهوا عنه فصاروا بمنزلة من يعبدهم"[1]۔

انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کی عبادت رکوع و سجود کے ساتھ نہیں کی، بلکہ ان کے احکام اور ممانعتوں کی اندھی تقلید کی، پس یہ ایسا ہوا گویا انہوں نے ان کی عبادت کی۔

امام طبری رحمہ اللہ اس آیت کی وضاحت کرتے ہیں:

"اتخذوا أحبارهم ورهبانهم أرباباً، يعني سادة يطيعونهم في معاصي الله[2]"۔

انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو رب بنا لیا، یعنی ایسے سردار جن کی وہ اللہ کی نافرمانی میں اطاعت کرتے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی وضاحت میں حضرت عدی بن حاتمؓ کو فرمایا:

((أما إنهم لم يكونوا يعبدونهم، ولكنهم كانوا إذا أحلّوا لهم شيئاً استحلّوه، وإذا حرّموا عليهم شيئاً حرّموه))[3]۔

اہلِ کتاب اپنے علماء اور راہبوں کی براہِ راست عبادت تو نہیں کرتے تھے، مگر جب وہ کسی چیز کو حلال قرار دیتے، تو وہ اسے حلال مان لیتے، اور جب کسی چیز کو حرام کہتے، تو وہ اسے حرام تسلیم کر لیتے تھے۔

مفسرین کے نزدیک اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے متوازی یا الوہیت کے مرتبے پر نہ بٹھایا، بلکہ ان کی اندھی تقلید اختیار کر لی۔ یہاں تک کہ انہوں نے حلال و حرام کے فیصلے خود اللہ کی بجائے انہی سے لینا شروع کر دیے۔ یہ رویہ "اعتقادی غلو" کی واضح مثال ہے اور اس میں شرک کی بنیادی جڑ موجود ہے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ دینی رہنماؤں کو شریعت کے اوپر رکھ کر ان کی اطاعت کو عبادت کے درجے تک بلند کر دیا گیا، جو حقیقت کے منافی ہے۔ اللہ تعالیٰ خالقِ کائنات ہے، وہ مخلوق کی طرح محتاج نہیں اور اسے اولاد یا کسی انسانی مدد کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کا عقیدہ محض ایک فرد کی غلطی نہیں بلکہ اجتماعی سطح پر شرک، فکری گمراہی اور

---

[1] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۸، ص۱۱۸

[2] الطبری، جامع البیان عن تأویل القرآن، ج۱۴، ص۲۱۰

[3] مسند أحمد، حدیث ۱۹۳۸۱؛ ترمذی، حدیث ۳۰۹۵

دین کی حقیقی تعلیمات سے انحراف پیدا کرتا ہے۔ یہ آیات واضح کرتی ہیں کہ اللہ کے لیے اولاد کا عقیدہ نہ صرف فکری غلو ہے بلکہ کائنات کی فطرت کے خلاف ایک عظیم کفر ہے۔

٦-خواہشات کی پیروی کو معبود بنانا

خواہشات کی پیروی کو معبود بنانا اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذاتی نفسانی خواہشات، جذبات اور میلانات کو معیارِ حق سمجھ لے اور اللہ تعالیٰ کے احکام اور وحی کی ہدایت کو نظر انداز کر دے۔ اس صورت میں انسان اپنی پسند اور ناپسند کو فیصلہ کن قرار دیتا ہے، چاہے وہ اللہ کے حکم کے خلاف ہو۔ قرآن مجید میں ایسے فرد کو یوں بیان کیا گیا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کو اپنا "الٰہ" بنالیتا ہے، یعنی جس طرح بندہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے، وہی اطاعت وہ اپنی نفسانی خواہشات کے آگے جھک کر انجام دیتا ہے۔ یہ رویہ عقیدے میں انتہا پسندی کی ایک واضح شکل ہے، کیونکہ اس میں انسان اللہ کی بندگی کو ترک کر کے اپنے نفس کو خدائی مقام دے دیتا ہے، جو براہِ راست شرک اور فکری انحراف کی طرف لے جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ﴾[1]۔ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا؟

یہ بھی اعتقادی غلو ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو معبود بنا کر اللہ کی بندگی سے انحراف کرے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

"أي لا يهوى شيئاً إلا ركبه، فهو يعبد هواه ويطيعه كما يعبد الإله"[2]۔

یعنی وہ جس چیز کی خواہش کرتا ہے، اس کی پیروی کرتا ہے۔ یوں وہ اپنی خواہش کی عبادت کرتا ہے، جیسے اللہ کی عبادت کی جاتی ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس کا معنی بیان کرتے ہیں:

"من أطاع هواه فقد اتخذ إلهه هواه"[3]۔

جس نے اپنی خواہش کی اطاعت کی، اس نے اپنی خواہش کو معبود بنالیا۔

---

[1] سورۃ الفرقان: ۴۳، الجاثیہ: ۲۳

[2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج ٦، ص ۳۳۸

[3] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج ١٦، ص ١١٧

جب انسان خواہش کے مطابق کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دیتا ہے، تو یہ وہی طرز عمل ہے جسے قرآن نے اہل کتاب کی گمراہی قرار دیا۔ دین کہتا ہے "اللہ کی اطاعت"، لیکن خواہش کہتی ہے "میں جو چاہوں وہی درست ہے"۔ یہ رویہ شریعت کی حدود سے تجاوز ہے، جو اعتقادی غلو کی اصل بنیاد ہے۔

سید قطب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"من يجعل هواه قانوناً لحياته فقد خلع ربوبية الله عن نفسه وأعطاها لنفسه"[1]۔

جو اپنی خواہش کو اپنی زندگی کا قانون بنالیتا ہے، وہ دراصل اللہ کی ربوبیت کو خود سے ہٹا کر اپنے نفس کو رب بنالیتا ہے۔

ابو الاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"آج کی سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنی عقل و خواہش کو شارع بنا کر اللہ کی ہدایت سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ یہی جدید دور کا سب سے بڑا شرک ہے۔"[2]۔

علامہ اقبال نے بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

"مغرب نے انسان کو خدائی سے آزاد تو کیا مگر نفس کی غلامی میں مبتلا کر دیا۔"[3]۔

آج کے دور میں خواہشات کی پیروی کو معبود بنانا صرف فردی سطح پر نہیں بلکہ فکری و سماجی نظاموں کی شکل میں بھی سامنے آتا ہے۔ مادیت پرستی[4]۔(Materialism) دنیاوی کامیابی اور دولت کو مقصدِ حیات بنالینا، اور اخلاقی و روحانی اقدار کو نظر انداز کر دینا، خواہشات کو معبود بنانے کی ایک بڑی صورت ہے۔

---

[1] سید ابراہیم قطب، فی ظلال القرآن، دار الشروق، الفرع الأكاديمي، علوم القرآن والتفسير، ج ٦، ص ۳۴۲

[2] ابو الاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن، مقدمہ، ج ۱، ص ۱۲

[3] اقبال، تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص ۴۵

[4] وہ نظریہ ہے جس کے مطابق کائنات کی اصل حقیقت صرف مادہ ہے۔ اس سوچ میں روحانیت، وحی یا ماورائی اقدار کی کوئی حیثیت نہیں۔ مادیت پرستی عملی سطح پر دنیاوی دولت، عیش و آرام اور مادی ترقی کو مقصدِ حیات بنا دیتی ہے۔ فلسفیانہ مادیت قدیم یونان میں ڈیماکریٹس (Democritus, 460–370 BC) اور اپی کیورَس (Epicurus, 341–270 BC) کے افکار میں موجود تھی۔ جدید معنوں میں اس کا زور صنعتی انقلاب خصوصاً ۱۸ویں اور ۱۹ویں صدی کے بعد بڑھا، جب یورپ میں سائنسی ترقی اور سرمایہ دارانہ نظام نے روحانیت کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ کارل مارکس (۱۸۱۸–۱۸۸۳) نے Historical Materialism کے تصور سے اس کو سیاسی و سماجی پہلو دیا۔ یہ زیادہ تر یورپ کے روشن خیالی (Enlightenment) کے دور کی پیداوار ہے۔

لبرل ازم[1] (Liberalism): لبرل ازم کے نام پر بعض لوگ دین کی حدود سے آزاد ہو کر یہ کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا مطلق حق ہے، چاہے وہ اللہ کے احکام کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ بعض حلقوں میں آزادی کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ہر انسان کو ہر چیز کرنے کا حق حاصل ہے، حتیٰ کہ وہ دین کی مقرر کردہ حدود کو بھی توڑ ڈالے۔ یہ رویہ خواہش کو "قانون" بنانے کے مترادف ہے۔

قدیم دور میں بھی الحادی[2]: رجحانات پائے جاتے تھے، جیسے کچھ یونانی فلسفیوں میں۔ مگر منظم الحاد کا آغاز یورپی روشن خیالی (Enlightenment, 17th–18th centuries) کے دور میں ہوا، جب مذہبی اداروں (خصوصاً کلیسا) کے خلاف ردعمل سامنے آیا۔ جدید الحاد (New Atheism) کی باقاعدہ لہر ۲۰ویں اور ۲۱ویں صدی میں رچرڈ ڈاکنز (Richard Dawkins)، کرسٹوفر ہچنز (Christopher Hitchens) اور سیم ہیرس (Sam Harris) جیسے ملحد مفکرین کے ذریعے عام ہوئی۔

۷۔ شخصی آزادی کے نام پر بغاوت

اسی طرح شخصی آزادی کے نام پر دین سے بغاوت کا رویہ بھی واضح کرتا ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو اللہ کے قانونِ الٰہی پر ترجیح دے رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خواہشات کو معیارِ حق بنا کر انسان دین کی اعتدال پسندی سے ہٹ جاتا ہے اور فکری و عملی انتہا پسندی میں گرنے لگتا ہے۔ جدید دور میں "میرا جسم، میری مرضی" جیسے نعرے اسی رجحان کی علامت ہیں، جو ظاہر کرتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کو فیصلہ کن اتھارٹی سمجھ رہا ہے، چاہے یہ اللہ کے احکام اور دین کے خلاف کیوں نہ ہو۔ یہ رویہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی خواہشات کو اللہ کے دین کے اوپر رکھ کر عمل کر رہا ہے۔ یہ فکری اور عملی دونوں سطحوں پر انتہا پسندی کی ایک شکل ہے، جس میں عقیدۂ توحید، شریعت کی حدود، اور دین کے اصول متاثر ہوتے ہیں۔

---

[1] ایک فکری و سیاسی نظریہ ہے جو فرد کی آزادی، شخصی حقوق اور برابر مواقع کو سب سے بڑی قدر قرار دیتا ہے۔ اس کے مطابق ہر انسان کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے، چاہے وہ مذہبی، اخلاقی یا سماجی حدود سے تجاوز ہی کیوں نہ کرے۔ لبرل ازم کی جڑیں یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance, 15th–16th centuries) اور انقلابی دور (خصوصاً ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی) میں ملتی ہیں۔ جان لاک (John Locke, 1632–1704) اور جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill, 1806–1873) جیسے فلسفیوں نے اس نظریے کو باقاعدہ بنیاد فراہم کی۔

[2] الحاد کا مطلب ہے اللہ یا کسی بھی الٰہی وجود کا انکار۔ ملحد فرد یا گروہ یہ مانتا ہے کہ کائنات کا کوئی خالق، آخرت یا وحی موجود نہیں۔ الحاد خالصتاً مادی و سائنسی توجیہات کو حقیقت مانتا ہے۔

اعتقادات میں انتہا پسندی کی نمایاں صورتیں یہ ہیں کہ اللہ کی الوہیت میں غلو کیا جائے، جیسے اللہ کے لیے اولاد یا شریک کا تصور پیدا کرنا۔ اسی طرح اولیاء اور صالحین کو حاجت روا یا مشکل کشا سمجھنا بھی اعتقادی غلو کی مثال ہے۔ دین کے احکام میں بدعات یا غیر ضروری سختی پیدا کرنا دین کے توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔ اپنی خواہشات کو معیارِ ہدایت بنانا اور حدودِ الٰہی سے تجاوز کرنا بھی انسان کو گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

ان تمام عوامل کا خلاصہ یہ ہے کہ جب انسان اللہ کی مقرر کردہ ہدایت سے ہٹ کر اپنی خواہشات، جذبات یا خودساختہ طریقوں کو دین بنالیتا ہے، تو وہ اعتقادی انتہا پسندی کا شکار ہو کر راہِ اعتدال سے دور ہو جاتا ہے اور دین کی حقیقی روح سے اجتناب کرنے لگتا ہے۔

فصل دوم

عبادات میں انتہا پسندی کی صورتیں اور رویّے

فصل دوم

عبادات میں انتہا پسندی کی صورتیں اور اور رویّے

اسلام کا نظامِ حیات فطری توازن، اعتدال اور ہم آہنگی پر قائم ہے۔ یہ نہ تو رہبانیت کی طرف مائل کرتا ہے اور نہ ہی دنیاوی لذتوں میں حد سے زیادہ مشغول ہونے کی اجازت دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت اس توازن اور میانہ روی کی بہترین مثال ہے، جہاں عبادات، دنیاوی ذمہ داریاں اور اجتماعی تعلقات سب میں اعتدال قائم رہا۔ انتہا پسندی صرف عقائد تک محدود نہیں بلکہ یہ عبادات، معاملات اور دیگر شعبۂ زندگی میں بھی ظاہر ہوتی ہے، جیسے پوری رات جاگ کر نماز پڑھنا یا دن کے وقت عبادت میں اتنی مشغولیت کہ حقوق العباد متاثر ہوں، یا نفل روزوں میں اتنی کثرت کہ صحت پر منفی اثر پڑے۔ اسی طرح اعتکاف یا ذکر میں حد سے زیادہ غلو کرنا، معاشرتی اور خاندانی ذمہ داریوں کی غفلت کا باعث بن سکتا ہے۔

عبادات میں انتہا پسندی، یا الغلوّ فی العبادات، اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ انسان عبادات میں افراط کرتے ہوئے شریعت کی مقرر کردہ آسانی اور توازن کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس صورت میں عبادات اتنی سخت اور مشکل بن جاتی ہیں کہ انسان کی طاقت اور شریعت کے اصول اس پر غالب نہ آ سکیں۔ مثال کے طور پر بہت زیادہ نمازیں یا روزے رکھنا، یا یہ خیال کرنا کہ شریعت کے مقررہ اعمال کافی نہیں بلکہ مزید سختی ضروری ہے، دین کے مزاج کے خلاف ہے۔ اسلام نے عبادات میں آسانی، سہولت اور اعتدال کی تعلیم دی ہے تاکہ انسان فکری، جسمانی اور معاشرتی توازن کے ساتھ دین کی پیروی کر سکے۔

علامہ شوکانی لکھتے ہیں:

"ان الغلو في العبادة والافراط في الطاعة على وجه تخرج به عن الحد الذي حده والمقدار الذي قدره ممنوع منه منهي عنه"[1]-

عبادت اور نیکی کے کاموں میں غلو اور افراط کرتے ہوئے اس حد اور مقدار سے نکل جانا، جو شریعت نے مقرر کی ممنوع ہے۔

اسلام عبادات میں بھی توازن اور اعتدال کو بنیادی اصول کے طور پر پیش کرتا ہے۔ عبادات کا مقصد

---

[1] الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۴ھ، ج ۲، ص ۶۰۰

صرف رسمی ادائیگی نہیں بلکہ ایک متوازن، مستحکم اور کامیاب زندگی کی بنیاد قائم کرنا ہے۔ اسلام نے جہاں عبادات کی فرضیت اور اہمیت کو لازم قرار دیا، وہیں افراط و تفریط سے بچنے کی بھی سخت ہدایت دی ہے۔ اعتدال کا مطلب یہ نہیں کہ عبادات کی اہمیت کم ہو جائے، بلکہ یہ کہ عبادات اس طرح ادا کی جائیں کہ دوسرے سماجی، خاندانی اور معاشرتی فرائض متاثر نہ ہوں۔ اگر کوئی شخص دن رات عبادت میں مشغول ہو کر اپنی صحت یا اہل و عیال کے حقوق کو نظر انداز کرے تو یہ رویہ غیر متوازن اور اسلامی اصولوں کے خلاف ہو گا۔ اسی طرح، اگر کوئی دنیاوی مصروفیات میں اس قدر مصروف ہو جائے کہ عبادات ترک ہو جائیں، تو یہ بھی شریعت کے اصول کے مطابق نہیں۔

اسلام نے عبادات جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج میں نہ صرف روحانی فوائد کے حصول کی تعلیم دی ہے بلکہ ان کے ذریعے جسمانی، ذہنی اور معاشرتی استحکام کو بھی فروغ دیا ہے۔ نماز انسان کے لیے سکون اور اللہ سے تعلق مضبوط کرنے کا ذریعہ ہے، مگر اس میں بھی توازن کو مقدم رکھا گیا ہے، یعنی نہ اتنی طویل پڑھی جائے کہ جسمانی مشقت ہو اور نہ اتنی مختصر کہ خشوع و خضوع ختم ہو جائے۔ روزے میں بھی یہی اصول ہے، نہ پورا سال روزے رکھنا کہ جسمانی کمزوری ہو اور حقوق العباد متاثر ہوں، اور نہ رمضان کے روزے چھوڑنا کہ حقوق اللہ میں کوتاہی ہو۔ زکوٰۃ اور حج میں بھی میانہ روی اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی تاکہ عبادات کی روح برقرار رہے اور ان کے نفاذ میں افراد کی جسمانی و مالی استطاعت کے مطابق سہولت ہو۔ اس فکری و عملی اعتدال کو نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو بھی واضح طور پر دکھایا، جب تین صحابہؓ نے اپنی عبادات میں شدت اختیار کرنے کی کوشش کی تو آپ ﷺ نے انہیں اصلاح فرمائی اور بتایا کہ اصل معیار میری سنت ہے، نہ کہ اپنی طرف سے عبادت میں افراط کرنا۔ سیدنا انس بن مالکؓ فرماتے ہیں:

(("جاء ثلاثة رهط إلى بيوت ازواج النبي ﷺ يسالون عن عبادة النبي ﷺ ، فلما اخبروا كانهم تقالوها، فقالوا: واين نحن من النبي ﷺ قد غفر له ما تقدم من ذنبه وما تاخر؟ قال احدهم: اما انا، فإني اصلي الليل ابدا، وقال آخر: انا اصوم الدهر ولا افطر، وقال آخر: انا اعتزل النساء فلا اتزوج ابدا، فجاء رسول الله ﷺ إليهم، فقال:" انتم الذين قلتم كذا وكذا، اما والله إني لاخشاكم لله واتقاكم له لكني اصوم وافطر، واصلي وارقد، واتزوج النساء، فمن رغب عن سنتي فليس مني".))[1]۔

تین افراد[2] نبی کریم ﷺ کی عبادت کے بارے میں جاننے کے لیے آپ ﷺ کی ازواجِ

---

[1] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح، حدیث: ۵۰۶۳، ج۵، ص ۲۰۱

[2] یہ حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص اور حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہم تھے۔

مطہرات کے گھروں میں حاضر ہوئے۔ جب انہیں حضور ﷺ کے معمولاتِ عبادت بتائے گئے تو انہوں نے اپنی عبادت کو اس کے مقابلے میں بہت کم محسوس کیا اور کہا: نبی ﷺ تو اللہ کے برگزیدہ ہیں، جن کی تمام سابقہ اور آئندہ لغزشیں معاف کر دی گئی ہیں، ہم کہاں ان کے برابر ہو سکتے ہیں! چنانچہ ایک نے کہا: میں پوری رات نماز پڑھا کروں گا۔ دوسرے نے کہا: میں ہمیشہ روزے رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہیں کروں گا۔ تیسرے نے کہا: میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور نکاح نہیں کروں گا۔ جب نبی کریم ﷺ کو ان باتوں کا علم ہوا تو آپ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا: "کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنہوں نے یہ باتیں کی ہیں؟ سن لو! اللہ کی قسم! میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا اور پرہیزگار ہوں، لیکن میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں، رات کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور آرام بھی کرتا ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ پس جو میری سنت سے منہ موڑے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔"

یہ حدیث اس بات کا روشن ثبوت ہے کہ اسلام میں عبادات اور دینی زندگی میں اعتدال و توازن کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عبادت کا اصل مقصد صرف محنت یا مشقت اٹھانا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہے، اور یہ تبھی ممکن ہے جب انسان اپنی فطری ضروریات، جسمانی طاقت اور معاشرتی ذمہ داریوں کے ساتھ دین کے تقاضوں کو بھی مناسب توازن کے ساتھ پورا کرے۔ اس حدیث سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ سنتِ نبوی ﷺ دین کا حقیقی اور درست راستہ ہے، اور اس سے ہٹ کر عبادت میں افراط یا شدت اختیار کرنا نہ صرف دین کے اصولوں کے خلاف ہے بلکہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ بھی نہیں۔ یوں یہ پیغام امت مسلمہ کو انتہا پسندی، عبادات میں غلو اور غیر متوازن رویوں سے بچانے کے ساتھ ساتھ اعتدال، میانہ روی اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے، تاکہ دینی و دنیاوی تقاضے دونوں پر پورا اترنے والا ایک متوازن معاشرتی اور روحانی نظام قائم ہو۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ نبی کریم ﷺ مسجد میں تشریف لے گئے۔ آپ کی نظر ایک رسّی پر پڑی جو دو ستونوں کے درمیان تنی ہوئی تھی۔ دریافت فرمایا:

((مَا هٰذَا الْحَبْلُ قَالُوا: هٰذَا حَبْلٌ لِزَيْنَبَ. فَإِذَا فَتَرَتْ تَعَلَّقَتْ،فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَا، حُلُّوهُ لِيُصَلِّ أَحَدُكُمْ نَشَاطَهُ، فَإِذَا فَتَرَ فَلْيَقْعُدْ))[1]۔

---

[1] البخاری، صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب: إن لبدنک علیک حقًا۔ حدیث: ۱۹۶۸، ج۳، ص۴۹

یہ رسّی کس کی ہے؟" لوگوں نے عرض کیا: "یہ حضرت زینبؓ نے باندھی ہے، جب وہ نماز میں کھڑے کھڑے تھک جاتی ہیں تو اس کا سہارا لے لیتی ہیں۔" حضور ﷺ نے فرمایا: "ایسا نہ کرو، یہ رسّی ہٹا دو۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہیے کہ جب تک دل آمادہ ہو، عبادت کرے، اور جب تھکن محسوس ہو تو آرام کر لے۔

اس ارشاد سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عبادت میں حد سے زیادہ مشقت اٹھانے یا خود کو غیر ضروری تکلیف میں ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ عبادت میں آسانی اور سہولت کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ عبادت انسان کی طاقت، استطاعت اور جسمانی حالات کے مطابق ہونی چاہیے، نہ کہ اس طرح کہ اس سے جسم پر بوجھ پڑے یا طبیعت کو زحمت لاحق ہو۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت خوش دلی، حضورِ قلب اور دل کی پوری توجہ کے ساتھ کی جائے تو وہ زیادہ پسندیدہ اور مقبول ہوتی ہے، اس کے برعکس کہ انسان تھکن یا مجبوری کے ساتھ محض بوجھ اٹھا کر کھڑا رہے۔ اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دین میں عبادات کے معاملے میں اعتدال اور توازن ضروری ہیں، اور اس میں کسی قسم کی سختی یا افراط و تفریط کی گنجائش نہیں رکھی گئی، تاکہ عبادت انسان کے روحانی اور جسمانی استحکام دونوں کے لیے مفید ثابت ہو۔

اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایک دوسرے کو نصیحت بھی اسی اصول پر ہوتی تھی چنانچہ جب رسول کریم ﷺ نے مؤاخاتِ مدینہ میں سیدنا سلمانؓ اور سیدنا ابو درداءؓ کے درمیان بھائی چارہ قائم کر دیا۔

ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابو درداءؓ کی ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ انہوں نے حضرت ام درداءؓ کو نہایت خستہ حال دیکھا تو پوچھا: "کیا بات ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "تمہارے بھائی ابو درداءؓ کو دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔" کچھ دیر بعد حضرت ابو درداءؓ آئے۔ حضرت سلمانؓ نے ان کے سامنے کھانا رکھا تو ابو درداءؓ نے کہا: "آپ کھائیں، میں روزے سے ہوں۔" سلمانؓ نے فرمایا: "میں اس وقت تک نہیں کھاؤں گا جب تک آپ بھی نہ کھائیں۔" چنانچہ ابو درداءؓ نے ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ رات ہوئی تو ابو درداءؓ نماز کے لیے اٹھنے لگے۔ سلمانؓ نے کہا: "ابھی سو جایئے۔" چنانچہ وہ سو گئے۔ پھر جب رات کا آخری حصہ آیا تو سلمانؓ نے کہا: "اب اٹھئے۔" دونوں نے مل کر نماز ادا کی۔ اس کے بعد سلمانؓ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

((إِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ، فَأَتَى النَّبِيَّ ﷺ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ، فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ: صَدَقَ سَلْمَانُ))[1]۔

---

[1] البخاری، صحیح البخاری، کِتَابُ الأَدَبِ، بَابُ صُنْعِ الطَّعَامِ وَالتَّكَلُّفِ لِلضَّيْفِ، ح:٦١٣٩

بیشک تمہارے رب کا تم پر حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، اور تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے، لہٰذا ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔ بعد میں جب حضرت ابو درداءؓ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ساری بات بیان کی، تو آپ ﷺ نے فرمایا: "سلمان نے بالکل درست کہا ہے۔

اعتدال کا یہی اصول ہمیں اس واقعے میں بخوبی نظر آتا ہے جب سیدنا سلمان فارسیؓ نے دیکھا کہ ابو درداءؓ اپنی عبادت میں اس قدر مشغول ہیں کہ دن کو روزے رکھتے اور رات کو قیام کرتے ہیں، جبکہ ان کی بیوی دنیاوی امور سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ سلمانؓ نے ان سے سمجھایا کہ ہر شخص کو اس کا حق دیا جائے، یعنی عبادت کے شوق میں گھریلو زندگی اور اہل خانہ کے حقوق کو نظر انداز کرنا اسلام میں پسندیدہ نہیں۔ یہ بات نہ صرف فہم و حکمت کی عکاس تھی بلکہ قرآن و سنت کی اصل روح کے عین مطابق تھی۔ نبی کریم ﷺ نے بھی اس ہدایت کی تصدیق فرمائی، جس سے یہ واضح ہوا کہ اسلام کی بنیاد توازن، اعتدال اور انسانی فطرت کے تقاضوں کو مد نظر رکھنے پر ہے۔ عبادت صرف ظاہری اعمال تک محدود نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں عدل، حکمت اور میانہ روی کو شامل کرنا اصل عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جسمانی حقوق، اہل خانہ کی ضروریات اور سماجی ذمہ داریوں کو بھی عبادت کا حصہ قرار دیا تاکہ انسان ایک متوازن اور ہمہ گیر زندگی گزار سکے۔

روزوں کے معاملے میں بھی انتہا پسندی سے اجتناب کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہر وقت روزے رکھنا، اپنی صحت کو نقصان پہنچانا یا اہل خانہ کے حقوق کو نظر انداز کرنا شریعت میں پسندیدہ نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے عبادات میں افراط و تفریط کو ناپسند فرمایا اور اعتدال کی تعلیم دی۔ غلو یہ ہے کہ انسان اپنی طاقت اور استطاعت سے بڑھ کر عبادت کرے، جیسے کہ مسلسل روزے رکھنا یا اتنے روزے رکھنا کہ جسم کمزور ہو جائے اور دیگر فرائض متاثر ہوں۔ اس لیے نبی ﷺ نے صوم داؤد کو سب سے بہترین قرار دیا، جس میں ایک دن روزہ اور ایک دن افطار ہے، تاکہ نہ نفس پر غیر ضروری بوجھ پڑے اور نہ عبادت ترک ہو۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادت کا اصل مقصد آسانی، توازن اور اعتدال کے ساتھ دین اور دنیا کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے روزوں کے بارے میں فرمایا:

﴿يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلۡيُسۡرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلۡعُسۡرَ﴾۔"[(1)]-

اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا۔

یہ آیت اور مذکورہ حدیث اس بات کی وضاحت کرتی ہیں کہ عبادت کا اصل مقصد انسان پر بوجھ

[(1)] البقرۃ:۱۸۵

ڈالنا یا اس کی زندگی کو مشکل بنانا نہیں بلکہ ایک متوازن اور معتدل طرزِ زندگی قائم کرنا ہے۔ اسی وجہ سے صومِ داؤد کو سب سے معتدل روزہ قرار دیا گیا، تاکہ عبادت نہ صرف اللہ کی رضا کے حصول کا ذریعہ بنے بلکہ انسان کے جسمانی و نفسیاتی حقوق اور سماجی ذمہ داریاں بھی متاثر نہ ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں عبادت اور دنیاوی تقاضے ایک دوسرے کے متضاد نہیں بلکہ ہم آہنگ ہیں، اور دین کی اصل روح اسی اعتدال اور توازن پر قائم ہے۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"يعني جل ثناؤه بقوله: ﴿يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلۡيُسۡرَ﴾ يريد الله بكم أيها المؤمنون في فرض صيامكم الميسر من العمل، وهو ما خفَّ عليكم، ولا يشقُّ عليكم.[1]۔

یعنی اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! تمہارے لیے روزے کے فرض میں آسانی اور سہولت چاہتا ہے، نہ کہ ایسا عمل جو تم پر بھاری اور مشکل ہو۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"أي رخص لكم في الإفطار في السفر والمرض، وأعطاكم هذه السعة؛ لأنه لو شاء لأوجب ذلك عليكم في كل حال كما فعل بالكفار من أهل الملل"[2]۔

یعنی اللہ نے تمہیں سفر اور بیماری میں روزہ چھوڑنے کی رخصت دی ہے اور یہ وسعت عطا کی، ورنہ اگر چاہتا تو ہر حال میں روزے کو لازم کر دیتا، جیسا کہ بعض کفار پر سخت احکام تھے۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"أي يريد الله بكم الرخصة والتخفيف، ولا يريد بكم المشقة والتعسير."[3]۔

یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ رخصت اور تخفیف کا ارادہ رکھتا ہے، تمہیں مشقت اور سختی میں ڈالنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔

ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ مفسرین کے نزدیک اس آیت کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادات میں سختی اور غلو نہیں رکھا، بلکہ آسانی، سہولت اور اعتدال کو ہی دین کی اصل روح قرار دیا ہے۔

---

[1] الطبری، جامع البیان، ج۳، ص۴۲۸

[2] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۲، ص۲۹۶

[3] البغوی، الحسین بن مسعود بن محمد، معالم التنزیل، دار طیبہ، ج۱، ص۲۲۸

ایک روایت میں ہے کہ جب عبد اللہ بن عمروؓ نے کہا کہ میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا اور کبھی ناغہ نہ کروں گا، تو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

((صُمْ يَوْمًا وَأَفْطِرْ يَوْمًا، فَذَلِكَ صِيَامُ دَاوُدَ، وَهُوَ أَعْدَلُ الصِّيَامِ))[1]۔

ایک دن روزہ رکھو اور ایک دن چھوڑ دو، یہی داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے اور یہی سب سے بہتر اور معتدل روزہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عبادات کا اصل مقصد بندے کو توازن اور اعتدال کی راہ پر چلانا ہے، نہ کہ غلو اور افراط کے ذریعے خود کو یا دوسروں کے حقوق کو نقصان پہنچانا۔

ابن حجر رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"وصفه ﷺ لصيام داود بأنه أعدل الصيام؛ أي أوسطه وأقومه وأقربه إلى العدل بين حق الله وحق النفس وحق الأهل"[2]۔

نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے داؤد علیہ السلام کے روزے کو سب سے زیادہ معتدل قرار دیا، یعنی یہ درمیانہ ترین، سب سے سیدھا اور اللہ کا حق، نفس کا حق اور اہلِ خانہ کے حق کے درمیان عدل کے سب سے قریب ہے۔

یعنی یہ نہ اتنی شدت ہے کہ انسان تھک جائے اور نہ اتنی نرمی کہ عبادت میں کمی رہ جائے۔

امام نووی رحمہ اللہ شرح صحیح مسلم میں لکھتے ہیں:

"وفي هذا الحديث دليل على كراهة صوم الدهر، وأن أفضل الصوم صيام داود عليه السلام. "[3]۔

اس حدیث میں دلیل ہے کہ ہمیشہ مسلسل روزے رکھنا (صوم الدہر) مکروہ ہے، اور سب سے افضل روزہ داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے۔

یعنی امام نووی کے نزدیک یہ حدیث اعتدال کی تعلیم ہے تاکہ جسمانی طاقت، گھریلو حقوق اور دیگر ذمہ داریاں متاثر نہ ہوں۔

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم وإفطار یوم، حدیث: ۱۹۷۶

[2] ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، ج ۴ ص ۲۹۰

[3] النووی، شرح النووی علی مسلم، ج ۸ ص ۴۱

قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے وضاحت کی کہ:

"وإنما كان صيام داود أفضل؛ لأنه جمع بين الصوم والفطر، ففيه مجاهدة للنفس، وإعطاؤها حظها، والقيام بحقوق الشرع والبدن "(1)-

داؤد علیہ السلام کا روزہ افضل اس لیے ہے کہ اس میں روزہ بھی ہے اور افطار بھی۔ اس طرح نفس کی مجاہدہ بھی ہے اور نفس کو اس کا حصہ بھی ملتا ہے، ساتھ ہی شریعت اور بدن دونوں کے حقوق ادا ہوتے ہیں۔

ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

"أعدل الصيام وأفضله ما لم يضعف صاحبه عن فرائضه وواجباته، وصيام داود كذلك " (2)-

سب سے زیادہ معتدل اور افضل روزہ وہ ہے جو اپنے صاحب کو اس کے فرائض اور واجبات سے کمزور نہ کرے، اور صومِ داؤد ایسا ہی ہے۔

امام نوویؒ نے اس حدیث کی روشنی میں صومِ الدہر یعنی مسلسل روزے رکھنے کی ناپسندیدہ حیثیت واضح کی ہے اور صومِ داؤد کو سب سے معتدل اور مکمل روزہ قرار دیا ہے۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ یہ روزہ اللہ کے حق، نفس کے حق اور اہل خانہ کے حق کے درمیان بہترین توازن قائم کرتا ہے۔ ابن حجر عسقلانیؒ نے بھی یہی اصول بیان کیا کہ صومِ داؤد میں عبادت اور نفس کی مجاہدہ کے ساتھ ساتھ اہل خانہ کے حقوق کا خیال رکھا گیا ہے، تاکہ عبادت تو قائم رہے مگر انسان کی صحت یا روزمرہ کے فرائض متاثر نہ ہوں۔ قاضی عیاضؒ نے اسے اس وجہ سے افضل قرار دیا کہ اس میں انسان کی عباداتی محنت اور عملی زندگی میں توازن دونوں برقرار رہتے ہیں۔

محدثین کے نزدیک صومِ داؤد (ایک دن روزہ رکھنا اور ایک دن افطار کرنا) کی فضیلت اسی میں ہے کہ یہ اعتدال اور میانہ روی پر مبنی عبادت ہے۔ اس میں نہ زیادہ شدت ہے جو جسم یا نفس کے لیے بوجھل ہو، اور نہ اتنی کمی کہ انسان کی روحانی تربیت متاثر ہو۔ اس طریقے سے یہ روزہ انسان کی جسمانی صحت کو محفوظ رکھتا ہے، کمزوری یا تھکن

---

(1) القاضی، عیاض بن موسیٰ بن عیاض بن عمرون الیحصبی السبتی، أبو الفضل، إکمال المعلم، المحقق: الدکتور یحیَی إِسْمَاعِیل دار الوفاء للطباعۃ والنشر والتوزیع، مصر الطبعۃ: الأولی، ۱۴۱۹ھ-۱۹۹۸م، ج ۴ ص ۱۱۲

(2) ابن عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر بن عاصم النمری، التمهید، وزارۃ الأوقاف والشؤون الإسلامیہ، المغرب، ج ۱۹ ص ۶۷

سے بچاتا ہے اور ساتھ ہی گھریلو زندگی، ازدواجی تعلقات اور سماجی ذمہ داریوں کو بھی متاثر نہیں کرتا۔ دین کا مقصد صرف انفرادی ریاضت نہیں بلکہ ایک متوازن عملی زندگی گزارنا ہے، اور صومِ داؤد اس اعتدال کو بہترین انداز میں ظاہر کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے "أعدل الصیام" یعنی سب سے معتدل روزہ قرار دیا۔ یہ روزہ دین میں غلو، افراط اور انتہا پسندی کی نفی کرتے ہوئے سہولت، توازن اور ہمہ گیر اعتدال کی عملی صورت پیش کرتا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادات کا مقصد نہ صرف اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے بلکہ انسان کی جسمانی، نفسیاتی اور سماجی بھلائی کو بھی مد نظر رکھنا ہے۔

زکوٰۃ میں بھی افراط اور تفریط دونوں ہی شکلوں میں انتہا پسندی ظاہر ہو سکتی ہے۔ افراط کی صورت میں بعض لوگ غیر ضروری سختی کرتے ہیں، ہر مال پر زکوٰۃ فرض سمجھتے ہیں یا ریاکاری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جبکہ تفریط کی صورت میں مستحقین محروم رہ جاتے ہیں یا زکوٰۃ غیر شرعی طریقے سے دی جاتی ہے۔ اسلام نے واضح ہدایت دی ہے کہ زکوٰۃ صرف نصاب کے مطابق اور شرعی ضوابط کے تحت دی جائے تاکہ یہ مال کی طہارت اور فقراء کی حاجت روائی کے مقصد کو پورا کرے۔

اسی طرح، ہر مال پر زکوٰۃ لازم قرار دینا یا اس کی ادائیگی میں غیر فطری سختی اختیار کرنا قرآن کی ہدایت کے خلاف ہے اور دین کی روح کے منافی ہے۔ اسلام میں افراط اور تفریط دونوں سے بچنا ضروری ہے تاکہ زکوٰۃ کا اصل مقصد، یعنی مال کی پاکیزگی اور معاشرتی انصاف، برقرار رہے اور عبادت کے اصولوں میں اعتدال قائم رہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ﴾[1]۔ اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔

اسی طرح زکوٰۃ کو ریا و دکھاوے کے ساتھ دینا جبکہ زکوٰۃ کا مقصد اللہ کی رضا ہے، نہ کہ شہرت یا تعریف۔

نبی ﷺ نے فرمایا((إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ))[2]۔ اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

لہٰذا ریاکاری کے ساتھ زکوٰۃ دینا اخلاص کے منافی اور انتہا پسندی ہے۔

یا پھر مستحقین کی حق تلفی کرنا، کچھ لوگ زکوٰۃ صرف رشتہ داروں یا پسندیدہ افراد تک محدود رکھتے ہیں

---

[1] سورۃ الحج: ۷۸

[2] صحیح البخاری، حدیث: ۱

جبکہ قرآن نے آٹھ مصارف واضح کیے ہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلۡفُقَرَآءِ وَٱلۡمَسَٰكِينِ وَٱلۡعَٰمِلِينَ عَلَيۡهَا وَٱلۡمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمۡ وَفِي ٱلرِّقَابِ وَٱلۡغَٰرِمِينَ وَفِي سَبِيلِ ٱللَّهِ وَٱبۡنِ ٱلسَّبِيلِ﴾[1]-

صدقات تو صرف فقراء، مساکین، زکوٰۃ وصول کرنے والے، دل جوڑے جانے والے، غلام آزاد کرانے، قرضداروں، اللہ کے راستے میں اور مسافروں کے لیے ہیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ زکوٰۃ کے مصارف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فَأَمَّا إِخْرَاجُهَا فِي غَيْرِ مَصَارِفِهَا فَلَا يَجُوزُ، وَهَذَا مِنَ الْغُلُوِّ فِي الدِّينِ[2]-"

زکوٰۃ کو غیر مصارف میں خرچ کرنا جائز نہیں، یہ دین میں غلو (انتہاپسندی) ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"إِنَّمَا ذَكَرَ اللَّهُ هَؤُلَاءِ الْأَصْنَافَ الْمَذْكُورَةَ فِي هَذِهِ الْآيَةِ، تَحْدِيدًا لِمَصَارِفِ الزَّكَاةِ، فَلَا يَجُوزُ الْعُدُولُ عَنْهُمْ"[3]-

اللہ نے زکوٰۃ کے یہ مصارف مقرر فرمائے ہیں، اس کے علاوہ کہیں خرچ کرنا جائز نہیں۔

امام نووی رحمہ اللہ نیت اور ریاکاری کے بارے میں بیان کرتے ہیں:

"وَأَمَّا مَنْ أَخْرَجَهَا لِلرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ فَهِيَ مَرْدُودَةٌ عَلَيْهِ، وَهَذَا مِنَ التَّشَدُّدِ الْمَذْمُومِ."[4]-

جو شخص زکوٰۃ ریا اور دکھاوے کے لیے دے، وہ مردود ہے اور یہ مذموم سختی (انتہاپسندی) ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ افراط و تفریط سے خبردار کرتے ہیں:

"فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَغْلُو فَيَجْعَلُ الصَّدَقَةَ فِي غَيْرِ مَوَاضِعِهَا، وَمِنْهُمْ مَنْ يُفَرِّطُ فَيَمْنَعُهَا عَنْ أَهْلِهَا، وَكِلَاهُمَا ضَلَالٌ."[5]-

کچھ لوگ غلو کرتے ہیں کہ صدقہ کو اس کے صحیح مقام پر نہیں دیتے، اور کچھ تفریط کرتے ہیں کہ اہل

---

[1] سورۃ التوبہ: ۶۰

[2] القرطبی، الجامع لاحکام القران تفسیر، ج۸، ص۱۷۵

[3] ابن کثیر، تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص۳۸۵

[4] النووی، شرح صحیح مسلم، ج۷، ص۱۲۰

[5] الغزالی احیاء علوم الدین، ج۱، ص۲۶۰

حاجت سے روک لیتے ہیں، دونوں گمراہی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کی حدود متعین ہیں، ان سے تجاوز کرنا غلو ہے یہ بھی ایک طرح کی انتہا پسندی ہے، نبی ﷺ نے فرمایا: ((فَأَعْطِهَا مَنْ هُوَ أَهْلُهَا))[1]۔ زکوٰۃ اسے دو جو اس کا اہل ہے۔

زکوٰۃ کے علاوہ نفلی صدقہ دینا فضیلت ہے، لیکن اس کو فرض کے درجے میں قرار دینا انتہا پسندی ہے۔ اسی طرح شریعت نے نصاب اور سال گزرنے کی شرط رکھی ہے۔ اگر کوئی شخص ان شرائط کو ختم کرکے ہر معمولی مال پر زکوٰۃ لازم سمجھے تو یہ بھی غلو ہے۔، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ﴾[2]۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تنگی نہیں چاہتا۔

ائمہ مفسرین اور فقہاء کے نزدیک زکوٰۃ کے معاملات میں اعتدال کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور اس کے احکام سے تجاوز یا غیر شرعی عمل کو غلو قرار دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ واضح مصارف متعین کیے گئے ہیں، اور ان مصارف سے ہٹ کر خرچ کرنا دین میں افراط اور انتہا پسندی کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کو ریا، دکھاوے یا سوشل نمود و نمائش کے لیے دینا بھی دین میں انتہا پسندی کی ایک شکل ہے، کیونکہ اس سے اخلاص کا تقاضا پورا نہیں ہوتا اور عبادت کا اصل مقصد ضائع ہو جاتا ہے۔

مزید بر آں، واجب مقدار سے زیادہ کو فرض یا لازمی سمجھنا بھی شریعت کے اصولوں کے منافی ہے اور اس کو دین میں غلو قرار دیا گیا ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کے معاملے میں آسانی، سہولت اور اعتدال پر زور دیا ہے تاکہ یہ عبادت بندے اور معاشرے دونوں کے لیے فلاح کا ذریعہ بنے۔ دوسری جانب اگر مستحقین کو ان کا حق نہ دیا جائے یا انہیں محروم رکھا جائے تو یہ تفریط کے زمرے میں آتا ہے، جو زکوٰۃ کے روحانی اور عملی مقصد کے خلاف ہے۔

اس طرح زکوٰۃ میں افراط و تفریط دونوں ہی ناپسندیدہ ہیں اور اسلام نے واضح طور پر میانہ روی اختیار کرنے، توازن قائم رکھنے اور دین کے احکام کے مطابق عمل کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اصول یہ ہے کہ زکوٰۃ نہ کم دی جائے اور نہ ہی اپنی طرف سے اضافی ضوابط یا شرائط گھڑ کر اصل مقصد سے ہٹایا جائے، تاکہ یہ عبادت نہ صرف مال کی پاکیزگی اور فقراء کی مدد کا ذریعہ بنے بلکہ دین کی روح اور شریعت کی تعلیمات کے عین مطابق عمل بھی ہو۔

---

[1] صحیح بخاری، حدیث: ۱۴۹۱

[2] سورۃ البقرۃ: ۱۸۵

حج اور عمرہ میں غلو

بعض لوگ حج و عمرہ میں ایسے اعمال ایجاد کر لیتے ہیں جو شریعت میں ثابت نہیں، یا پھر رمی جمار اور حجرِ اسود کے استلام میں دوسروں کو اذیت دیتے ہیں۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ))[1]

دین میں غلو سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے لوگ غلو ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

ابن ماجہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو اپنی کتاب المناسک میں اس وجہ سے ذکر کیا کہ حج کے دوران کچھ لوگ رمی جمار کے اعمال میں حد سے بڑھ جاتے تھے اور سنت سے انحراف کرتے تھے۔ رمی جمار میں سنت کے مطابق چھوٹی کنکریاں استعمال کرنی چاہئیں، تاکہ یہ عمل اعتدال اور درست طریقے سے ادا ہو۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ عبادات میں بھی غلو یا حد سے تجاوز دین کی روح کے خلاف ہے اور شریعت میں مقرر کردہ آسانی اور توازن کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ حج کے یہ اعمال نہ صرف جسمانی مشقت کا ذریعہ ہیں بلکہ ان میں اعتدال اختیار کرنا اور سنت کی پیروی کرنا بندے کی عقل، حکمت اور اللہ کے احکام کے مطابق عمل کرنے کا مظہر ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((ارْمُوا بِمِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ))[2]۔یعنی چنے کے برابر کنکریاں مارو

بعض لوگ رمی جمار میں حد سے بڑھ کر بڑی بڑی پتھریاں، جوتے یا لکڑیاں پھینکتے تھے، جیسے زیادہ ثواب حاصل کرنے یا شیطان کو زیادہ نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ اسی وجہ سے ابن ماجہؒ نے اس حدیث کو مناسکِ حج میں شامل کیا تاکہ واضح ہو کہ عبادات میں سنت سے تجاوز کرنا غلو ہے۔ حج اور دیگر عبادات میں اعتدال اختیار کرنا ضروری ہے، کیونکہ پچھلی امتیں غلو اور سخت روی کے سبب تباہ ہو گئیں۔ یہی اصول آج بھی مسلمانوں کے لیے سبق ہے کہ دین میں شدت یا بدعتی رویہ نقصان دہ ہو سکتا ہے۔

ذکر و دعا میں غلو: بعض لوگ ذکر و دعا میں غیر ثابت شدہ اذکار اور بدعات کو لازم کر لیتے ہیں، یا ان کی ایسی ہیئت اختیار کرتے ہیں جو شریعت سے ماخوذ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((سَيَكُونُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُونَ فِي الدُّعَاءِ وَالطُّهُورِ))[3]

---

[1] سنن ابن ماجہ، کتاب المناسک، باب قدر حصى الرمي، حدیث: ۳۰۲۹

[2] سنن النسائی، کتاب المناسک، باب قدر حصى الرمي، حدیث: ۳۰۵۷

[3] سنن أبی داود، کتاب الوتر، باب کراهية الاعتداء في الدعاء، حدیث: ۹۶

اس امت میں کچھ لوگ ہوں گے جو دعا اور طہارت میں زیادتی کریں گے۔

امام خطابی رحمہ اللہ اس کا معنی بیان کرتے ہیں:

"المعنى أنهم يسرفون ويبالغون في الدعاء بما لا يليق، ويجاوزون الحد في الطهارة بالإكثار والتنطع"[1]۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ دعا میں بے جا مطالبے اور غیر مناسب چیزیں طلب کر کے حد سے بڑھ جائیں گے، اور طہارت میں بھی ضرورت سے زیادہ سختی اور وسوسے میں مبتلا ہوں گے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مجموع الفتاوی میں دعا میں زیادتی کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

" أن يسأل العبد ما لا يجوز سؤاله، أو يتكلف السجع والتكلّف، والاعتداء في الطهور: أن يتجاوز السنة إلى الغلو والوسوسة"[2]۔

بندہ ایسی چیز مانگے جو مانگنا جائز نہ ہو یا دعا میں بناوٹ اور تکلف اختیار کرے۔ اور طہارت میں زیادتی یہ ہے کہ سنت کے مقرر کردہ طریقے سے بڑھ کر غلو اور وسوسے کا شکار ہو جائے۔

ابن القیم رحمہ اللہ اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

"فمن الاعتداء في الدعاء أن يسأل ما لا يليق به من منازل الأنبياء، أو أن يتكلّف السجع، أو أن يطيل في غير حاجة"[3]

دعا میں اعتداء (زیادتی) یہ ہے کہ بندہ ایسی منازل یا مقامات مانگے جو انبیاء علیہم السلام کے ساتھ خاص ہیں، یا دعا میں غیر ضروری سجع اور بناوٹ کرے، یا بلا وجہ لمبی دعا کرتا رہے۔

امام نووی رحمہ اللہ کا قول ہے۔

"الاعتداء في الدعاء أن يسأل ما يستحيل حصوله، أو يسأل ما هو محرم شرعًا، أو يتجاوز المشروع"[4]۔

---

[1] الخطابی، حمد بن محمد، معالم السنن شرح سنن أبی داود، تحقیق سعد بن نجدت عمر، مؤسسۃ الرسالۃ ناشرون، بیروت، ط ۲، ۲۰۱۶م ج ۱، ص ۲۸۳

[2] ابن تیمیۃ، مجموع الفتاوی، ج ۲۲، ص ۵۱۹

[3] ابن القیم، زاد المعاد في هدي خير العباد، ت: الأرناؤوط. مؤسسۃ الرسالۃ، ج ۲، ص ۳۳۷

[4] النووی، شرح صحیح مسلم، ج ۱۷، ص ۴۹

دعا میں زیادتی یہ ہے کہ بندہ ایسی چیز مانگے جو ناممکن ہو، یا ایسی چیز طلب کرے جو شرعاً حرام ہو، یا مشروع حدود سے آگے نکل جائے۔

محدثین کے مطابق اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کچھ لوگ اپنی عبادات میں حد سے بڑھ کر غلو کریں گے اور غیر ضروری شدت اختیار کریں گے۔ دعا میں وہ ایسے انداز اپنائیں گے جو شرعی اصولوں کے خلاف ہو، غیر ضروری لمبی دعائیں کریں گے یا سجع و بناوٹ میں پڑ جائیں گے۔ طہارت میں بھی حد سے تجاوز کرنا، مثلاً ضرورت سے زیادہ پانی بہانا، بار بار وضو کرنا یا وسوسوں میں مبتلا ہونا، غلو کی واضح مثالیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ہر عمل میں اعتدال اور میانہ روی کا حکم دیتا ہے اور عبادات میں زیادتی یا غیر ضروری سختی کی سختی سے ممانعت کرتا ہے۔

جہاد میں غلو

جہاد بذاتِ خود اسلام کی ایک عظیم اور سنجیدہ عبادت ہے، مگر اس میں بھی غلو اور حد سے تجاوز کی صورتیں سامنے آتی ہیں جو دین کی حقیقت سے بعید ہیں۔ صحیح روحِ جہاد وہی ہے جو شرعی ضوابط، جائز قیادت اور واضح مقاصد مثلاً دفاعِ وطن یا مظلوم کی مدد کے تحت ہو؛ جب یہ حدود پامال ہوں—جیسے بغیر کسی شرعی اتھارٹی کے جنگ کھڑی کی جائے، یا اپنی ذاتی رائے کی بنیاد پر مسلمانوں کو تکفیر کر کے ان کا خون حلال سمجھ لیا جائے—تو یہ عمل جہاد کی تعبیر کو مسخ کر دیتا ہے۔ جہاد کی تعلیمات میں اخلاق، رعایا کی حفاظت، اور جنگی ضوابط کا خاص اہتمام ہے؛ اسی لئے اسلام نے بے گناہوں، شہریوں اور مساجد و بازاروں کو محفوظ رکھنے کی ہدایت دی ہے۔ اس لیے جہاد کو کبھی ذاتی جذبات، انتقام یا سیاسی مفادات کے لیے بطور بہانہ استعمال نہیں کیا جانا چاہیے؛ اس طرح کا غلو نہ صرف انسانیت کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ دینی اقدار اور امت کے اتحاد کو بھی کھوکھلا کر دیتا ہے۔ جہاد اسلام کی عظیم عبادت ہے، مگر اس میں بھی انتہا پسندی دیکھنے کو ملتی ہے، جیسے بغیر شرعی شرائط کے جنگ چھیڑ دینا، مسلمانوں کی تکفیر کر کے ان کے خون کو مباح سمجھنا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ﴾[1]۔

زیادتی نہ کرو، بے شک اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

---

[1] البقرۃ:۱۹۰

امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"يقول تعالى ذكره: ولا تعتدوا أيها المؤمنون على من قاتلكم بتجاوزكم ما حدّ لكم فيهم من قتل من قاتلكم دون من لم يقاتلكم"[1]۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اے ایمان والو! تم اپنے دشمنوں کے خلاف زیادتی نہ کرو، یعنی ان کو قتل کرنے میں ان حدود سے تجاوز نہ کرو جو اللہ نے مقرر فرمائی ہیں، مثلاً ان سے لڑو جو تم سے لڑیں، لیکن ان سے نہ لڑو جو تم سے نہ لڑیں۔

امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"النهي عامّ يدخل فيه القتال في الحرم، والقتال في الأشهر الحرم، وقتل النساء والذّرية والشيوخ والزّمنى والرهبان، ومن لا يقاتل[2] "۔

اس آیت میں زیادتی سے ممانعت عام ہے، اس میں حرم میں قتال کرنا، اشہر حرم میں قتال کرنا، عورتوں، بچوں، بوڑھوں، معذوروں اور عبادت گاہوں کے راہبوں کو قتل کرنا شامل ہے؛ یعنی ان سب پر ہاتھ اٹھانا زیادتی ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"أي لا تقتلوا النساء ولا الصبيان ولا الشيخ الفاني ولا من ألقى إليكم السلم وكفّ يده، فإن فعلتم فقد اعتديتم " [3]۔

یعنی عورتوں، بچوں، بوڑھوں، اور ان لوگوں کو قتل نہ کرو جو تمہیں سلام کریں اور قتال سے باز رہیں؛ اگر تم نے ایسا کیا تو تم نے زیادتی کی۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"النهي عن الاعتداء يتناول جميع أنواع الظلم؛ من قتل من لا يقاتل، وأخذ مال من لا يستحق أخذه، ومجاوزة الحدّ في كل باب " [4]۔

---

[1] الطبری، تفسیر الطبری، ج۳، ص۵۶۵

[2] تفسیر القرطبی، ج۲، ص۳۵۱

[3] تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۵۰۴

[4] الرازی ،التفسیر الکبیر،، ج۵، ص۵۶

زیادتی سے ممانعت ہر قسم کے ظلم کو شامل ہے؛ خواہ وہ ان کا قتل ہو جو قتال نہیں کرتے، یا کسی کا مال ناحق لینا، یا ہر معاملے میں حد سے تجاوز کرنا۔

مفسرین کے نزدیک آیتِ کریمہ میں مذکور "وَلَا تَعْتَدُوا" کا مفہوم یہ ہے کہ جنگ اور قتال کی حالت میں بھی حد و حدود کا مکمل خیال رکھا جائے اور ظلم و زیادتی سے گریز کیا جائے۔ اس حکم کا عملی مطلب یہ ہے کہ قوت استعمال کرتے وقت انصاف واجب ہے—فائرنگ، یلغار یا گرفتاری میں کسی بھی نوعیت کی حد سے تجاوز روا نہیں۔ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ جنگی صورتحال بھی انسانی ضوابط اور اخلاق سے بالاتر نہیں بن سکتی؛ لڑائی کا مقصد ظلم کا خاتمہ یا دفاعِ نفس ہو سکتا ہے، مگر اس کے ساتھ بھی عدل، رحم اور اعتدال برقرار رکھنا لازم ہے۔

اس حکم کی رو سے خاص طور پر معصوم افراد کی حفاظت لازمی ہے: عورتیں، بچے، بوڑھے، بیمار اور غیر جنگجو افراد قتل یا تکلیف کے مؤجب نہیں سمجھے جاتے۔ اسی طرح جنگ کے دوران مساجد، عبادت گاہیں، کسانوں کی فصلیں، درخت اور عام شہری اہکامات کو بھی محفوظ رکھا جانا چاہیے۔ "حرمِ مکہ" اور اشہر حرم کی حرمت کی پاسداری بھی اسی اخلاقی تقاضے کا حصہ ہے—یعنی بعض جگہوں اور اوقات میں جنگ و جدل خود روکا گیا ہے تاکہ انسانیت کا تحفظ ممکن ہو۔ نتیجتاً آیت اسلامی جہاد کے اندر عدل و توازن کی بنیاد رکھتی ہے اور یہ واضح کرتی ہے کہ قوت کا استعمال بھی شریعت کے مقررہ اخلاقی دائرے میں رہ کر ہی جائز ہے۔ یہ آیت اسلام کے عدل اور اعتدال کے اصول کو واضح کرتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ جہاد میں غلو کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"مَنْ جَعَلَ الْقِتَالَ سَبِيلًا لِفَسَادٍ أَوْ عُدْوَانٍ فَهُوَ مِنَ الْغُلُوِّ الْمَذْمُومِ" [1]

جو قتال کو فساد یا زیادتی کا ذریعہ بنائے، وہ مذموم غلو میں داخل ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ مزید لکھتے ہیں:

"وَمِنَ الْغُلُوِّ فِي الْجِهَادِ أَنْ يُقَاتِلَ الْمُسْلِمُ الْمُسْلِمَ بِزَعْمِ أَنَّهُ جِهَادٌ، أَوْ أَنْ يَتَعَدَّى مَا شَرَعَهُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ مِنَ الْقِتَالِ"[2]۔

جہاد میں غلو یہ ہے کہ کوئی مسلمان اپنے ہی مسلمان بھائی سے لڑے اور اسے جہاد سمجھے، یا قتال کے ان احکام سے آگے بڑھ جائے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائے ہیں۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۳۵۴

[2] ایضاج ۲۸، ص ۵۳۸

امام شوکانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الغلو في الجهاد هو أن يُتَّخذ ذريعةً لإهلاك الأنفس البريئة، أو سفك الدماء المحرّمة بغير حق، وهذا عين البغي والعدوان"[1]۔

جہاد میں غلو یہ ہے کہ اسے معصوم جانوں کو ہلاک کرنے یا ناحق خون بہانے کا ذریعہ بنالیا جائے، اور یہ دراصل ظلم اور زیادتی ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فإذا تجاوز العبد حدود الشرع في الجهاد، فقد وقع في الغلوّ المنهيّ عنه، كقتل النساء والصبيان والمعاهدين"[2]۔

جب کوئی شخص جہاد میں شریعت کی حدود سے تجاوز کرے تو وہ اس غلو میں داخل ہو جاتا ہے جس سے ممانعت کی گئی ہے، جیسے عورتوں، بچوں اور معاہدین کو قتل کرنا۔

محدثین و فقہاء کے نزدیک جہاد تبھی جائز اور قابلِ تعریف سمجھا جاتا ہے جب وہ شرعی حدود، مناسب قیادت اور واضح اصول و ضوابط کے اندر رہ کر انجام دیا جائے۔ اگر کسی نے جہاد کو اپنے ذاتی مقاصد، انتقام یا غیر شرعی مطالب کے لیے استعمال کیا، یا اس کے دائرۂ عمل کو بڑھا کر عام مسلمانان یا معاہدہ کنندگان کے خلاف تشدد روا رکھا، تو یہ اصل جہادی مقصد اور شرعی معیار دونوں کے منافی ہے۔ خاص طور پر معصوم افراد — خواتین، بچے، بوڑھے یا غیر لڑنے والے شہری — کو نشانہ بنانا، یا معاہدوں کی خلاف ورزی کرنا، اسلام کے مقاصدِ شریعت یعنی عدل، حفاظتِ جان و مال اور امن کو تباہ کر دیتا ہے۔ اسی لئے فقہاء نے بارہا تاکید کی ہے کہ جہاد عدل، حفظِ اخلاق، اور شرعی قیود کے اندر محدود رہے؛ ورنہ یہ خالص دینی فریضہ نہیں رہ کر انتہا پسندی اور بربادی کا سبب بن جاتا ہے۔

تزکیہ و ریاضت میں غلو

تزکیہ اور ریاضت کے مقاصد روحانی صفائی، نفس کی تربیت اور اللہ کے قریب ہونا ہیں، مگر جب یہ عمل حدودِ شرع سے تجاوز کرنے، بدن و جان کو مضر حالت میں ڈالنے یا گھر والوں و معاشرتی ذمہ داریوں کو نظر انداز کرنے تک پہنچ جائے تو یہ غلو کہلاتا ہے۔ اسلام میں اصل مطلوبہ تزکیہ وہی ہے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو — اعتدال، حکمت اور آسانی کے ساتھ — تاکہ بندہ اللہ کی قربت حاصل کرے بغیر اس کے کہ اس کی جسمانی صحت، اہلِ خانہ یا معاشرتی

---

[1] نیل الاوطار، الشوکانی، ج ۷، ص ۲۰۱

[2] ابن القیم، زاد المعاد، ج ۳، ص ۱۰۸

رابطے تباہ ہوں۔ اس لیے محدثین وفقہاء اس بات کی تنبیہ کرتے ہیں کہ عبادت و ریاضت میں خود ساختہ سختیاں، بدعات یا دوسروں کو تقلید پر مجبور کرنا مناسب نہیں؛ حقیقی تزکیہ وہ ہے جو عمل، علم اور معاشرتی فرائض کے توازن کے ساتھ ہو۔

تزکیہ و ریاضت میں غلو یہ ہے کہ انسان عبادت کے نام پر حدودِ شرع سے تجاوز کرے، اپنے اور دوسروں کے حقوق ضائع کرے، بدن کو ہلاکت میں ڈالے، یا بدعتی طریقے ایجاد کرے۔ اسلام کا مطلوب تزکیہ وہ ہے جو قرآن و سنت کے مطابق اعتدال، آسانی اور توازن کے ساتھ ہو تاکہ بندہ اللہ کا قرب بھی حاصل کرے اور دنیاوی و سماجی ذمہ داریوں کو بھی ادا کرے۔ بعض لوگ نفس کے تزکیہ کے نام پر غیر فطری مشقتیں اور رہبانیت اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ بنی اسرائیل نے کیا۔ ارشاد باری تعالی ہے:﴿وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ﴾[1]۔

اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی، ہم نے وہ ان پر فرض نہیں کی تھی۔

ایسے اذکار یا اوراد ایجاد کرنا جن کی شرع میں اصل نہ ہو۔ بعض اوقات لوگ ریاضت کے نام پر غیر ثابت شدہ طریقے
اور اذکار ایجاد کرلیتے ہیں، جو بدعت کے زمرے میں آتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فمن اتخذ أورادًا لم يشرعها الله ورسوله كان من الغالين المبتدعين[2] "۔

جو شخص ایسے اوراد و اذکار بنالیتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے مقرر نہیں کیے، وہ غلو اور بدعت کا مرتکب ہے۔

بعض ریاضت کرنے والے دنیاوی چیزوں کو بالکل چھوڑ دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ترکِ دنیا ہی حقیقی تزکیہ ہے، حالانکہ قرآن میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾[3]۔

کہہ دو: کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کیا جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے

---

[1] سورة الحدید:۲۷

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۲، ص ۵۱۱

[3] سورۃ الأعراف:۳۲

اور پاکیزہ رزق کو (کس نے حرام کیا)؟

یعنی یہ سمجھ لینا کہ تزکیہ محض تنہائی میں ذکر و وظائف کرنے سے حاصل ہوتا ہے، جبکہ حقیقی تزکیہ سماج میں رہتے ہوئے، معاملات اور تعلقات کو درست کر کے ہوتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے:

"التَّشَدُّدُ فِي الْعِبَادَةِ بِمَا يُفْضِي إِلَى الْمَشَقَّةِ الشَّدِيدَةِ غُلُوٌّ مَذْمُومٌ"[1]۔

عبادت میں ایسی سختی اختیار کرنا جو شدید مشقت کا باعث بنے، یہ مذموم غلو ہے۔

نماز، روزہ اور زکوٰۃ کے علاوہ دیگر عبادات جیسے حج، جہاد، دعا، ذکر اور تزکیہ نفس میں بھی افراط و تفریط کے رجحانات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ بعض اوقات لوگ اپنی عبادات کو غیر شرعی یا حد سے زیادہ سخت انداز میں بڑھا دیتے ہیں، جس سے انسان کی جسمانی، نفسیاتی اور معاشرتی زندگی متاثر ہو جاتی ہے، اور عبادت کا اصل مقصد یعنی اللہ کی رضا حاصل کرنا ضائع ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف، بعض افراد عبادات میں سستی یا غفلت برت کر اپنی ذمہ داریوں کو ترک کر دیتے ہیں، جس سے روحانی ترقی رک جاتی ہے اور دین کی اصل تعلیمات نظر انداز ہو جاتی ہیں۔ قرآن و سنت اور اہل علم کی تعلیمات اس بات پر زور دیتی ہیں کہ عبادات میں افراط و تفریط دونوں ہی نقصان دہ ہیں، اور امت کو اعتدال، توازن اور میانہ روی اپنانے کی ہدایت دی گئی ہے۔

اعتدال کی یہ روش نہ صرف عبادات میں بلکہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بھی انسان کو توازن فراہم کرتی ہے۔ حقیقی بندگی تب حاصل ہوتی ہے جب انسان اپنی عبادات کو اخلاصِ نیت، سنت کے مطابق اور اپنی استطاعت کے دائرے میں ادا کرے۔ افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اختیار کرنا روحانی سکون، اخلاقی پاکیزگی اور معاشرتی ہم آہنگی کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہی وہ اصول ہے جو اسلام کی فطری اور عملی روح کو ظاہر کرتا ہے اور انسان کو ایک مکمل، متوازن اور معتدل زندگی گزارنے کا راستہ دیتا ہے۔

---

[1] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج۴، ص ۳۴۵

فصل سوم

فقہی و دینی معاملات میں انتہا پسندی کے رجحانات

فصل سوم

فقہی و دینی معاملات میں انتہا پسندی کے رجحانات

معاملات انسانی زندگی کا وہ لازمی حصہ ہیں جو روزمرہ کے لین دین اور باہمی تعلقات کو منظم کرتے ہیں۔ خرید و فروخت، کرایہ داری، شراکت داری، قرض و ادائیگی اور دیگر مالی یا خدماتی معاملات سب اسی دائرے میں آتے ہیں، جہاں ہر فریق کسی نہ کسی طرح کے فائدے یا ضرورت کے تبادلے میں شریک ہوتا ہے۔ اسلام نے ان امور کو عدل، دیانتداری اور رضامندی کے اصولوں کے مطابق چلانے کی تعلیم دی ہے تاکہ نہ صرف فرد کی ضروریات پوری ہوں بلکہ معاشرتی اعتماد اور انصاف بھی قائم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہی اور دینی معاملات کو صرف مالی لین دین تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ ان کے ذریعے انسانی تعلقات میں اخلاقی اصول، شفافیت اور ہم آہنگی بھی فروغ پاتے ہیں۔ معاملات صرف معیشتی یا قانونی موضوع نہیں بلکہ اسلام میں ان کا مقصد معاشرتی توازن، اخلاقی اعتدال اور عدل و انصاف کو یقینی بنانا ہے۔ انتہا پسندی یا غیر متوازن رویے نہ صرف فرد کی زندگی کو متاثر کرتے ہیں بلکہ معاشرتی نظام کی مضبوطی اور اعتماد کو بھی کمزور کرتے ہیں۔ اس لیے فقہاء اور علماء نے ہر دور میں اس بات پر زور دیا ہے کہ معاملات میں اعتدال، میانہ روی اور شریعت کے دائرے کے اندر رہنا لازمی ہے۔

معاملات کا واحد معاملہ ہے، امام راغب اصفہانی اس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"المعاملة هي المبايعة والمخالطة بين الناس فيما يتبادلون فيه من المنافع."[1]

معاملہ لوگوں کے درمیان باہمی لین دین اور اختلاط کو کہا جاتا ہے جس میں وہ ایک دوسرے سے منافع کا تبادلہ کرتے ہیں۔

علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"المعاملات هي الأحكام الشرعية المتعلقة بأفعال العباد في غير العبادات، من العقود والتصرفات ونحوها."[2]

---

[1] الراغب الأصفہانی، المفردات فی غریب القرآن مادۃ عمل ص ۵۶۹

[2] ابن عابدین، علامہ محمد امین شامی، رد المحتار علی الدر المختار، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی وأولادہ بمصر ۱۳۸۶ھ-۱۹۶۶م ج۱، ص۲۹

معاملات سے مراد وہ شرعی احکام ہیں جو بندوں کے افعال سے متعلق ہوں لیکن عبادات سے باہر ہوں، جیسے عقود (سودے، معاہدے) اور تصرفات وغیرہ۔

یہ عبارت اگرچہ عام اصولی ہے، مگر فقہی "معاملات" کے مفہوم کو واضح کرتی ہے کہ ان کی بنیاد عدل و مصلحت پر ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ کے نزدیک "معاملات" کی اساس عدل، رحمت اور مصلحت کے اصولوں پر قائم ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں:

"الشريعة مبناها وأساسها على الحكم ومصالح العباد في المعاش والمعاد، وهي عدل كلها ورحمة كلها ومصلحة كلها، فكل مسألة خرجت من العدل إلى الجور ومن المصلحة إلى المفسدة فليست من الشريعة وإن أدخلت فيها بالتأويل."[1]

شریعت کی بنیاد حکمت اور بندوں کے دنیاوی واخروی مفاد پر ہے۔ یہ سراسر عدل، رحمت اور مصلحت ہے، لہٰذا ہر وہ معاملہ جو عدل سے ظلم، مصلحت سے مفسدہ کی طرف لے جائے، وہ شریعت کا حصہ نہیں اگرچہ اسے تاویل کے ذریعے داخل کیا جائے۔

امام ابو اسحاق الشاطبی رحمہ اللہ

"المعاملات ترجع إلى حفظ نظام الأمة واستقامتها على وفق العدل ومراعاة المصالح."[2]

معاملات کا مقصد امت کے نظام کو برقرار رکھنا اور اسے عدل و مصلحت کے تقاضوں کے مطابق سیدھا رکھنا ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ نے معاملات کی مختلف اقسام کو ذکر کیا ہے، آپ لکھتے ہیں:

"المعاملات شرعها الله تعالى لتقوم مصالح الناس بها، من البيع والإجارة والرهن والوكالة وسائر العقود"[3]

اللہ تعالیٰ نے معاملات کو اس لیے مشروع کیا ہے کہ لوگوں کے باہمی مفادات ان کے ذریعے قائم رہیں، جیسے خرید و فروخت، اجارہ (کرایہ داری)، رہن (گروی)، وکالت اور دیگر معاہدات۔

---

[1] ابن القیم، إعلام الموقعین عن رب العالمین، دار ابن الجوزی، ج۳، ص۳

[2] الشاطبی، الموافقات فی اصول الشریعہ، ج۲، ص۳۰۲

[3] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۳، ص۲۴۳

اسلامی تعلیمات کے مطابق "معاملات" انسان کی ان تمام سرگرمیوں کو شامل کرتے ہیں جو اس کے فکری، فقہی، سماجی اور معاشی پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔

اگر معاملات میں پائی جانے والی انتہا پسندی کا جائزہ لیا جائے تو اہلِ علم نے اسے دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ پہلی قسم دینی و فقہی نوعیت کی ہے، جس میں اجتہاد و تقلید، فتاویٰ و تکفیر اور جہاد جیسے حساس موضوعات شامل ہیں۔ دوسری قسم سماجی، معاشرتی اور اقتصادی معاملات سے متعلق ہے، جس میں انتہا پسندی اخلاقی تعصبات، طبقاتی تفاخر، نسلی برتری یا اقتصادی ناانصافی کی صورت اختیار کرتی ہے۔ دونوں صورتوں میں مشترک عنصر یہ ہے کہ اعتدال سے انحراف معاشرتی بگاڑ، فکری انتشار اور عملی افراط و تفریط کا سبب بنتا ہے۔ اس لیے علمائے امت ہمیشہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ دینی، فقہی یا معاشرتی امور میں عدل، توازن اور میانہ روی کو بنیادی اصول سمجھا جائے۔

ا- دینی و فقہی معاملات

دینی و فقہی معاملات میں انتہا پسندی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کوئی فرد یا گروہ اپنی فقہی رائے یا اجتہاد کو مطلق حق سمجھ کر دوسروں کی آراء کو رد کر دے یا باطل قرار دے۔ اس میں اجتہاد و تقلید کے اختلافات کو ایمان و کفر کے پیمانے پر رکھنا بھی شامل ہے۔ اسی طرح جہاد یا تکفیر کے حساس امور میں شدت اختیار کرنا، اعتدال کو نظر انداز کرنا اور غیر ضروری سختی اپنانا عملی بگاڑ اور فکری انحراف کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح کے رویے نہ صرف شریعت کی روح کے خلاف ہیں بلکہ امت کے درمیان فکری تقسیم اور اختلافات کو بھی بڑھاتے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"ما أمر الله بأمرٍ إلا وللشيطان فيه نزغتان: إمّا إلى الغلوّ وإمّا إلى التقصير، وكلاهما باطل". [1]

اللہ نے جس چیز کا حکم دیا، شیطان اس میں دو طرح کی گمراہی پیدا کرتا ہے۔ ایک غلو (افراط) کی صورت میں، اور دوسری تقصیر (تفریط) کی صورت میں، اور دونوں باطل ہیں۔

دوسری قسم سماجی، معاشرتی اور معاشی تعلقات میں انتہا پسندی کی ہے، جو۔ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان عدل و توازن سے ہٹ کر طبقاتی تعصب، نسلی یا لسانی برتری، یا معاشی استحصال کی راہ اختیار کرتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء علوم الدین میں اس طرزِ فکر کو "امراضِ قلوب" قرار دیا اور فرمایا کہ جب انسان اپنی رائے، قوم، یا دولت کو معیارِ حق سمجھنے لگے تو یہ اخلاقی انحراف کا آغاز ہے۔[2]-

---

[1] ابن تیمیہ، الفتاوی الکبری، ج ۱۰، ص ۱۲۰

[2] غزالی، احیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۴۵

ان دونوں اقسام کا جامع پہلو یہ ہے کہ یہ اعتدال، عدل اور توازن کے قرآنی اصول سے انحراف کے نتیجے میں جنم لیتی ہیں۔ قرآن مجید نے امتِ مسلمہ کو﴿ أُمَّتًا وَسَطًا ﴾[1]، قرار دے کر واضح کیا کہ فکری و عملی زندگی کے تمام شعبوں میں میانہ روی ہی اسلام کی اصل روح ہے۔ امام شاطبی عِلیہ الرحمہ نے اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہا:

"الشريعة كلّها مبنية على التيسير ورفع الحرج، فكلّ ما خرج عن الاعتدال فهو باطل".[2]

شریعت کی بنیاد آسانی اور اعتدال پر ہے، جو چیز اس توازن سے ہٹ جائے، وہ باطل ہے۔

یوں معاملات میں انتہا پسندی خواہ اجتہاد و تقلید کے میدان میں ہو یا معاشرت و معیشت کے میدان میں، دراصل ایک ہی فکری بیماری کی مختلف صورتیں ہیں، یعنی افراط و تفریط۔ اسلام اس کے مقابل میں فکر و عمل میں اعتدال، انصاف اور وسعتِ نظر کو لازم قرار دیتا ہے تاکہ امت فکری انتشار اور عملی تصادم سے محفوظ رہے۔

(ا) اجتہاد و تقلید میں انتہا پسندی

دین کے دو بنیادی ماخذ قرآنِ مجید اور رسول اللہ ﷺ کی سنت ہیں۔ جب کسی معاملے میں ان دونوں سے واضح رہنمائی مل جائے تو تمام اہلِ ایمان اس پر عمل کو لازم سمجھتے ہیں۔ تاہم، اگر کسی مسئلے کے بارے میں قرآن و سنت میں صریح نص موجود نہ ہو، تو پھر انسان اپنی عقل و فہم سے رہنمائی لیتا ہے۔ اس کے لیے نصوص میں مشابہ احکام (نظائر) تلاش کیے جاتے ہیں، مسئلے کے مختلف پہلوؤں کا باریک بینی سے جائزہ لیا جاتا ہے، اور اجتماعی مصلحتوں کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اس گہرے غور و فکر اور شرعی استدلال کے عمل کو اجتہاد کہا جاتا ہے۔ اجتہاد صرف نئے مسائل کے حل تک محدود نہیں بلکہ وہ نصوصِ شرعیہ کی متعدد ممکنہ تعبیرات میں صحیح مفہوم متعین کرنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اجتہاد و تقلید کا تعلق فقہی اور عملی امور سے ہوتا ہے، یعنی دین کے احکام کو سمجھنے، ان کی تعبیر کرنے اور ان پر عمل کرنے کے طریقوں سے۔ جب کوئی فرد یا گروہ اجتہاد یا تقلید میں انتہا پسندی اختیار کرتا ہے تو دو صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ تقلید میں غلو کیا جاتا ہے، یعنی اپنے امام یا فقہی مسلک کو اس قدر مقدس سمجھ لیا جاتا ہے کہ دوسرے ائمہ یا ان کے اجتہادات کو غلط یا ناقابلِ قبول قرار دیا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ اجتہاد میں غلو کیا جاتا ہے، یعنی سلف کے متفقہ فہم اور اصولوں کو چھوڑ کر صرف اپنی رائے یا عقل کو دین کا معیار بنا لیا جاتا ہے۔ یہ دونوں رویّے فقہی و عملی معاملات میں انتہا پسندی کے مظاہر ہیں۔

اجتہاد و تقلید میں انتہا پسندی (الغلو في الاجتهاد والتقليد) کے حوالے سے ائمہ و فقہاء کے اقوال ملتے ہیں جو

---

[1] البقرہ: ۱۴۳

[2] الشاطبی، الموافقات، ج ۲، ص ۱۲۸

اعتدال، اتباعِ دلیل، اور فرقہ وارانہ تعصب سے اجتناب پر زور دیتے ہیں:

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ (ت:۱۵۰ھ) کا قول ہے:

"هذا رأيي، وهو أحسن ما قدرنا عليه، فمن جاء بأحسنَ منه قبلناه."[1]

یہ میری رائے ہے، اور یہی سب سے بہتر ہے جو ہم سمجھ سکے، لیکن اگر کوئی اس سے بہتر بات لے آئے تو ہم اسے قبول کریں گے۔

امام شافعی رحمہ اللہ (ت:۲۰۴ھ) بیان کرتے ہیں:

"كل ما قلتُ وكان عن النبي ﷺ خلافُ قولي مما يصحُّ، فحديثُ النبي ﷺ أولى، فلا تقلدوني."[2]

میں نے جو بھی بات کہی ہو، اگر اس کے خلاف نبی ﷺ کی صحیح حدیث موجود ہو تو نبی ﷺ کا فرمان ہی مقدم ہے، لہٰذا میری تقلید نہ کرو۔

امام مالک رحمہ اللہ (ت:۱۷۹ھ) بیان کرتے ہیں:

"إنما أنا بشرٌ أخطئ وأصيب، فانظروا في رأيي؛ فكل ما وافق الكتاب والسنة فخذوه، وما لم يوافق فاتركوه."[3]

میں بھی ایک انسان ہوں، مجھ سے غلطی بھی ہو سکتی ہے اور درستگی بھی۔ لہٰذا میری رائے کو کتاب و سنت کے مطابق پرکھو، جو موافق ہو اسے لے لو، اور جو مخالف ہو اسے چھوڑ دو۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ (ت:۲۴۱ھ) فرماتے ہیں:

"لا تقلدني ولا تقلد مالكاً ولا الشافعيَّ ولا الأوزاعيَّ ولا الثوريَّ، وخذ من حيث أخذوا."[4]

نہ میری تقلید کرو، نہ مالکؒ، نہ شافعیؒ، نہ اوزاعیؒ، نہ ثوریؒ کی، بلکہ وہاں سے علم حاصل کرو جہاں سے ہم نے حاصل کیا ہے (یعنی قرآن و سنت سے)۔

---

[1] ابن عبد البر، الانتقاء فی فضائل الأئمہ الثلاثۃ الفقہاء، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ص ۱۴۵

[2] النووی، ابو زکریا محیی الدین بن شرف، المجموع شرح المہذب، بیت الأفکار الدولیۃ، ج ۱، ص ۶۳

[3] ابن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ، دار ابن الجوزي، ج ۲، ص ۳۲

[4] ابن القیم، إعلام الموقعین، ج ۲، ص ۳۰۲

اسی نظریے کو ابن تیمیہ رحمہ اللہ (ت:۷۲۸ھ) نے بھی الفتاوی الکبری میں بیان کیا ہے کہ دین میں ہر افراط یا تفریط باطل ہے۔

"من جعل قول متبوعه معيار الحق والباطل دون الدليل من الكتاب والسنة فقد ضلّ وأضلّ".[1]

جس نے اپنے متبوع (امام یا شیخ) کی رائے کو کتاب و سنت کے بجائے حق و باطل کا معیار بنالیا، وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

ایک دوسری جگہ آپ لکھتے ہیں:

"فمن جعل شخصًا معينًا كالعالِمِ أو الشيخ أو الإمام أو غيره هو المعيار للحق والباطل، يوالى ويعادى على قوله، فهو من الذين فرقوا دينهم وكانوا شيعًا."[2]-

جو کسی خاص شخص چاہے وہ عالم ہو، شیخ ہو یا امام کو حق و باطل کا معیار بناتا ہے، اور اسی کی رائے کی بنیاد پر دوستی یا دشمنی کرتا ہے، تو وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور گروہوں میں تقسیم ہوگئے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (۷۲۸ھ)۔اجتہاد میں غلو کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ليس لأحدٍ أن ينصِبَ للأمةِ شخصًا يدعو إلى طريقته، ويوالي ويعادي عليها غيرَ النبي ﷺ، ومن فعل ذلك كان من أهل الأهواء والبدع."[3]

کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ امت کے لیے کسی مخصوص شخص یا طریقے کو معیارِ حق بنائے، اور اسی کی بنیاد پر محبت و دشمنی کرے، کیونکہ ایسا کرنے والا اہلِ بدعت اور خواہش پرستوں میں سے ہے۔

امام ابن قیم الجوزیہ (ت:۷۵۱ھ) رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

"ولا يجوز لأحدٍ أن يُلزِم الناسَ بمذهبِ رجلٍ معيّنٍ غيرِ رسولِ الله ﷺ، كما لا يجوز لأحدٍ أن يدعو إلى أقواله وآرائه، بل الواجب على كلِّ أحدٍ أن يدعو إلى ما دعا إليه الرسول ﷺ."[4]

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۰، ص ۱۶۴

[2] ایضا، ج ۲۰، ص ۸

[3] ایضا، ج ۲۰، ص ۱۶۴

کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ لوگوں کو رسولِ اللہ ﷺ کے علاوہ کسی مخصوص امام یا مجتہد کے مسلک یا رائے کا پابند بنائے، اور نہ ہی اس کے اقوال کی دعوت دے۔ بلکہ ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اسی چیز کی دعوت دے جس کی دعوت رسولِ اکرم ﷺ نے دی۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ اجتہاد و تقلید میں غلو اور افراط کے موضوع پر نہایت جامع قول ہے جو تقلید میں انتہا پسندی کے خطرے کی نشاندہی کرتی ہے، آپ لکھتے ہیں:

"ومن جعل متبوعه ميزانًا للحق والباطل، بحيث يوالِي ويعادي على موافقته ومخالفته، كان من أهل البدع والضلال، فإن الحق لا يُعرف بالرجال، وإنما يُعرف الرجال بالحق "[1]۔

اور جس نے اپنے متبوع (امام، شیخ یا رہنما) کو حق و باطل کا پیمانہ بنالیا۔ یہاں تک کہ وہ کسی سے محبت یا دشمنی صرف اس بنیاد پر کرے کہ وہ اس کے متبوع کے موافق ہے یا مخالف۔ تو وہ اہلِ بدعت و ضلالت میں سے ہے۔ کیونکہ حق کو لوگوں کے ذریعے نہیں پہچانا جاتا، بلکہ لوگوں کو حق کے ذریعے پہچانا جاتا ہے۔

ابن القیم رحمہ اللہ کے نزدیک جب انسان کسی امام یا مکتبِ فکر کو مطلق معیارِ حق سمجھ لے، اور کتاب و سنت کی روشنی میں تحقیق و تدبر ترک کر دے، تو یہ غلو (انتہا پسندی) ہے جو دین میں بگاڑ اور فرقہ واریت کا سبب بنتی ہے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ تقلید اور اجتہاد میں میانہ روی اختیار کرنے کی طرف رہنمائی کی ہے:

"المقلدُ إذا وقفَ عندَ قولِ إمامه دونَ نظرٍ في الدليلِ فقد عطّلَ ما أُمِرَ به من اتباعِ الوحي، والمجتهدُ إذا تجاوزَ نصوصَ الشرعِ بعقلهِ فقد اتبعَ الهوى[2] "

جو شخص اپنے امام کے قول پر بغیر دلیل غور کیے رک جاتا ہے، وہ وحی کی اتباع کے حکم کو ترک کر دیتا ہے، اور جو شخص نصوصِ شرع سے بڑھ کر اپنی عقل پر چلے، وہ خواہشِ نفس کی پیروی کرتا ہے۔

اسی طرح امام شاطبی رحمہ اللہ (۷۹۰ھ) نے اجتہاد میں غلو کی مذمت کرتے ہوئے کہا:

"ومن تتبع الرخص فقد تزندق"[3]۔

جو رخصتوں کی تلاش میں رہے، وہ بالآخر زندیق (گمراہ و بے دین) ہو گیا۔

---

[4] ابن القیم، اعلام الموقعین عن رب العالمین، ج ۲، ص ۳۰۲

[1] ایضا، ج ۲، ص ۲۳۵

[2] الشاطبی، الموافقات، ج ۴، ص ۲۴۵

[3] ایضا، ج ۴، ص ۱۱۵

اجتہاد و تقلید کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ (ت:۱۱۷۶ھ) اور دوسرے مفکرین کے اقوال اس موضوع میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں، کیونکہ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے جمودِ تقلید اور بے لگام اجتہاد دونوں میں توازن کی دعوت دی۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اجتہاد کی ضرورت اور مقصد بیان کرتے ہیں:

"إنّ الله تعالى لم يُغلق بابَ الاجتهاد، لأنّ الوقائعَ والنوازلَ لا تزالُ تتجددُ، فلو أُغلق بابُ الاجتهادِ لانقطعَ الطريقُ إلى معرفةِ حكمِ الله فيها "[1]۔

اللہ تعالیٰ نے اجتہاد کا دروازہ بند نہیں کیا، کیونکہ زمانے کے ساتھ نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور اگر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا جائے تو ان نئے مسائل میں اللہ کا حکم جاننے کا راستہ ختم ہو جائے گا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ اجتہاد اور تقلید میں اعتدال کی تلقین کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"إنّ التقليدَ المحضَ يُعمي البصيرةَ عن دلائلِ الكتابِ والسنة، والاجتهادَ المحضَ يورثُ الجرأةَ على الله ورسوله، والحقُّ بين ذلك وهو اتباعُ الدليلِ مع معرفةِ أقدارِ الأئمةِ واحترامِهم"[2]۔

محض تقلید بصیرت کو کتاب و سنت کے دلائل سے اندھا کر دیتی ہے، اور محض اجتہاد انسان کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بارے میں بے باک بنا دیتا ہے۔ حق یہ ہے کہ دونوں کے درمیان اعتدال اختیار کیا جائے، یعنی دلیل کی پیروی کے ساتھ ائمہ کے مقام و احترام کو باقی رکھا جائے۔

اسی طرح ائمہ کی تقلید کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"إنّ الأئمةَ الأربعةَ إنما وُضعت مذاهبُهم لتقريبِ الفهمِ على الناس، لا ليُجعَلَ قولُهم دينًا لازمًا على الأمة. "[3]۔

چاروں ائمہ کے مذاہب اس لیے وضع کیے گئے تھے تاکہ لوگوں کے لیے دین کی سمجھ آسان ہو جائے، نہ کہ ان کے اقوال کو امت پر لازم اور دین کے برابر سمجھ لیا جائے۔

---

[1] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، عقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید، تحقیق: محمد عبد الرحمن، الجامعۃ السلفیۃ، بنارس ص ۱۲

[2] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، دار إحیاء التراث العربي، بیروت، ج۱، ص ۱۳۲

[3] شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الإنصاف فی بیان اسباب الاختلاف، مطبعۃ المجیدیۃ، دھلی، ص ۴۹

علامہ محمد اقبال رحمہ اللہ اجتہاد کی فکری ضرورت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"The ultimate spiritual basis of all life, as conceived by Islam, is eternal and reveals itself in variety and change. A society which is not capable of new interpretations of its law, in the light of changing conditions, is doomed to decay"[1]۔

اسلام کی نظر میں زندگی کی روحانی بنیاد ابدی ہے، لیکن یہ تنوع اور تبدیلی کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ جو معاشرہ بدلتے حالات میں اپنے قانون کی نئی تعبیر کا اہل نہیں، وہ زوال پذیر ہو جاتا ہے۔

شیخ محمد عبدہ رحمہ اللہ (مصر، ۱۹۰۵ء) اجتہاد کی اہمیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"التقليدُ قتلٌ للعقل، والاجتهادُ حياةٌ للأمة[2]"۔

تقلید عقل کے لیے موت ہے، اور اجتہاد امت کے لیے زندگی ہے۔

ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ ائمہ کرام نے نہ اجتہاد میں خودسری کو پسند کیا، اور نہ تقلید میں تعصب کو۔ ان کے نزدیک اصل معیار کتاب و سنت ہے، اور فقہی اختلاف میں اعتدال، دلیل کی پیروی، اور احترامِ ائمہ کا رویہ ہی درست ہے۔

اجتہاد اور تقلید کی بحث محض علمی مباحثہ نہیں بلکہ فکری رویّے اور معاشرتی رجحانات کا بھی عکاس ہے۔ ایک طرف وہ حلقے ہیں جو روایت کو حدِ مطلق سمجھ کر اجتہاد کے دروازے کو مکمل بند کرنا چاہتے ہیں، اور دوسری طرف وہ ذہن ہیں جو ہر فرد کو نصوص پر براہِ راست غور و فکر کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک تیسرا گروہ موجود ہے جو دین میں توازن اور اعتدال کو اصل خوبی سمجھتا ہے۔ یہ گروہ نہ تقلید کو بالکل مسترد کرتا ہے اور نہ اجتہاد کو ہر شخص کے لیے لازمی قرار دیتا ہے، بلکہ امت کو فکری اعتدال، نصوص کی درست تفہیم اور علمی غور و فکر کی روشنی میں زندگی گزارنے کی دعوت دیتا ہے۔ دین میں اجتہاد اور تقلید دونوں کی اہمیت کو پہچاننا اور ان میں اعتدال قائم رکھنا، نہ صرف علمی طور پر ضروری ہے بلکہ امت کی فکری اور عملی ہم آہنگی کے لیے بھی لازمی ہے۔ فکری توازن اختیار کر کے ہی امت ایک مستحکم، عاقل اور متوازن معاشرتی و دینی زندگی گزار سکتی ہے۔

الغرض اوائل مفکرین اور شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور ان کے بعد کے مفکرین نے اجتہاد و تقلید میں توازن کو دین کی بقا کے لیے ضروری قرار دیا۔ نہ اجتہاد کا انکار کیا جائے، نہ تقلید میں جمود اپنایا جائے۔ اصل معیار کتاب و سنت اور عقلِ سلیم پر مبنی فہمِ ائمہ ہے۔ لہٰذا، اجتہاد و تقلید میں اعتدال ہی اسلامی فکر کا اصل تقاضا ہے، کیونکہ افراط (شدت)

---

[1] The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lecture VI, p. 147

[2] محمد عبدہ، الأعمال الكاملة، دار الشروق، القاہرۃ، ج۳، ص ۲۱۱

یا تفریط (غفلت) دونوں دین میں بگاڑ اور فکری انتہا پسندی کا سبب بنتے ہیں۔ اجتہاد کے برعکس تقلید کا مطلب یہ ہے کہ اجتہاد کا کام خود نہ کیا جائے بلکہ اس کے لیے کسی اور مستعد کے کیے ہوئے اجتہاد پر اعتماد کرتے ہوئے اس پر عمل کیا جائے اور مجتہد سے اس کے اجتہاد کی دلیل کا مطالبہ نہ کیا جائے۔ اجتہاد اور تقلید کے میدان میں مسلمانوں کے ہاں دو مستقل رجحان رہے ہیں: اکثریتی گروہ تقلید کا حامی رہا ہے جبکہ ایک اقلیتی گروہ ہر دور میں خود اعتماد کرنے کا قائل رہا ہے[1]۔

تکفیر و فتاویٰ میں انتہا پسندی

اسلامی فکر اور فقہی اعتدال کے حوالے سے تکفیر و فتاویٰ میں انتہا پسندی (الغلوّ في التكفير والفتاوى) ایک نہایت حساس اور اہم موضوع ہے۔ دین اسلام نے ہمیشہ اعتدال، تحقیق، اور انصاف کو بنیادی اصول کے طور پر پیش کیا ہے تاکہ امت فکری اور عملی طور پر متوازن رہے۔ بلا دلیل کسی مسلمان کو کافر قرار دینا، یا فتوے میں تعصب اور سخت گیری اختیار کرنا، امت میں تفرقہ، نفرت، اور فساد پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ائمہ و محدثین نے واضح فرمایا کہ تکفیر ایک نہایت سنگین معاملہ ہے اور اس کے لیے قطعی دلیل اور مکمل فہم نصوص لازمی ہے۔ فتویٰ دین میں رہنمائی کا ایک ذریعہ ہے، لیکن جب اس میں علم، تقویٰ اور بصیرت نہ ہو تو یہ فتنہ اور غلط رویہ بن سکتا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (۷۲۸ھ) تکفیر میں احتیاط کی تاکید:

"وليس لأحدٍ أن يُكفِّرَ أحدًا من المسلمين وإن أخطأ وغلط، حتى تُقامَ عليه الحجةُ وتُبيَّنَ له المحجّة، ومن ثبتَ إسلامُه بيقينٍ لم يزلْ ذلك عنه بالشكّ"[2]۔

کسی مسلمان کو اگر وہ غلطی کرے یا خطا میں مبتلا ہو صرف اسی بنیاد پر کافر قرار دینا جائز نہیں، جب تک کہ اس پر حجت قائم نہ کر دی جائے اور اس کے سامنے حق واضح نہ ہو جائے۔ اور جس کا اسلام یقینی طور پر ثابت ہو جائے، وہ محض شک کی بنا پر اسلام سے خارج نہیں ہوتا۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ (۷۵۱ھ) فتوے میں توازن کے بارے میں لکھتے ہیں:

---

[1] دوسری اور تیسری صدی ہجری میں امت مسلمہ کے ذہین ترین ائمہ نے اجتہاد پر غیر معمولی کام کیا جن میں امام جعفر صادق (۸۳-۱۴۸ھ / ۷۰۲-۷۶۵ء)، امام ابو حنیفہ (۸۰-۱۵۰ھ / ۶۹۹-۷۶۷ء)، امام سفیان ثوری (۹۷-۱۶۱ھ / ۷۱۶-۷۷۸ء)، امام مالک (۹۳-۱۷۹ھ / ۷۱۱-۷۹۵ء)، امام شافعی (۱۵۰-۲۰۴ھ / ۷۶۷-۸۱۹ء)، امام احمد بن حنبل (۱۶۴-۲۴۱ھ / ۷۸۰-۸۵۵ء)، امام داؤد ظاہری (۲۰۰-۲۷۰ھ / ۸۱۵-۸۸۳ء)، اور دیگر بہت سے ائمہ کے اجتہادات کے نتیجے میں پورے کے پورے مکاتب فکر وجود میں آئے۔

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۱۲، ص ۴۶۶

"المفتي إذا لم يكن فقيه النفس، عارفًا بمقاصد الشرع، متمكنًا في معرفة الواقع، زلّ وأضلّ، لأنّه ينزل النصوص على غير منازلها[1] ".

اگر مفتی دین کی روح کو نہ سمجھتا ہو، شرعی مقاصد سے نا آشنا ہو اور حالاتِ زمانہ کا ادراک نہ رکھتا ہو، تو وہ خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے، کیونکہ وہ نصوصِ شرعیہ کو ان کے غلط محل پر لاگو کرتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ (۵۰۵ھ) تکفیر میں جلد بازی کی مذمت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"الخطأ في ترك ألف كافرٍ في الحياة أهونُ من الخطأ في سفك دم مسلمٍ واحدٍ بغير حقّ[2] "

اگر ہزار کافروں کو زندہ چھوڑ دینے میں غلطی ہو جائے تو یہ بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ ایک بے گناہ مسلمان کا خون غلطی سے بہا دیا جائے۔

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ، ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اہلِ علم نے اس بات پر زور دیا کہ فتوے اور تکفیر میں میانہ روی، تدبر، اور شریعت کے مقاصد کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں فقہی اعتدال نہ صرف علمی دیانت کی علامت ہے بلکہ امت کے اتحاد، سماجی ہم آہنگی اور اخلاقی استحکام کی ضمانت بھی ہے۔ اس لیے ہر عالم یا فقیہ پر لازم ہے کہ وہ فتوے دیتے وقت نہ جلد بازی کرے اور نہ جذبات یا تعصب کی بنیاد پر فیصلہ کرے، بلکہ ہر معاملے میں تحقیق، نصوص کی درست تفہیم، اور امت کے مفاد کو مدنظر رکھے۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ (۶۷۶ھ) تکفیر کے باب میں ضابطہ بیان کرتے ہیں:

"اعلم أن مذهب أهل الحق أنه لا يُكفَّر أحدٌ من أهل القبلة بذنبٍ ولا بخطأٍ في التأويل، ما لم يُنكر معلومًا من الدين بالضرورة[3] "۔

یہ بات اہلِ حق کے نزدیک مسلمہ ہے کہ کسی اہلِ قبلہ (مسلمان) کو نہ کسی گناہ کی وجہ سے اور نہ کسی اجتہادی خطا کی وجہ سے کافر قرار دیا جائے، جب تک وہ دین کی ایسی بات کا انکار نہ کرے جو ضروریاتِ دین میں سے ہو۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ (۷۹۰ھ) اہلِ غلو کی گمراہی کو بیان کرتے ہیں:

"أصلُ ضلالِ أهل البدعِ هو الجرأةُ على إطلاقِ الأحكامِ والتكفيرِ بغيرِ برهانٍ قاطعٍ من الكتابِ والسنة[4] "

[1] ابن القیم، إعلام الموقعین، ج۱، ص۸۷

[2] الغزالی، الاقتصاد فی الاعتقاد، دار المنہاج، ص۱۲۸

[3] النووی، شرح صحیح مسلم، ج۲، ص۴۹

[4] الإمام الشاطبي، الاعتصام، ج۱، ص۱۱۳

اہلِ بدعت کی گمراہی کی جڑ یہ ہے کہ وہ بغیر قرآن و سنت کی قطعی دلیل کے احکام اور تکفیر کے فتوے جاری کرنے میں جلد بازی کرتے ہیں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ (۱۵۰ھ) مسلمان کی تکفیر سے منع کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لا نكفّر أحدًا من أهل القبلة بذنبٍ، ولا نخرجه من الإسلام بعملٍ[1] "۔

ہم کسی اہلِ قبلہ کو کسی گناہ کی وجہ سے کافر نہیں کہتے، اور نہ کسی عمل کی بنیاد پر اسے اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں۔

امام ابن حجر العسقلانی رحمۃ اللہ علیہ (۸۵۲ھ) کا قول ہے:

"الجرأةُ على تكفيرِ المسلمِ خطرٌ عظيمٌ، فإنّ الكفرَ حكمٌ شرعيٌّ مردّه إلى الله ورسوله، فلا يجوز الإقدامُ عليه إلا بدليلٍ قاطعٍ[2] "۔

کسی مسلمان کی تکفیر میں جلد بازی بہت خطرناک کام ہے، کیونکہ کفر کا حکم شرعی ہے جس کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اختیار میں ہے، لہٰذا اس میں قدم اٹھانا بغیر قطعی دلیل کے جائز نہیں۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (۹۱۱ھ) کا قول ہے:

"إياك والتسرّعَ في التكفيرِ، فإنّ من كفّرَ مسلمًا بغير حقٍّ فقد باءَ بها أحدُهما[3] "

تکفیر میں جلد بازی سے بچو، کیونکہ جو کسی مسلمان کو ناحق کافر کہتا ہے تو ان دونوں میں سے ایک پر وہ (کفر) لوٹ آتا ہے۔

ائمہ اہلِ سنت نے تکفیر اور فتاویٰ میں غلو کو بہت بڑا فتنہ قرار دیا۔ تکفیر صرف قطعی دلیل، واضح انکارِ ضروریاتِ دین اور اقامتِ حجت کے بعد ہی ممکن ہے۔ اجتہادی یا تاویلی خطا کی بنیاد پر کسی مسلمان کو کافر کہنا گمراہی ہے۔ فتویٰ دینے میں علم، بصیرت، اور مقاصدِ شریعت کی سمجھ ضروری ہے۔ تکفیر و فتاویٰ میں انتہا پسندی کے اثرات امتِ مسلمہ کے فکری، علمی اور عملی اتحاد کے لیے نہایت تباہ کن ثابت ہوئے ہیں۔

ان ائمہ نے اس معاملے میں میانہ روی، تدبر، اور مقاصدِ شریعت کی رعایت کو لازم قرار دیا۔ چنانچہ تکفیر و فتاویٰ میں اعتدال نہ صرف علمی دیانت کا تقاضا ہے بلکہ امت کے اتحاد و استحکام کی ضمانت بھی ہے۔

---

[1] الإمام ابو حنیفۃ، الفقہ الأکبر، ص۳۱۸، تحقیق: محمد زاهد الکوثري

[2] ابن حجر العسقلاني، فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج۱۲، ص۳۰۲

[3] جلال الدین السیوطي، الأشباہ والنظائر، ص۲۸۳

اس رویے نے مسلمانوں میں فرقہ واریت، باہمی نفرت اور تکفیر کے فتنوں کو ہوا دی، جس سے دین کا اصل مقصد رحمت، عدل اور ہدایت متاثر ہوا۔

امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ (۱۲۰۶ھ) کا قول ہے:

"ولا نكفّرُ إلا من عرف دينَ الرسولِ ثمّ بعد ذلك سبَّه وكرهَه وأبغضَه وعانَدَه"[1]۔

ہم کسی کو کافر نہیں کہتے، مگر اس شخص کو جو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو جاننے کے بعد اس کی توہین کرے، اس سے نفرت کرے، یا اس کا انکار کرے۔

ائمہ و فقہا نے ہمیشہ اس امر پر زور دیا کہ تکفیر کا دروازہ صرف انہی حالات میں کھولا جائے جہاں قطعی نصوص اور واضح دلائل موجود ہوں۔ بلا دلیل فتویٰ یا سختی دراصل علم کی کمی اور خواہشِ نفس کی علامت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اہلِ علم اور دینی ادارے اس باب میں توازن، تحقیق اور احتیاط کو اپنا شعار بنائیں۔ اجتہاد اور فتویٰ کا میدان اہلِ بصیرت، اہلِ تقویٰ اور اہلِ علم کے لیے مخصوص رہے۔ اعتدال، رواداری اور شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے امت کو تکفیر کے فتنے سے بچانا ہر عالم کی ذمہ داری ہے۔ یہی طرزِ عمل دین کی روح اور امت کے استحکام کی ضمانت ہے۔

لغوی و شرعی مفہوم

جہاد "عربی لفظ "جُهد" یا "جَهد" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں: کوشش، محنت، جدوجہد جَهَدَ، اَلْجَهْدُ اور اَلْجُهْدُ کے معنی طاقت و اِستطاعت اور محنت و مشقت کے ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جیم پر زبر کے ساتھ الجَهد مشقت کے معنی میں ہے اور الجُهد کا معنی کسی چیز کا وسیع ہونا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ الجُهد کا استعمال اِنسانوں کے لیے خاص ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ ﴾[2]-جو اپنی محنت و مشقت کے سوا (کچھ زیادہ مقدور) نہیں پاتے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ﴿ وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ﴾[3] وہ اللہ کی قسم نہایت زور دے کر کھاتے ہیں، یعنی پوری تاکید کے ساتھ یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنی قسم کو پورا کریں گے۔ اسی طرح "اجتہاد" کے معنی ہیں اپنے نفس کو بھرپور کوشش اور محنت پر آمادہ کرنا اور مشقت برداشت کرنے کے لیے تیار رکھنا۔ شریعت کی اصطلاح میں "جہاد"

---

[1] محمد بن عبد الوہاب، الأشباہ والنظائر، ص ۲۸۳ الدرر السنية في الأجوبة النجدية، ج ۱، ص ۱۰۴

[2] البقرہ: ۱۹۰ سورۃ التوبۃ: ۷۹

[3] سورۃ الفاطر: ۴۲

سے مراد ہے کہ انسان اللہ کے دین کو سربلند کرنے اور اس کے کلمے کو غالب کرنے کے لیے اپنی جان، مال اور صلاحیتوں کے ساتھ جدوجہد کرے۔

شرعی مفہوم

شرعی اصطلاح میں جہاد کا معنی اپنی تمام ترجسمانی، ذہنی، مالی اور جانی صلاحیتوں کو اللہ کی رضا کی خاطر نیکی اور بھلائی کے کام میں وقف کر دینا ہے. گویا بندے کا اپنی تمام تر ظاہری و باطنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو اعلی مقاصد کہ حصول کے لیے اللہ کی راہ میں سر وکرنے کا کے حصول کے لیے اللہ کی راہ میں صرف کرنے کو جہاد کہا جاتا ہے.

امام جرجانی رحمۃ اللہ علیہ (۷۴۰-۸۱۶ھ) کے نزدیک جہاد کی تعریف درج ذیل ہے:

"هُوَ الدُّعَاءُ إِلَى الدِّيْنِ الْحَقِّ"[1]۔ جہاد دینِ حق کی طرف دعوت دینے سے عبارت ہے۔

امام ابن قدامہ المقدسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"وَالجِهَادُ هُوَ بَذْلُ الوُسْعِ فِي قِتَالِ الكُفَّارِ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَبِالأَمْوَالِ وَالأَنْفُسِ وَاللِّسَانِ وَسَائِرِ الوُسَعِ."[2]۔

جہاد یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں کفار سے قتال اور ان کے مقابلے میں اپنی پوری طاقت خرچ کی جائے، خواہ وہ مال سے ہو، جان سے، زبان سے یا دیگر ذرائع سے۔

امام النووی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"الجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ هُوَ مُبَالَغَةُ النَّفْسِ فِي قِتَالِ الكُفَّارِ لِإِعْلَاءِ كَلِمَةِ اللهِ."[3]۔

اللہ کی راہ میں جہاد سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنی پوری جانفشانی کے ساتھ کفار سے قتال کرے تا کہ اللہ کے کلمے کو بلند کرے۔

ائمہ کے اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ: جہاد صرف قتال کا نام نہیں بلکہ اللہ کے دین کے غلبے کے لیے ہر قسم کی سعی و کوشش جہاد کہلاتی ہے۔ یہ عملی، علمی، دعوتی، اور دفاعی تمام میدانوں میں شامل ہے۔ اصل مقصد "اِعلاءِ کلمۃ اللہ" یعنی دینِ اسلام کی سربلندی ہے، نہ کہ ذاتی مفاد یا انتقام۔

---

[1] الجرجانی، کتاب التعریفات: ۱۱۲

[2] ابن قدامہ 'ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد، المغنی، وزارۃ الشؤون الإسلامیۃ، ج۹، ص ۱۶۳

[3] النووی، شرح صحیح مسلم، ج۱۳، ص ۳۱

جہاد اور قتال، حرب میں فرق

قتال جنگ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جب کہ لفظ جہاد کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ قرآن حکیم میں جنگ، خواہ دفاع کے لیے کیوں نہ ہو لفظ جہاد کا ناگزیر اور لازمی معنی نہیں ہے۔ بد قسمتی سے یہ اِصطلاح اِنتہا پسندوں اور دہشت گردوں نے hijack کر رکھی ہے۔ وہ اپنی مجرمانہ اور دہشت گردانہ کارروائیوں کے لیے اور بنی نوع انسان کو ہلاک کرنے کے لیے اِس اِصطلاح کا غلط اِستعمال و اِطلاق (wrong application) کرتے ہیں۔ مزید بر آں اِسلامی تعلیمات کے مطابق قتال کا مطلب بھی ظالمانہ اور جارحانہ لڑائی نہیں بلکہ حق اور اِنصاف پر مبنی جائز (lawful) جنگ ہے جو UN کی دی ہوئی Definition کے عین مطابق ہے اور جسے عالمی قانون (International law) بھی جائز قرار دیتا ہے۔ بلکہ یہ جنگ ظلم و ستم اور جبر و اِستبداد کے خاتمے اور اَمن اَمان کی بحالی کے لیے لڑی جاتی ہے۔

عربی میں جنگ کو عام طور پر "حرب" کہا جاتا ہے۔ لیکن حرب کا تصور مقصد و معنی کے اعتبار سے جہاد سے کہیں مختلف ہے، اسی لیے جہاد کو محض حرب قرار نہیں دیا جاتا۔ جہاں جنگ و لڑائی (حرب) اکثر فتنوں اور فساد کو جنم دیتی ہے، وہیں جہاد کا مقصد فتنہ و برائی کا سدِّ اِجتماع اور حق و عدل کی بحالی ہوتا ہے۔ یعنی جہاد کے اغراض دنیاوی جارحیت یا توسیع طلب جنگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ. فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ. ﴾[1]۔

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود تمہارے پاس رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو اگر تم سچے ایمان والے ہو۔ اور اگر تم نے یہ نہ کیا تو جان لو کہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

یہ اَمر قابل ذکر ہے کہ آیت مذکورہ میں مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے اور جہاد مسلمانوں کے خلاف نہیں کیا جاتا۔ یہاں پر اصل میں سود کی سنگینی کو ظاہر کرنے کے لیے لفظِ حرب استعمال کیا گیا ہے۔ اکثر مفسرین نے بیان کیا ہے کہ عملی طور پر بھی کبھی اس بنا پر جہاد نہیں کیا گیا۔ لہٰذا یہاں لغوی معنی مراد ہیں اصطلاحی نہیں۔

ایک اور مقام پر عہد فراموش کفار کے حوالے سے لفظ حرب استعمال کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

﴿فَاِمَّا تَثْقَفَنَّھُمْ فِی الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِھِمْ مَّنْ خَلْفَھُمْ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ﴾[2]۔

---

[1] الانفال:۵۷

[2] البقرۃ:۲۷۸-۲۷۹

سو اگر آپ انہیں (میدانِ) جنگ میں پالیں تو ان کے عبرت ناک قتل کے ذریعے ان کے پچھلوں کو (بھی) بھگا دیں تاکہ انہیں نصیحت حاصل ہو۔

قبائلِ یہود بار بار عہد شکنی کے مرتکب ہوتے تھے۔ یہ آیت انہی کے متعلق نازل ہوئی۔ یہودیوں نے ذاتی بغض و عناد کے باعث لڑائیوں کا جو سلسلہ شروع کیا ہوا تھا اور قبائلِ عرب کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں مصروف تھے۔ قرآن مجید میں اس منفی کارروائی کا ذکر حرب سے کیا گیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ فِى الْاَرْضِ فَسَادًا ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ﴾[1]۔

جب بھی یہ لوگ جنگ کی آگ بھڑکاتے ہیں اللہ اسے بجھا دیتا ہے اور یہ (روئے) زمین میں فساد انگیزی کرتے رہتے ہیں، اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ کا روئے سخن یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ یہاں بھی حرب سے مراد ہرگز جہاد نہیں بلکہ منفی مقاصد پر مبنی جنگ و قتال ہے۔ مفہومِ آیت روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔

جہاد اللہ کے دین میں ایک عظیم اور بایں راست فریضہ ہے جسے ظلم و ستم کا خاتمہ، عدل کا قیام اور حق کی حفاظت کے مقصد کے تحت مشروع قرار دیا گیا—نہ کہ فساد پھیلانے، بے جگہ قتل و غارت یا طاقت کے اظہار کے لیے۔ قرآن و سنت نے جہاد کے اصول واضح کر دیے ہیں: نیت کا خالص ہونا، شرعی حدود کا احترام، بے گناہوں اور معاہدہ دار افراد کی حفاظت، اور ظلم سے ہر قسم کی پرہیز۔ بدقسمتی سے بعض گروہوں نے جہاد کے اس اصیل مفہوم کو مسخ کر کے اپنے سیاسی، انتقامی یا ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا، جو درحقیقت غلو اور انتہا پسندی کی شکل ہے۔ علمائے دین و محدثین نے بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ جہاد صرف اس وقت جائز اور قابلِ دفاع سمجھا جا سکتا ہے جب وہ کسی مشروع قیادت، شریعت کے ضوابط اور صحیح نیت کے تحت انجام پائے؛ ورنہ وہ نہ صرف دینی معیاروں کے خلاف ہے بلکہ معاشرے میں افراتفری، ظلم اور تباہی کو جنم دیتا ہے۔ اس لحاظ سے جہاد اور انتہا پسندی کے درمیان واضح تمیز سمجھنا اسلامی فکری ذمہ داری اور شریعت کے تقاضے میں شامل ہے۔

جہاد کا دائرہ محض مسلح قتال تک محدود نہیں رہا بلکہ وسیع تر معنی میں وہ ہر وہ جدوجہد ہے جو اللہ کی رضا اور دینِ اسلام کی سربلندی کے لیے کی جائے—خواہ وہ علمی کوشش ہو، اخلاقی اصلاح ہو، دعوتی محنت ہو یا عسکری دفاعی اقدام۔ اس معنوی اور عملی وسعت کے سبب جہاد کو صرف بندوق یا لڑائی تک محدود سمجھنا غلطی ہو گی؛ صحیح جہاد وہ ہے جس کا محور نصوصِ شرع، مقاصدِ شریعت اور انسانی فلاح ہو۔ فقہاء و محدثین نے اسی جامع اور متوازن تصور کی تائید کی ہے تاکہ جدوجہد کے ہر شعبے میں حدودِ اعتدال قائم رہیں، اور دین کے نام پر نہ ظلم جائز ٹھہرے نہ ذاتی یا

---

[1] سورۃ المائدۃ: ٦٤

سیاسی اغراض کے لیے دین کا غلط استعمال ہو۔

قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویہ میں لفظِ جہاد کے مختلف اِطلاقات

قرآن میں "جہاد" کا ذکر تقریباً ۳۰ سے زائد مقامات پر ہوا ہے، لیکن ہر جگہ اس کا معنی "جنگ" نہیں ہوتا چند مثالیں ملاحظہ ہوں[1]، اسی طرح نبی ﷺ نے جہاد کو صرف تلوار سے قتال تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے کئی پہلو بیان کیے ہیں:[2]

---

[1]سورۃ الفرقان: ۵۲ **جہاد بالقرآن** ارشاد باری تعالی ہے: ﴿فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا﴾ سورۃ الفرقان:۵۲ آپ کافروں کی اطاعت نہ کریں، اور اس (قرآن) کے ذریعے ان سے عظیم جہاد کریں۔ یہاں جہاد سے مراد دعوت، تبلیغ اور فکری و علمی جدوجہد ہے، نہ کہ جنگ۔ **جہاد بالنفس** ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾[1] سورۃ العنکبوت:۶۹ اور جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں، ہم ضرور انہیں اپنے راستے دکھاتے ہیں۔ اس آیت میں جہاد سے مراد اپنے نفس، خواہشات اور گناہوں کے خلاف جدوجہد ہے۔ **جہاد بالمال** ارشاد باری تعالی ہے: ﴿انفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾ سورۃ التوبہ:۴۱ اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ یہاں مالی تعاون اور قربانی کو بھی جہاد کہا گیا ہے۔ **جہاد بالقتال** ارشاد باری تعالی ہے: ﴿قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ﴾ سورۃ البقرہ:۱۹۰" اللہ کی راہ میں ان سے جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں۔ یہاں جہاد قتال کی شکل میں ہے، مگر وہ بھی دفاعی و شرعی اصولوں کے تحت۔

[2]**جہاد بالنفس** نبی ﷺ کا فرمان ہے: "المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله» . مسند احمد، حدیث:۲۳۹۵۸" مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے خلاف اللہ کی اطاعت میں جہاد کرے۔ **جہاد باللسان** نبی ﷺ کا فرمان ہے:"" جاهدوا المشركين بأموالكم وأنفسكم وألسنتكم" سنن ابوداؤد، حدیث: ۲۵۰۴۔ مشرکوں سے اپنے مال، جان اور زبان کے ذریعے جہاد کرو۔ **جہاد بالوالدین** ایک شخص نے پوچھا: "یارسول اللہ! کیا میں جہاد میں جاؤں؟" آپ ﷺ نے فرمایا: «ففيهما فجاهد» صحیح بخاری، حدیث:۳۰۰۴۔ اپنے والدین کی خدمت میں جہاد کرو۔ اس سے واضح ہے کہ جہاد کا مطلب ہمیشہ قتال نہیں ہوتا، بلکہ نیکی اور اطاعت میں کوشش بھی جہاد ہے۔ سنتِ نبوی میں نفس، زبان، مال، اور والدین کی خدمت کو بھی جہاد کہا گیا۔

امام ابن القیم عِشْلِیہِ جہاد کی چار اقسام بیان کی ہیں:

"فَالْجِهَادُ أَرْبَعُ مَرَاتِبَ: جِهَادُ النَّفْسِ، وَجِهَادُ الشَّيْطَانِ، وَجِهَادُ الْكُفَّارِ، وَجِهَادُ الْمُنَافِقِينَ"[1] .

جہاد کی چار اقسام ہیں: نفس، شیطان، کفار اور منافقین کے خلاف جہاد۔

اسلام میں جہاد مقدس جنگ نہیں بلکہ اخلاقی، فکری اور روحانی جدوجہد کا جامع تصور ہے، جو عدل، امن اور ظلم کے خاتمے کے لیے کی جاتی ہے، نہ کہ طاقت کے مظاہرے کے لیے۔ "ہولی وار" (Holy War) کا تصور عیسائی مذہب کی صلیبی جنگوں سے ماخوذ ہے، جسے مغربی مستشرقین نے غلط طور پر اسلامی جہاد کے مساوی قرار دیا۔

جہاد اور انتہا پسندی

جہاد سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنی جسمانی، ذہنی، مالی اور جانی صلاحیتوں کو اللہ کی رضا کے لیے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں لگادے۔ دوسرے لفظوں میں، بندے کا اپنی تمام ظاہری و باطنی توانائیوں اور قابلیتوں کو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کے لیے اللہ کی راہ میں صرف کرنا ہی جہاد کہلاتا ہے۔

جہاد وہ سماجی و اخلاقی قوت ہے جو ظلم کا خاتمہ اور عدل کے نفاذ کے لیے رکھی گئی ہے، مگر جب اس میں غلو یا انتہا پسندی شامل ہو جاتی ہے تو یہ رحمت کے بجائے مصیبت بن جاتی ہے۔ جہاد کا حقیقی ربط شریعت کے نظام، نیت کی خلوص اور واضح شرعی ضوابط سے ہے۔ نہ کہ تشدد، ذاتی انتقام یا فرقہ وارانہ فتنہ انگیزی سے۔ علماءِ اسلام نے بارہا واضح کیا کہ جہاد کا مقصد بگاڑ پھیلانا نہیں بلکہ امن قائم کرنا، مظلوم کا دفاع اور ناانصافی کا خاتمہ ہے؛ جو لوگ اسے اپنے سیاسی یا گروہی مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں وہ دراصل شریعت کے اصولوں کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ اسلام نے جہاد کو اخلاق، عدل اور انسانی وقار کے دائرے میں محدود رکھا ہے، لہٰذا جہاد اور انتہا پسندی کے درمیان فرق قائم رکھنا امت کی دینی و فکری سلامتی کے لیے لازم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف اعتدال، بصیرت اور مشروع قیادت کے تحت انجام پانے والا جہاد ہی حقیقی، جائز اور فی سبیل اللہ سمجھا جاتا ہے۔

جہاد کے اِس جامع اور وسیع مفہوم کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں جہاد کا حکم سب سے پہلے شہرِ مکہ میں اُس وقت نازل ہوا جب کہ ابھی جہاد بالسیف کی اجازت بھی نہیں ملی تھی۔ صحابہ کرام پر جبر و تشدد کے پہاڑ ڈھائے جاتے مگر انہیں اپنے ذاتی دفاع کے لیے بھی ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ اُنہیں اُس وقت تک صبر کرنے کی تلقین کی گئی جب تک اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے ہجرت کی صورت میں نجات کی سبیل پیدا نہ فرمادی۔ دفاعی جنگ کی ممانعت کے لیے بھی مکہ معظمہ میں ستّر آیات نازل ہوئیں۔ اس کے باوجود جہاد کے متعلق پانچ آیات مکہ مکرمہ میں نازل ہوئیں۔ امام رازی عِشْلِیہِ (م ۶۰۴ھ) نے آیت ﴿ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ﴾[2] کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں:

---

[1] زاد المعاد في هدى خير العباد، فصل: مراتب الجهاد، ج ۳ ص ۴۵

[2] رازی، التفسیر الکبیر، ۲۳:۳۵

"وَهِيَ أَوَّلُ آيَةٍ أُذِنَ فِيهَا بِالْقِتَالِ بَعْدَ مَا نُهِيَ عَنْهُ فِي نَيِّفٍ وَسَبْعِينَ آيَةً" (1)

امرِ قتال کے اِمتناع میں ستّر سے زائد آیات کے نزول کے بعد یہ پہلی آیت تھی جس میں قتال کی اِجازت دی گئی۔

اگر جہاد کا معنی قتال اور مسلح تصادم (Armed Conflict) ہی ہوتا تو مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی درج ذیل آیات کی کیا توجیہ ہوگی جن میں صراحتاً 'جہاد' کا حکم دیا گیا ہے؟ یہ آیات ہجرت سے پہلے مکی دور میں نازل ہوئیں جب اپنے دفاع میں بھی ہتھیار اٹھانے کی سختی سے ممانعت تھی اور کسی لڑائی یا مزاحمت کی اِجازت بھی نہ تھی اور نہ اُس دور میں مسلمانوں نے عملاً کوئی جنگ لڑی۔ اگر جہاد کا معنی لڑنا ہی ہوتا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یقیناً ہتھیار اٹھاتے اور اپنی حفاظت اور دفاع میں کفار و مشرکینِ مکہ کے خلاف جنگ کرتے۔ لیکن ان میں سے کسی کو اس کی اجازت نہ تھی جب کہ جہاد کے لیے پانچ آیات بھی نازل ہو چکی تھیں۔

اس کا درست جواب یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے جہاد کے لیے مسلح تصادم اور کشمکش کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر ہر حکمِ جہاد کے لیے مسلح تصادم ناگزیر ہوتا تو مکہ میں لفظ جہاد پر مشتمل پانچ آیات کے نزول کے بعد ذاتی دفاع کے لیے مسلح جنگ کی اِجازت مل چکی ہوتی حالانکہ ایسا نہیں ہوا تھا۔ اِس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لفظ جہاد کے مسلح لڑائی کے علاوہ کئی اور معانی و مفاہیم بھی ہیں جو کہ مکہ میں نازل ہونے والی درج ذیل آیات سے مستنبط ہوتے ہیں:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴾[2] -

پس (اے مردِ مومن!) تو کافروں کا کہنا نہ مان اور تو اس (قرآن کی دعوت اور دلائل) کے ذریعے ان کے ساتھ بڑا جہاد کر۔ اِس آیت میں بڑے جہاد سے مراد علم و فکر اور فروغِ شعور کی جدوجہد (Jihad for promotion of knowledge and awareness) ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ﴾[3] -جو شخص (راہِ حق میں) جدوجہد کرتا ہے وہ اپنے ہی (نفع کے) لیے تگ و دو کرتا ہے، بے شک اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

یہاں پر جہاد سے مراد اَخلاقی اور روحانی ترقی (Moral and spiritul uplift) کے لیے جدوجہد ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا ﴾[4] -

---

(1) سورۃ الحج: ۳۹

(2) الفرقان، ۲۵: ۵۲

(3) العنکبوت، ۲۹: ۸

(4) لقمان: ۱۵

اور اگر وہ تجھ پر (یہ) کوشش کریں کہ تو میرے ساتھ اس چیز کو شریک ٹھہرائے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں تو ان کی اِطاعت مت کر۔

سورۃ العنکبوت کی اس آیت میں جہاد سے مراد کسی بھی قسم کی علمی، فکری، نظریاتی یا اعتقادی کوشش (intellectual or idealogical effort) ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾[1]۔

اور جو لوگ ہمارے راستے میں جہاد کرتے ہیں ہم یقیناً انہیں ہدایت کی راہیں دکھا دیں گے، اور بے شک اللہ احسان کرنے والوں کو اپنی رہنمائی اور کرم سے نوازتا ہے۔

مکہ میں نازل ہونے والی اِس آیت مبارکہ میں اپنی زندگی میں اَخلاقی، روحانی اور اِنسانی اَقدار کو زندہ کرنے اور اُنہیں مزید ترقی و اِستحکام دینے کی جدوجہد کو جہاد کا نام دیا گیا ہے۔

اس مقدس آیت میں بھی جہاد کو علمی، ذہنی، فکری اور اعتقادی سطح پر کی جانے والی جدوجہد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مکی دور کی جو پانچ آیات جہاد کی تلقین کرتی ہیں اگر ان کے شان نزول، تاریخی پس منظر اور سیاق وسباق کا مطالعہ کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ جہاد کا مطلب محض تلوار یا بندوق اٹھا کر لڑائی شروع کرنا نہیں بلکہ اس کے متعدد پہلو ہیں: علم و شعور کی تبلیغ، روحانی و اخلاقی بلندی، فکری و اجتماعی اصلاح کی کوششیں، اور سماجی فلاح و بہبود کے لیے خرچ و انفاق۔ البتہ جب آپ پر جارحیت مسلط کی جائے تو اپنی حفاظت اور دفاع کے لیے جنگ کرنا جائز ہے۔ دفاعی جنگ وہی ہے جسے بین الاقوامی قوانین اور اقوامِ متحدہ بھی جائز سمجھتے ہیں، اور ہر قوم و ملک کو اپنی حفاظت کا حق حاصل ہے۔

اس سے سمجھی جاسکتی ہے کہ جب چھتیس آیاتِ جہاد میں سے صرف چار آیات کا اپنے سیاق وسباق کے تناظر میں قتال سے تعلق (contextual link) ہے اور باقی بتیس آیات کا سیاق وسباق میں بھی قتال سے کوئی تعلق نہیں، تو پھر لفظِ جہاد کو ہمیشہ اور ہر جگہ قتال کے معنی میں کیوں لیا جاتا ہے؟ یہ جہاد کا بالکل غلط تصور ہے جو قرآن اور اِسلام کی واضح منشا کے سراسر خلاف ہے۔

ایک اہم بات اِس حوالے سے یہ ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سورۃ التوبۃ مدینہ طیبہ میں نازل ہونے والی اُن آخری سورتوں میں سے ہے جو اہلِ مکہ کی طرف سے معاہدہِ اَمن (Treaty of peace) توڑنے کے بعد نازل ہوئی۔ اِس معاہدہ شکنی کے بعد ﴿ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ ﴾[2]۔ فرما کر باقاعدہ تنسیخِ معاہدہ (Cancellation of treaty) کا اِعلان کر دیا گیا تھا۔ اِس طرح ریاستِ مکہ اور ریاستِ مدینہ دونوں پھر سے حالتِ جنگ (state of war) کی طرف لوٹ آئیں۔ لہٰذا سورۃ التوبۃ کی یہ

---

[1] العنکبوت، ۲۹:۶۹

[2] التوبۃ، ۹:۱

آیات -جن میں آیۃ السیف بھی شامل ہے- حقیقت میں مشرکینِ مکہ کی طرف سے عہد شکنی کے بعد اختتام معاہدہ کا اعلان و اظہار تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اعلانِ نبوت کے بعد تیرہ سال مکہ میں گزارے۔ مسلمان مکہ میں بہت کمزور اَقلیت تھے۔ مکہ کے اِس پورے دور میں مسلمانوں کو ظلم و ستم، جبر و تشدد، وحشت و بربریت اور دہشت گردی کا نشانہ بنایا گیا۔ اس تمام تر ناانصافی اور جارحیت کے باوجود مسلمانوں کو اپنی حفاظت اور دفاع کے لیے بھی ہتھیار اُٹھانے کی اجازت نہیں تھی۔ پیغمبرِ اسلام اور آپ ﷺ کے پیروکاروں کو مزاحمت کی بجائے صبر و تحمل کا حکم تھا۔ ہجرت کے بعد بدر، اُحد اور خندق جیسے غزوات بھی محض دفاعی تھے۔ کیوں یہ تمام جنگیں شہر مدینہ کی حدود میں یا اس کے جوار میں لڑی گئیں۔ حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ کے محض دفاعی پوزیشن پر ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اِن تمام جنگوں میں جب دشمن مسلمانوں پر حملہ آور ہوتا تو مسلمان مدینہ کے بارڈرز یا شہر مدینہ کے اندر محصور ہو کر دفاع کرتے۔ یا شہر مدینہ سے باہر نکل کر اپنی طرف ہونے والی جارحانہ پیش قدمی کو روکنے کے لیے لڑے۔ ان میں سے ایک جنگ بھی شہر مکہ کے بارڈرز پر نہیں لڑی گئی۔

تکفیر اور جہاد

انتہا پسندوں نے قرآن و حدیث کے بعض الفاظ اور اصطلاحات کو غلط انداز میں استعمال کیا ہے۔ وہ قرآن کی چند آیات اور احادیث کو ان کے شانِ نزول اور تاریخی و واقعاتی پس منظر سے کاٹ کر اپنی انتہا پسندانہ تشریحات پیش کرتے ہیں۔ جہالت، خود غرضی اور غلط مقاصد کے تحت یہ لوگ جہاد، شہادت، خلافت، دارالحرب اور دارالاسلام جیسی اصطلاحات کو بے محل استعمال کر کے عام مسلمانوں، خصوصاً نوجوانوں کو گمراہ کرتے ہیں، اور یہ باور کراتے ہیں کہ ان کے نظریات قرآن و سنت سے ماخوذ ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں ان کا یہ رویہ اسلام پر ایک سنگین الزام ہے، کیونکہ ان کے نظریات اور اسلام کی اصل تعلیمات کے درمیان کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی۔

اہل تکفیر جہاد سے متعلق بھی شبہات کا شکار ہیں۔ مسلمان، حکام اور معاشروں کے خلاف مسلح ہو کر انہیں قتل کرنا جہاد او شرعی قتال سمجھتے ہیں۔ اور وہ آیات جہاد و قتال جو کفار اور مشرکین کے زمرے میں نازل ہوئی ہیں انہیں مسلمان حکام اور محکومین پر چسپاں کرنے کی مذموم سعی کرتے ہیں ان کی نظر میں وہ جہاد اسلامی کے اپنے مالی معاشروں کو انسانی معاشروں میں تبدیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قبل اس کے کہ ان لوگوں کی جہاد سے متعلقہ باطل تعبیرات و تشریحات نہیں کی جائیں۔ جہاد کا حقیقی معنی و مفہوم بیان کرنا ضروری ہے۔

جہاد کا مفہوم جو تمام لوگوں نے کیا ہے وہ علائے کلمتہ اللہ کا دفاع اور اس کے غلبے کی کوشش ہے اور یہ کوششیں اس وقت سے جاری ہیں جب سے انسان کا وجود اس زمین پر ہے۔ جہاد کا بنیادی مقصد دین کو قائم کرنا اور توحید کے پرچم کو بند کرنا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

﴿ وقتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله ﴾[1]-

[1] البقرہ ۲:۱۹۳

اور تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔

فتنہ کو دور کرنے اور شرک کو مٹانے کے لئے قتال فرض ہے اور جب مال فتنہ پیدا کرنے اور اس کا کوئی جائز مقصد نہ ہو تو وہ شرعا اور عقلا ممنوع ہے۔

قرآن و حدیث میں جنگی اصول و قواعد کو وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے جن کے تحت غیر حربی کافروں ,مشرکوں، معاہدین، مستامنین، سفیروں، سیاحوں اور زمیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ یہ گروہ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر ۵ جسے آیۃ السیف بھی کہا جاتا ہے سے بھی غلط استدلال کرتے ہوئے تمام قسم کے مشرکین کو قتل کرنا جائز قرار دیتے ہیں اور وہ لکھتے ہیں کہ اس آیت سے مشرکین کو معاف کرنے والی، ان سے اعراض کرنے والی اور تمام قسم کے عہد وپیمان والی آیات منسوخ ہو چکی ہیں۔ اب نہ ان سے کوئی گفت وشنید ہو سکتی ہے اور نہ ہی کوئی عہد وپیمان۔

فقہی و دینی معاملات میں انتہاپسندی کا رجحان امتِ مسلمہ کے فکری و عملی توازن کو متاثر کرتا ہے۔ بعض افراد اپنے مسلکی یا فقہی موقف کو حرفِ آخر سمجھ کر دوسروں کی آراء کو باطل قرار دیتے ہیں، حالانکہ اختلافِ رائے دین کا ایک فطری اور علمی پہلو ہے۔ ایسے رویّے سے نہ صرف امت میں تقسیم پیدا ہوتی ہے بلکہ برداشت اور رواداری کا جذبہ بھی کمزور پڑ جاتا ہے۔ جب دین کے ظاہری پہلوؤں کو اصل مقصد سے بڑھا دیا جائے اور روحِ دین یعنی عدل، احسان اور آسانی کو پس پشت ڈال دیا جائے تو یہ انتہاپسندی کی علامت بن جاتی ہے۔ اسلامی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جب بھی امت نے اعتدال چھوڑا، فکری جمود اور تعصّب نے جنم لیا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی و فقہی معاملات میں وسعتِ نظر، علم و دلیل پر مبنی گفتگو اور احترامِ اختلاف کو فروغ دیا جائے۔ اسی سے دین کی جامعیت، امت کی وحدت اور معاشرتی ہم آہنگی برقرار رہ سکتی ہے۔

فصل چہارم
معاشرتی اور معاشی معاملات میں عدم توازن

فصل چہارم

معاشرتی اور معاشی معاملات میں عدم توازن

معاشرتی تعلقات میں انتہا پسندی

معاشرتی تعلقات میں انتہا پسندی اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب انسان تعلقات میں اعتدال کو ترک کر دے اور افراط و تفریط کا شکار ہو جائے۔ مثال کے طور پر، کسی سے ضرورت سے زیادہ محبت یا بے جا نفرت رکھنا، رشتہ داروں اور اہلِ خانہ کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا، یا معمولی اختلافات پر دشمنی پالنا۔ اس طرح کا رویہ نہ صرف فرد کی زندگی کو متاثر کرتا ہے بلکہ پورے معاشرے میں بگاڑ، فساد اور انتشار پیدا کرتا ہے، کیونکہ ضرورت سے زیادہ وابستگی انسان کو غیر ضروری مشغولیت میں ڈال دیتی ہے اور مکمل قطع تعلقی انسانیت کے اصولوں کے منافی ہے۔

نبی کریم ﷺ کی سیرت، خلفائے راشدین کا حکمرانی کا طریقہ، صحابہ کرام کا باہمی تعلق اور سلف صالحین کے اقوال و افعال معاشرتی اعتدال کی روشن مثالیں ہیں۔ یہ توازن ہر فرد کو دوسرے کا محافظ، ہمدرد اور خیر خواہ بناتا ہے، اور پورا معاشرہ ایک مربوط اور متوازن نظام کی مانند کام کرتا ہے، جہاں اگر ایک رکن کو تکلیف پہنچے تو پورا نظام متاثر ہوتا ہے۔ اسلام نے ایسے افراط و تفریط والے رویوں کو انتہا پسندی اور غلو قرار دیا اور واضح طور پر ان سے بچنے کی تلقین کی، جبکہ میانہ روی اور اعتدال کو بہترین راستہ قرار دیا۔

چونکہ انسان فطرتاً اجتماعی زندگی گزارنے والا ہے، اس لیے وہ اپنے روزمرہ کے معاملات میں رشتہ داروں، ہمسایوں، دوستوں، شریکِ حیات، والدین، اولاد، بزرگوں اور سماج کے دیگر طبقات سے جڑا ہوتا ہے۔ یہ تعلقات جذبات، مفادات، قربت و دوری، خوشی و رنج، محبت و نفرت اور تعلق و جدائی کے متوازن امتزاج پر مبنی ہوتے ہیں۔ اگر اس توازن کو برقرار نہ رکھا جائے تو رشتے بوجھل، معاملات پیچیدہ اور معاشرہ ظلم، بدگمانی، نفرت اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ دوسروں کے حقوق کی پامالی، چھوٹی باتوں پر بڑے تنازعات کھڑا کرنا اور ذاتی مفادات کے لیے ظلم کرنا انتہا پسندی کی واضح مثالیں ہیں۔ اسلام نے ان معاشرتی روابط کے لیے ایسے واضح، جامع اور عملی اصول وضع کیے ہیں جو نہ صرف انسان کی فطرت سے ہم آہنگ ہیں بلکہ پورے معاشرے کو ایک مربوط اور متوازن نظام میں بدل دیتے ہیں، جس سے فرد و معاشرہ دونوں کی بھلائی ممکن ہوتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾[1]۔

اور رشتہ دار کو اس کا حق دو، اور مسکین کو اور مسافر کو بھی، اور فضول خرچی نہ کرو۔

---

[1] الإسراء:۲۶

یہ آیت معاشرتی توازن اور عدل کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہے، جس میں افراد کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ اپنے تمام رشتہ داروں کے حقوق ادا کریں، خواہ وہ والدین ہوں، اولاد، بہن بھائی یا دیگر قریبی عزیز۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان کسی ایک رشتے کو ترجیح دے کر دوسرے کو نظر انداز کرے، بلکہ ہر تعلق کے حقوق کو ان کے درجے اور ضرورت کے مطابق پورا کرے۔ حقیقی عدل یہ ہے کہ محبت، احترام اور ذمہ داری میں توازن قائم رکھا جائے تاکہ کسی ایک رشتے کی زیادتی دوسرے کے حق میں کمی کا باعث نہ بنے۔

مثال کے طور پر، ایک شخص اگر والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرے تو یہ عمل اس کی شریکِ حیات یا اولاد کے حقوق پر اثر انداز نہ ہو، بلکہ ہر تعلق میں انصاف، اعتدال اور خیر خواہی کا رویہ برقرار رہے۔ اسی طرح بھائی بہنوں کے درمیان تعلقات میں بھی محبت اور احترام کا ایسا توازن قائم رہے جو نہ حسد پیدا کرے اور نہ دوری۔

مزید یہ کہ آیت میں مسکین اور مسافر کا ذکر اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ عدل اور توازن صرف خاندان تک محدود نہیں، بلکہ معاشرے کے تمام افراد تک پھیلنا چاہیے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ حسنِ سلوک صرف اخلاقی فریضہ نہیں بلکہ ایک سماجی ذمہ داری بھی ہے۔ ساتھ ہی، فضول خرچی سے بچنے اور وسائل کو درست طریقے سے خرچ کرنے کی ہدایت دی گئی ہے تاکہ انسان اپنی نعمتوں کو دوسروں کے حقوق کی ادائیگی میں استعمال کرے، اور یوں ایک منصف، متوازن اور رحمت پر مبنی معاشرہ تشکیل پائے۔

امام طبری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"فِيهِ دَلَالَةٌ عَلَى وُجُوبِ الْوَسَطِيَّةِ فِي الْمُعَامَلَاتِ مَعَ الْأَقَارِبِ، فَلَا غُلُوَّ بِالتَّبْذِيرِ وَلَا تَفْرِيطَ بِالْقَطِيعَةِ"[1]

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات میں میانہ روی ضروری ہے، نہ بے جا خرچ کرنا غلو ہے اور نہ قطع رحمی جائز ہے۔

یہ آیت اس بات کی طرف واضح اشارہ کرتی ہے کہ معاشرتی تعلقات میں توازن قائم رکھنے کے لیے انسان کو اپنے وسائل کے استعمال میں فضول خرچی سے بچنا چاہیے اور رشتہ داروں کے ساتھ انصاف و اعتدال سے پیش آنا چاہیے۔ اصل مقصد یہ نہیں کہ جذبات کو دبایا جائے یا رشتوں کو نظر انداز کر دیا جائے، بلکہ ہر رشتے کو اُس کے حقیقی مقام پر رکھا جائے اور ہر حق دار کو اس کا حق مناسب انداز میں دیا جائے — نہ کسی طرف زیادتی ہو اور نہ کسی طرف کوتاہی۔

اعتدال کا مفہوم یہ ہے کہ تعلقات میں نیت و طریقہ درست رکھے جائیں؛ محبت ایسی ہو جو فرائضِ اخلاق اور عدل کو نہ چھوڑ دے، اور نفرت ایسی نہ ہو کہ انصاف قلب و عمل سے غائب ہو جائے۔ اس طرح ہر عمل میں میانہ روی

---

[1] تفسیر الطبری، ج۱۵، ص۴۶

اختیار کرنے سے نہ صرف رشتوں کی قوت برقرار رہتی ہے بلکہ فرد کی ذاتی اور سماجی ذمہ داریاں بھی محفوظ رہتی ہیں۔

معاشرتی اعتدال صرف مالی تقسیم تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ اخلاقی، جذباتی اور سماجی رویّوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک متوازن معاشرہ وہ ہے جہاں ہر انسان کی عزتِ نفس اور بنیادی حقوق کا تحفظ ہو—چاہے معاملہ گھر کے اندر وسائل کی منصفانہ تقسیم ہو یا باہمی سلوک میں احترام اور تمیز کا معاملہ۔

قرآنِ کریم کی ہدایت یہ بھی ہے کہ حتیٰ الامکان انصاف پر قائم رہا جائے، یہاں تک کہ اگر معاملہ والدین یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف گواہی دینے کا بھی ہو تو حق و انصاف کو رُوئی کر بیٹھنا چاہیے۔ محبت و تعلق میں حد سے بڑھ جانا درست نہیں؛ اصل فلاح اسی میں ہے کہ تعلقات کو انصاف، اعتدال اور مروت کے ساتھ نبھا کر ایک مربوط اور باوقار معاشرہ قائم کیا جائے۔، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ﴾[1]

اے ایمان والو! انصاف پر ثابت قدم رہو اور اللہ کے نام پر گواہی دو—چاہے گواہی تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ ہو، خواہ وہ والدین یا رشتہ دار ہی کیوں ہوں۔

اس آیت سے واضح ہے کہ رشتہ داری یا خاندانی تعلق انصاف اور حق کے مقابلے میں نہیں ہونا چاہیے، ورنہ یہ انتہا پسندی ہے۔ اسی طرح قرآن نے آباء واجداد کی اندھی تقلید کو جاہلانہ روش قرار دیا ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا﴾[2]۔

جب انہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ ہدایات پر عمل کرو، وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو پایا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ خاندان یا قریبی رشتہ داروں کی اندھی تقلید بھی انتہا پسندی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے بھی عصبیت کو جاہلیت کی علامت کہا اور خبردار کیا کہ جو شخص رشتہ داری کے نام پر باطل کی حمایت کرے اس کی موت جاہلی موت ہے۔ حضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ قُتِلَ تَحْتَ رَايَةٍ عُمِّيَّةٍ، يَدْعُو عَصَبِيَّةً أَوْ يَنْصُرُ عَصَبِيَّةً، فَقُتِلَ، فَقِتْلَةٌ جَاهِلِيَّةٌ))[3]۔

---

[1] النساء:۱۳۵

[2] سورۃ لقمان:۲۱

[3] صحیح مسلم،:۱۸۴۸

جو شخص کسی جاہلانہ جھنڈے تلے لڑا، عصبیت کی دعوت دی یا عصبیت کی مدد کی اور اس پر قتل ہوا، تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

یہ حدیث نہایت جامع انداز میں ہمیں یہ تعلیم دیتی ہے کہ اسلام میں ہر قسم کی لڑائی، جھگڑا یا قتال صرف اسی وقت جائز ہے جب وہ اللہ کے دین کی سربلندی، ظلم کے خاتمے اور عدل کے قیام کے لیے ہو۔ اگر کوئی شخص ذاتی مفاد، قوم پرستی، لسانی یا خاندانی تعصب کی بنیاد پر لڑتا ہے تو وہ دراصل اسلام کے مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے واضح فرمایا کہ جو شخص جاہلی تعصب کے جھنڈے تلے لڑے یا اس کی حمایت کرے اور اس میں مارا جائے، اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

یہ تعلیم دراصل رشتہ داریوں اور معاشرتی تعلقات میں پائے جانے والے غلو اور انتہا پسندی سے بھی خبردار کرتی ہے۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسان اپنے قبیلے، خاندان یا گروہ کے حق میں اندھا تعصب اختیار کرے، بلکہ اسے عدل و حق کی بنیاد پر تعلقات نبھانے کا حکم دیتا ہے۔ حقیقی ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ انسان انصاف پر قائم رہے، چاہے فیصلہ اپنے خلاف یا قریبی رشتہ دار کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ یوں یہ حدیث ہمیں یاد دلاتی ہے کہ ایمان کا اصل معیار محبت یا دشمنی میں اعتدال اور عدل کو برقرار رکھنا ہے، تاکہ امتِ مسلمہ میں وحدت، توازن اور اخوت قائم رہ سکے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

"مَن والى قَرابته في الباطل وعادى في الحق فقد ترك ما أمر الله به من العدل والإحسان، واتبع الهوى والعصبية"[1]۔

جو شخص اپنے رشتہ داروں کی مدد باطل میں کرے اور حق کے معاملے میں دشمنی کرے، اس نے اللہ کے حکم عدل و احسان کو چھوڑ دیا اور خواہش پرستی اور عصبیت کی پیروی کی۔

امام غزالی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"إفراط المحبة للأولاد والأهل قد يحمل على الحرام، ومن ذلك تقديم رضاهم على رضا الله"[2]۔

اولاد اور اہل خانہ کی محبت میں افراط انسان کو حرام پر مجبور کر سکتی ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ان کی رضا کو اللہ کی رضا پر مقدم کر دیتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاد اور گھر والوں سے حد سے زیادہ محبت بعض اوقات انسان کو غلط راستے پر لے جا سکتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے بیوی، بچوں یا خاندان کی خوشنودی کو اللہ کی رضا پر مقدم کر لیتا ہے تو وہ گناہ میں پڑ جاتا

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۸ ص ۲۶

[2] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج ۳ ص ۴۷

ہے۔ اسلام نے محبت اور حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے، لیکن یہ محبت اس حد تک نہ ہو کہ اللہ کے احکام کو توڑ دیا جائے۔ حقیقی مؤمن وہ ہے جو اللہ کی رضا کو سب سے مقدم رکھے اور اپنے گھر والوں کی محبت کو بھی اسی دائرے میں رکھے جو دین نے مقرر کیا ہے۔ اس طرح انسان دنیا اور آخرت دونوں میں کامیاب رہتا ہے۔

ازدواجی زندگی میں اعتدال

نبی کریم ﷺ نے ازدواجی زندگی میں عدل، محبت، نرمی اور اعتدال کا جو بے مثال نمونہ پیش فرمایا، وہ تمام انسانیت کے لیے کامل رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ آپ ﷺ کا طرزِ عمل یہ واضح کرتا ہے کہ کامیاب ازدواجی زندگی نہ سختی اور غصے سے بنتی ہے، نہ ہی لاپرواہی اور بے توجہی سے، بلکہ باہمی احترام، سمجھ داری، اور محبت سے پروان چڑھتی ہے۔ آپ ﷺ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ نہایت شفقت، خوش اخلاقی اور انصاف سے پیش آتے، ان کی دلجوئی کرتے اور ان کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ آپ کی سنت ہمیں سکھاتی ہے کہ ازدواجی تعلقات میں اعتدال کا مطلب ہے کہ انسان نہ اپنی خواہشات میں حد سے بڑھے اور نہ دوسرے کے حقوق کو نظر انداز کرے، بلکہ محبت، حلم اور عدل کے ساتھ زندگی بسر کرے — یہی حقیقی سنتِ نبوی اور گھریلو سکون کا راز ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي))[1]۔

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہلِ خانہ کے لیے بہتر ہو، اور میں تم سب میں اپنے اہل کے لیے سب سے بہتر ہوں۔

اس حدیث سے ہمیں یہ تعلیم ملتی ہے کہ ازدواجی زندگی میں کامیابی کا راز سختی یا زیادتی میں نہیں، بلکہ توازن، نرمی، اور باہمی احترام میں پوشیدہ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے عمل سے واضح فرمایا کہ حقیقی محبت وہ ہے جو عدل اور ذمہ داری کے ساتھ نبھائی جائے۔ ازدواجی تعلق میں نہ اپنی خواہشات کو حد سے بڑھانا درست ہے، نہ ہی دوسرے کے حقوق کو نظر انداز کرنا۔ آپ ﷺ کا طرزِ عمل ہمیں سکھاتا ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں ایک دوسرے کے لیے سکون و رحمت کا ذریعہ بنیں، ایک دوسرے کی کمزوریوں کو برداشت کریں اور خوشی و غم میں ایک دوسرے کا سہارا بنیں۔ یوں یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ جب تعلقات اخلاص، عدل، اور محبت پر قائم ہوں تو گھر امن، محبت، اور رحمت کا گہوارہ بن جاتا ہے — جیسا کہ نبی ﷺ کا گھر بہترین مثال ہے۔

---

[1] سنن ابن ماجہ: کتاب النکاح، باب حسن معاشرۃ النساء، حدیث: ۱۹۷۷

معلوم ہوا کوئی بھی دینی معاملہ ہو عبادات سے متعلق ہو یا طاعات سے اس میں شریعت کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے، جیسا کہ تین صحابیوں کا واقعہ اوپر گزرا کہ آپ ﷺ نے انہیں عبادات میں افراط سے منع کیا کیونکہ اس میں انتہا پسندی کی طرف رجحان ہو رہا تھا۔

انسان جب انتہا پسندی کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ رفتہ رفتہ ان تمام حقوق کی ادائیگی سے دور ہوتا جاتا ہے جو اس کے ذمے ہوتے ہیں اس لیے شرعاً ایسے طرز عمل کے اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے :

قَالَ: كُنَّا نَغْزُو مَعَ النَّبِيِّ ﷺ لَيْسَ لَنَا نِسَاءٌ، فَقُلْنَا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، أَلاَ نَسْتَخْصِي؟ فَنَهَانَا عَنْ ذَلِكَ[1]۔

کہ ہم رسول ﷺ کے ہمراہ جہاد کرتے تھے، اس وقت ہماری بیویاں نہ تھیں، تو ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ اجازت دیتے ہیں کہ ہم خصی ہو جائیں، تو آپ ﷺ نے اس سے ہمیں منع فرمایا۔

چونکہ یہ ایک شدت پر مبنی انتہائی قدم تھا اس لیے آپ ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس حدیث میں جو نہی بیان ہوئی ہے وہ وہ تحریمی ہے یعنی یہ قدم اٹھانا حرام ہے۔ کیونکہ اس میں بہت سے نقصانات اور مفاسد ہیں ، مثلا اپنی جان کو اذیت میں مبتلا کرنا، ضرر کی وجہ سے ہلاکت کا خطرہ، قوت مردانہ کا خاتمہ، اللہ کی تخلیق میں تبدیلی ، اور نعمت کا انکار اس لیے کہ اللہ تعالی نے مرد کے روپ میں پیدا کر کے انعام عظیم کیا جب یہ صلاحیت زائل کر دی جائے گی تو عورتوں سے مشابہت ہو گی اور نیز ایک کمال والی حالت سے نقص والی حالت کا اختیار کرنا۔ ان وجوہ سے آپ ﷺ نے خصی ہونے سے منع فرمایا۔[2]۔

احادیثِ مبارکہ میں متعدد مثالیں ملتی ہیں جہاں نبی کریم ﷺ نے غلو اور انتہا پسندی کے آثار ظاہر ہوتے ہی اس سے فوراً منع فرمایا۔ لہٰذا دینی تعلیم و تربیت اور وعظ و نصیحت کے مواقع پر ان روایات کو نہ صرف وضاحت سے بیان کرنا چاہیے بلکہ موجودہ حالات پر ان کا اطلاق کر کے درست فکری رہنمائی بھی کرنی چاہیے۔ یہ بات ذہن نشین کرانا ضروری ہے کہ وہی عمل شرعاً باعثِ اجر و ثواب ہے جو اسلامی تعلیمات کے مطابق ہو، جبکہ حدودِ شریعت سے تجاوز کرنے والا ہر عمل شدت پسندی کے زمرے میں آتا ہے، جو قابلِ مذمت ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، ج۷، ص۴

[2] العسقلانی، فتح الباری شرح صحیح البخاری، ج۹، ص۱۱۹

بیوی کے ساتھ تعلق میں انتہا پسندی مختلف صورتوں میں ظاہر ہو سکتی ہے، جن میں توازن اور اعتدال کا فقدان ہوتا ہے۔چند نمایاں صورتیں یہ ہیں:

زیادتی اور ظلم: بیوی کے حقوق نہ دینا، اس پر تشدد کرنا یا اس کی جائز ضروریات کو نظر انداز کرنا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا...﴾[1]۔

اے ایمان والو! عورتوں کو زبردستی میراث کا حق وارث نہ سمجھو۔

اس آیت کا مطلب واضح کرتا ہے کہ عورتوں کے ساتھ ظلم، جبراً حق سے محروم کرنا اور ان کی حق تلفی قرآن کے خلاف ہے۔ابن کثیر رحمہ اللہ یوں نقل کرتے ہیں:

" وكان الرجل إذا مات وترك جارية، ألقى عليها حميمه ثوبه، فورث نكاحها، فإن شاء تزوجها بغير صداق، وإن شاء زوجها غيره وأخذ صداقها، فنهوا عن ذلك...[2] -

جاہلیت میں جب کوئی شخص فوت ہو جاتا اور اس کی بیوی یا کنیز ہوتی، تو اس کا کوئی قریبی (ولی یا وارث) اس پر اپنی چادر ڈال دیتا تھا اور یوں وہ عورت اس کے نکاح میں آجاتی۔اگر چاہتا تو بغیر مہر کے خود اس سے نکاح کر لیتا اور اگر چاہتا تو کسی دوسرے سے اس کی شادی کر دیتا اور اس کا مہر خود لے لیتا۔ اس آیت کے ذریعے اس عمل سے منع کر دیا گیا۔

امام الطبری رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں:

"وذلك أن رجالاً من أهل المدينة كان إذا مات حميم أحدهم ألقى ثوبه على امرأته، فورث نكاحها، فلم ينكحها أحد غيره، وحبسها عنده حتى تفتدي منه بفدية، فأنزل الله ..." [3]۔

اہلِ مدینہ میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی مرد فوت ہو جاتا تو اس کا قریبی رشتہ دار اس کی بیوی پر اپنی چادر ڈال دیتا اور یوں اس کے نکاح کا وارث بن جاتا۔ پھر کوئی اور اس سے نکاح نہ کرتا۔اگر وہ عورت خوبصورت ہوتی تو اس سے نکاح کر لیتا اور اگر بدنما ہوتی تو اسے قید میں رکھتا، حتیٰ کہ وہ مر جاتی اور وہ اس کی میراث کا مالک بن جاتا۔

---

[1] سورۃ النساء:۱۹

[2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص۲۱۳

[3] الطبری،، جامع البیان عن تاویل آي القرآن، ج۸، ص۱۱۷

امام طبری رحمہ اللہ کے مطابق آیت کا نزول اس ظلم کے خلاف ہے جو عورتوں کے ساتھ اس طریقے سے کیا جاتا تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف ان کو وراثت کے لیے "نکاحاً وراثی" کی صورت دی جاتی تھی۔

آنحضرت کا فرمان ہے:((استوصوا بالنساء خیرًا))[1]۔

عورتوں کے ساتھ نیکی اور بھلائی سے معاملہ کرو۔(یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو)۔

امام نووی رحمہ اللہ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"فيه الحثُّ على الإحسان إلى النساء والرفق بهنّ والصبر على عوج أخلاقهنّ، وأن لا يترك موافقتهنّ في كل شيء، بل يراعى الشرع فيما يأمر بهنّ وينهى عنه"[2]۔

اس حدیث میں عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک، نرمی اور ان کے بعض اخلاقی عیوب پر صبر کرنے کی ترغیب ہے۔ نیز یہ کہ ہر معاملے میں ان کی پیروی نہ کی جائے، بلکہ شریعت کے دائرے کو ملحوظ رکھا جائے۔

ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ "معنى استوصوا بهن خيرا" کا مفہوم بیان کرتے ہیں:

"أي اقبلوا وصيتي فيهن واقبلوا وصية من يوصي بخيرهن، وخصّ النساء بالذكر لكثرة ما يقع فيهن من تقصير بحقوقهنّ"[3]۔

یعنی میری وصیت کو قبول کرو اور عورتوں کے بارے میں بھلائی کو لازم پکڑو۔ عورتوں کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ ان کے حقوق میں کوتاہی زیادہ واقع ہوتی ہے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"في هذا الحديث دليل على عظيم حق النساء، ووجوب رعايتهنّ والرفق بهنّ، والقيام بمصالحهنّ، والصبر على ما يكون منهنّ من نقص"[4]۔

---

[1] سنن ابن ماجہ: کتاب النکاح، باب حسن معاشرۃ النساء، حدیث:۱۹۷۷

[2] شرح صحیح مسلم، کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء، حدیث:۱۴۶۸

[3] ابن حجر، فتح الباری شرح صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المداراۃ مع النساء، حدیث:۵۱۸۶

[4] قاضی عیاض، إکمال المعلم بفوائد مسلم، ج۶، ص ۴۰۴

اس حدیث میں عورتوں کے بڑے حق اور ان کی رعایت، ان سے نرمی کرنے، ان کی ضروریات کا خیال رکھنے اور ان میں پائے جانے والے کچھ نقص پر صبر کرنے کی تاکید ہے۔

حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا

((ما ضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم مملوكةً قطُّ ولا امرأةً))[1]۔

نبی ﷺ نے کبھی کسی مملوک (نوکر) یا عورت کو مارا نہیں۔

تمام محدثین و شارحین اس بات پر متفق ہیں کہ اس حدیث میں عورتوں کے ساتھ بھلائی، عدل و انصاف، نرمی، اور ان کے حقوق کی پاسداری کی وصیت ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی تنبیہ ہے کہ عورت کی طبیعت میں بعض کمزوریاں ہیں، اس لیے شوہر کو چاہیے کہ صبر و حکمت سے زندگی گزارے۔

والدین اور اولاد کے حقوق میں توازن

اسلام والدین اور اولاد کے تعلق کو محبت، عدل اور توازن پر قائم رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ جب یہ توازن ختم ہو جائے تو انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔ اسلام نے والدین کے مقام کو بہت بلند رکھا ہے اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک، ادب اور خدمت کو ایمان کا لازمی حصہ قرار دیا ہے۔ والدین کی خوشنودی اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے، اور ان کی دعائیں اولاد کے لیے رحمت و کامیابی کا سبب بنتی ہیں، اس لیے ان کی فرمانبرداری کو نہایت اہم سمجھا گیا ہے۔

تاہم، اسلام نے اطاعتِ والدین کے لیے ایک واضح حد بھی مقرر کی ہے۔ اگر والدین ایسی بات کا حکم دیں جو اللہ یا رسول ﷺ کی تعلیمات کے خلاف ہو، تو اس معاملے میں ان کی بات نہیں مانی جائے گی۔ یہ توازن اسلام کی اعتدال پسند تعلیمات کا مظہر ہے کہ نہ والدین کے حقوق میں کوتاہی برتی جائے اور نہ ان کی اطاعت میں حد سے تجاوز کیا جائے۔

یوں اسلام ایک ایسا متوازن نظام پیش کرتا ہے جو محبت، احترام اور تقویٰ پر قائم ہے۔ والدین کے ساتھ احسان اور خدمت لازم ہیں، لیکن اگر ان کی اطاعت اللہ کی نافرمانی یا شرک کی طرف لے جائے تو یہ انتہا پسندی اور گمراہی ہوگی۔ اسلام اسی اعتدال کو اجاگر کرتا ہے تاکہ خاندان اور معاشرہ دونوں عدل و اعتدال کی بنیاد پر مستحکم رہیں۔، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾[2]۔

[1] سنن ابن ماجہ، کتاب النکاح، باب حسن معاشرۃ النساء، حدیث:۱۹۷۷

[2] سورۃ لقمان:۱۵

اگر وہ شرک پر مجبور کریں تو ان کی اطاعت نہ کرو۔

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اگر والدین تم پر زور دیں کہ تم اللہ کے ساتھ وہ شریک ٹھہراؤ جس کا تمہیں علم نہ ہو، تو اس میں ان کی بات قبول نہ کرو، مگر دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ اچھے سلوک کرنا جاری رکھو۔

علامہ الطبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وإن جاهدك أيها الإنسان، والداك على أن تشرك بي في عبادتك إياي معي غيري، مما لا تعلم أنه لي شريك... فلا تطعهما فيما أراداك عليه من الشرك بي" [1]

اگر والدین تمہیں اللہ کے شریک ٹھہرانے پر مجبور کرتے ہیں — یعنی عبادت یا دینی معاملے میں کوئی اسی جیسے شریک لانے پر اور وہ کام ایسا ہو جس کا تمہیں اللہ کے شریک ہونے کا علم نہ ہو، تو تمہیں ان کی اس بات کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔

عبد الرحمن السعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

" ولا تظن أن هذا داخل في الإحسان إليهما، لأن حق الله، مقدم على حق كل أحد، و "لا طاعة لمخلوق، في معصية الخالق".[2]

یہ حکم والدین کے نیک سلوک سے منافی نہیں، بلکہ یہ واضح حد بتاتا ہے کہ اللہ کا حق ہر شے پر مقدم ہے، اور کوئی مخلوق (والدین سمیت) اللہ کی نافرمانی میں اطاعت کا مستحق نہیں۔

علامہ سعدی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لا طاعةَ لمخلوقٍ في معصيةِ الخالق)) [3]۔

خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" أي إن حرصا عليك كل الحرص على أن تتابعهما على دينهما ، فلا تقبل منهما ذلك ، ولا يمنعنك ذلك من أن تصاحبهما في الدنيا معروفا"[4]۔

---

[1] الطبری، جامع البیان عن تاویل آي القرآن، ج۸، ص ۴۱۲

[2] عبد الرحمن السعدی، تفسیر السعدی، دار السعدی، مؤلفات السعدی، الریاض ج۱، ص ۴۱۲

[3] مسند احمد، حدیث: ۱۰۹۸

[4] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، ج۴، ص ۴۱۲

اگر وہ (والدین) پوری کوشش اور بھرپور اصرار کریں کہ تم ان کے دین کی پیروی کرو (یعنی شرک یا باطل عقیدے کو اختیار کرلو)، تو تم ان کی اس بات کو ہرگز قبول نہ کرو۔ لیکن اس کے باوجود یہ بات تمہیں اس بات سے نہ روکے کہ تم دنیا میں ان کے ساتھ اچھے برتاؤ سے پیش آؤ۔

بیوی اور بچوں کے حقوق میں زیادتی

اسلام نے والدین کے حقوق کو جہاں لازمی قرار دیا ہے اور ساتھ ہی بیوی اور بچوں کے واجب حقوق کو بھی سختی سے لازم کیا ہے۔ قرآن مجید نے زندگی کے تمام معاملات میں عدل، توازن اور اعتدال کا حکم دیا ہے، تاکہ کسی حق کی ادائیگی دوسرے حق کے ضیاع کا سبب نہ بنے، ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَى حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾(1)۔

اور قرابت دار کو اس کا حق دے، اور مسکین اور مسافر کو بھی، اور بے جا خرچ نہ کر۔

ابن کثیر رحمہ اللہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"أي أعط كل ذي حق حقه من غير إسراف ولا تقتير، فالإسراف تضييع المال في غير وجهه، والتقتير منع الحقوق الواجبة"(2)۔

یعنی ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو، نہ اسراف کرو نہ بخل۔ اسراف یہ ہے کہ مال کو غیر محل میں خرچ کیا جائے اور بخل یہ کہ واجب حقوق ادا نہ کیے جائیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ والدین کی خدمت میں خرچ کرنا نیکی ہے، مگر اگر وہ خرچ اس حد تک ہو جائے کہ بیوی اور بچوں کے واجب نان و نفقہ میں کمی آجائے تو یہ اسراف کے زمرے میں آتا ہے جو ممنوع ہے۔

ارشاد باری تعالی ہے: ﴿وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ﴾(3)۔ اور اپنی بیویوں کے ساتھ بھلائی سے زندگی بسر کرو۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہے:

"أي على وجه لا يضرّ أحدُ الزوجين بالآخر، بل يعاشرها بإعطاء حقّها من النفقة والمودة والمعاملة الحسنة"(4)۔

---

(1) سورۃ الإسراء: ۲۶

(2) تفسیر ابن کثیر، ج۵، ص۶۷

(3) سورۃ النساء: ۱۹

(4) تفسیر القرطبی، ج۵، ص۹۷

یعنی شوہر اس طرح زندگی گزارے کہ کسی فریق کو ضرر نہ پہنچے، بلکہ بیوی کو نان ونفقہ، محبت اور حسنِ سلوک کے ذریعے اس کا حق ادا کرے۔

بیوی کا نفقہ اور عزت واحترام شوہر پر شرعاًواجب ہے۔ اگر کوئی شخص والدین کی خدمت میں اتنا مشغول ہو جائے کہ بیوی اور بچوں کے حقوق (نان ونفقہ، وقت، محبت) ضائع ہونے لگیں تو یہ غلو اور عدمِ اعتدال کی علامت ہے۔ارشادباری تعالیٰ ہے:﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾[1]۔

اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں کرتا۔

تفسیر طبری میں ہے:

"أي لا يفرض الله على العبد من حقوق الناس ما لا يقدر عليه جميعًا، بل يؤمر بالعدل والتوازن بين الحقوق"[2]۔

یعنی اللہ تعالیٰ بندے پر اتنے حقوق لازم نہیں کرتا جنہیں وہ بیک وقت ادا نہ کرسکے، بلکہ اسے عدل اور توازن اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ انسان پر مختلف ذمہ داریاں ہیں —والدین، بیوی، اولاد، رشتہ دار— اور ہر ایک کا حق اپنی حد میں ہے۔ اگر کوئی شخص ایک حق میں اس قدر بڑھ جائے کہ دوسرا ضائع ہو جائے، تو یہ انتہا پسندی ہے، نہ کہ نیکی۔

اسلام میں والدین کی خدمت عظیم نیکی ہے، لیکن یہ خدمت اس حد تک نہیں پہنچنی چاہیے کہ دیگر واجب فرائض جیسے بیوی اور بچوں کے نان ونفقہ، محبت اور تربیت نظر انداز ہو جائیں۔عدل و توازن ہی اسلامی اخلاق کا بنیادی اصول ہے، جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا:((إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، فَأَعْطِ كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ))[3]۔

بے شک تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے، تیرے اہل وعیال کا تجھ پر حق ہے، لہٰذا ہر حق دار کو اس کا حق دے۔

---

[1] سورۃ البقرۃ:۲۸۶

[2] تفسیر الطبری، ج۵، ص۲۱۰

[3] صحیح بخاری، حدیث:۱۹۶۸

اسلام نے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کو جنت کا ذریعہ قرار دیا، لیکن ساتھ ہی اولاد کی پرورش، تعلیم اور تربیت کو بھی والدین کا اہم فریضہ قرار دیا، تاکہ حقوق کا توازن برقرار رہے۔ فرمان نبوی ہے: اسی طرح اولاد کے حقوق کے بارے میں ارشاد ہے: ((إِنَّ لِوَلَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))[1]۔ بے شک تمہارے بیٹے کا بھی تم پر حق ہے[2]۔

یہ حدیث اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ والدین پر بھی اپنی اولاد کے حقوق لازم ہیں۔ ان کی ذمہ داری صرف شفقت یا حسنِ سلوک تک محدود نہیں، بلکہ ان پر فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی صحیح پرورش، تعلیم اور تربیت کا مکمل انتظام کریں۔ اسلام نے والدین کو نہ صرف محبت اور نرمی کا حکم دیا ہے بلکہ انہیں یہ بھی سکھایا ہے کہ بچوں کے حق میں عدل، توازن اور رہنمائی کا مظاہرہ کریں۔

یہ تعلیم ہمیں بتاتی ہے کہ والدین کو اپنے بچوں کی اخلاقی، ذہنی، جسمانی اور تعلیمی نشوونما پر یکساں توجہ دینی چاہیے، تاکہ وہ ایک صالح، باشعور اور ذمہ دار فرد کے طور پر پروان چڑھیں۔ اس طرح اسلام نے والدین کو یہ واضح پیغام دیا ہے کہ حقیقی محبت اسی وقت کامل ہوتی ہے جب اس کے ساتھ تربیت، رہنمائی اور کردار سازی کا جذبہ بھی شامل ہو۔

صلہ رحمی میں توازن: آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، أَوْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ، فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ))۔[3]

جو چاہتا ہے کہ اس کا رزق کشادہ کیا جائے اور اس کی عمر دراز ہو تو وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔
مطلب یہ ہے کہ رشتہ داری میں اعتدال اور توازن رکھا جائے، قطع رحمی انتہا پسندی ہے اور بے جا تعلقات یا خرچ کرنا بھی غلو ہے۔

مودت و محبت کا خاتمہ

مسلمان معاشروں میں جب لوگ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگتے ہیں تو باہمی محبت، بھائی چارہ اور اعتماد کی فضا ختم ہو جاتی ہے، اور ان کی جگہ نفرت، بغض اور دشمنی لے لیتی ہے۔ اسلام ہمیں سکھاتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان تعلقات ایمان، اخوت اور خیر خواہی کی بنیاد پر ہونے چاہییں، نہ کہ ایک دوسرے کو کافر قرار دینے پر۔ جب کوئی مسلمان اپنے ہی بھائی کی تکفیر کرتا ہے تو اس کے دل سے محبت کی جگہ عداوت پیدا ہو جاتی ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے میں انتشار، اختلافات اور فساد جنم لیتے ہیں۔ ایسا طرزِ عمل نہ صرف امتِ مسلمہ کی کمزوری اور زوال کا

---

[1] صحیح بخاری: کتاب الصوم، باب حق الولد علی الوالد، حدیث:۱۹۶۸

[2] النسائی، احمد بن شعیب. سنن النسائی، کتاب الصیام، باب: صیام الدھر، حدیث: ۲۷۱۲، ج۲، ص ۱۴۲

[3] صحیح البخاری، حدیث:۵۹۸۶، صحیح مسلم، حدیث:۲۵۵۷

باعث بنتا ہے بلکہ اسلام کی اُس تعلیم کے بھی خلاف ہے جو اتحاد، اخوت اور باہمی احترام پر زور دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَيُطِيعُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾[1]

اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے مدد گار اور معاون ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، روزے رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ اپنی رحمت نازل فرمائے گا، بے شک اللہ طاقت اور حکمت والا ہے۔

اسی طرح حدیث نبوی ہے:

((الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا، وَشَبَّكَ بَيْنَ أَصَابِعِهِ))[2]

ایک مومن وہ مومن کے ساتھ ایک عمارت کے علم میں ہے کہ ایک کو دوسرے سے قوت پہنچتی ہے۔ اور آپ نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے اندر کیا۔

ملنے جلنے اور تنہائی کے درمیان توازن

اسلام نے فرد کی انفرادی زندگی اور معاشرتی تعلقات کے درمیان ایک حسین توازن قائم کرنے کی تعلیم دی ہے۔ دینِ اسلام نہ تو دنیا سے مکمل کنارہ کشی اور رہبانیت کو پسند کرتا ہے، اور نہ ہی ایسی بے قابو معاشرتی میل جول کی اجازت دیتا ہے جس سے انسان اپنی عبادت، اخلاق یا ذمہ داریوں میں غفلت برتنے لگے۔ اسلام چاہتا ہے کہ انسان اپنی ذاتی زندگی کے حقوق، عبادات اور روحانی سکون کا خیال رکھے، لیکن ساتھ ہی معاشرے میں رہ کر دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک، ہمدردی اور تعاون کے ذریعے اپنا کردار ادا کرے۔

اسلامی تعلیمات کے مطابق، ایک سچا مومن وہ ہے جو تنہائی میں اللہ سے تعلق مضبوط کرتا ہے اور معاشرت میں رہ کر انسانوں کے ساتھ بھلائی کا برتاؤ کرتا ہے۔ مکمل طور پر الگ تھلگ رہنا یا دنیاوی تعلقات سے گریز کرنا اسلام کا مقصد نہیں، بلکہ اسلام چاہتا ہے کہ انسان صبر، خیر خواہی اور عدل کے ساتھ دوسروں کے ساتھ تعلق رکھے۔ یہی

---

[1] سورۃ التوبہ: ۷۱

[2] صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۶

اعتدال انسان کو روحانی سکون، اخلاقی بلندی اور معاشرتی استحکام عطا کرتا ہے، جو ایک متوازن اسلامی زندگی کی بنیاد ہے۔ فرمان نبوی ہے:

((الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَىٰ أَذَاهُمْ، أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ وَلَا يَصْبِرُ عَلَىٰ أَذَاهُمْ))۔[1]

وہ مومن جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی ایذاء پر صبر کرتا ہے، وہ اس مومن سے بہتر ہے جو نہ لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور نہ ان کی ایذاء پر صبر کرتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اس حدیث میں واضح فرمایا کہ وہ مومن جو دوسروں کے ساتھ میل جول رکھتا ہے اور ان کی ایذا و تکلیف پر صبر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک عظیم اجر کا مستحق بنتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام انسان کو معاشرتی زندگی میں سرگرم رہنے، دوسروں کے ساتھ تعلقات قائم رکھنے اور ان کے ساتھ بھلائی کرنے کی ترغیب دیتا ہے، چاہے اس راہ میں مشکلات اور پریشانیاں ہی کیوں نہ آئیں۔ لوگوں کے رویے اور ایذائیں انسان کے صبر کا امتحان بنتی ہیں، لیکن یہی صبر مومن کے لیے اللہ کی رضا اور اجرِ عظیم کا ذریعہ بنتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے معاشرتی فرائض سے کنارہ کش نہیں ہونا چاہیے۔ اسے نہ تو تنہائی اختیار کرنی ہے اور نہ ہی تعلقات میں حد سے بڑھ جانا ہے۔ اسلام کا تقاضا ہے کہ انسان لوگوں کے ساتھ میل جول رکھے، ان کی ضرورت کے وقت کام آئے، ان کی مدد کرے اور معاشرتی بھلائی کے کاموں میں شریک رہے۔ "ایذا" کا مفہوم یہ ہے کہ معاشرتی تعلقات میں شکایتیں، تلخ کلامی یا مشکلات پیش آسکتی ہیں، لیکن مومن ان سب پر صبر اور اخلاق کے ساتھ قابو پاتا ہے۔ وہ دوسروں کی خطاؤں کو درگزر کر کے اپنی روحانی و اخلاقی ترقی حاصل کرتا ہے۔

اس حدیث کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ ایک حقیقی مومن وہ ہے جو لوگوں کی تکالیف کے باوجود ان کے ساتھ رہتا ہے اور صبر سے کام لیتا ہے۔ وہ معاشرت سے الگ نہیں ہوتا بلکہ مشکلات میں بھی صلہ رحمی، خیر خواہی اور خدمتِ خلق کے جذبے کو برقرار رکھتا ہے۔ صبر و تحمل کا یہی رویہ اس کے ایمان کو مضبوط کرتا ہے اور اسے اخلاقی بلندی عطا کرتا ہے۔ اسلام نے یہاں بھی توازن کی تعلیم دی ہے کہ انسان نہ دنیا سے مکمل کنارہ کش ہو اور نہ ہی دنیاوی تعلقات میں اتنا محو ہو جائے کہ اس کا دین متاثر ہو۔ بہترین رویہ یہی ہے کہ معاشرت میں رہ کر صبر، شریعت کی حدود اور اخلاقی وقار کے ساتھ تعلقات نبھائے جائیں.

اسلام ایک مکمل اور متوازن دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں انسان کو رہنمائی دیتا ہے۔ اس کی تعلیمات کی بنیاد ہی اعتدال، توازن اور میانہ روی پر ہے۔ یہ محض اخلاقی یا سماجی اصول نہیں بلکہ عقائد، عبادات، معاشرت اور

---

[1] سنن ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب بَابُ: الصَّبْرِ عَلَى الْبَلَاءِ، حدیث: ۴۰۳۲

معیشت کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ اس توازن کا کامل نمونہ ہے۔ خلفائے راشدینؓ کا نظامِ عدل، طرزِ حکمرانی اور اصلاحی اقدامات اسی توازن اور انصاف کی بنیاد پر قائم تھے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کو بھی افراط و تفریط سے بچنے کی تعلیم دی اور ہر ایسے عمل سے روکا جس میں سخت گیری یا غلو کا پہلو پایا جائے۔ غلو انسان کو یا تو شدت پسندی کی طرف لے جاتا ہے یا دوسروں کی تکفیر اور تفرقے کا باعث بنتا ہے۔ اسلام نے غلو کو فکری گمراہی قرار دے کر اس کے مقابلے میں ایسا اعتدال پیش کیا جو روحانی سکون، معاشرتی امن اور عالمی ہم آہنگی کا ضامن ہے۔

معاشرتی زندگی میں انتہا پسندی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لوگ دین کو جذبات کے غلبے میں آکر سمجھنے لگتے ہیں اور عقل و حکمت کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ یہ رویہ عدم برداشت، تعصب اور دوسروں پر اپنی رائے تھوپنے کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جب اختلافِ رائے کو دشمنی سمجھ لیا جائے اور گفتگو کی جگہ الزام تراشی لے لے تو معاشرے میں فکری زوال شروع ہو جاتا ہے۔ انتہا پسند ذہن اپنی رائے کو ہی حق سمجھتا ہے اور دوسروں کو باطل قرار دیتا ہے، جس سے نفرت، تفرقہ اور بداعتمادی جنم لیتی ہے۔ جب دین کی جامع تعلیمات کو جزوی طور پر لیا جائے تو تنگ نظری اور تشدد کے رجحانات بڑھ جاتے ہیں، جو اصلاح کی بجائے فساد کو جنم دیتے ہیں۔ اس کے اثرات گھر، تعلیمی اداروں اور سیاسی ماحول تک پھیل جاتے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ تعلیم، مکالمے اور برداشت کے ذریعے اعتدال، احترام اور توازن کے کلچر کو فروغ دیا جائے تاکہ معاشرہ پُرامن، منصف اور متحد بن سکے۔

معاشی معاملات میں غلو

مال خرچ کرنے کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات میانہ روی کا سبق دیتی نظر آتی ہیں۔ چنانچہ فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا﴾[1]۔

اور آپ اپنے ہاتھ کو (بخل کی وجہ سے) اپنی گردن سے بندھا ہوا (نہ رکھئے اور نہ (فضول خرچ بن کر) اسے بالکل ہی کھول دیجئے ورنہ آپ لوگوں کی ملامت کے مستحق اور محتاجی سے تھکے ہارے ہو جائیں گے۔

شیخ الحدیث حافظ عبدالسلام بھٹوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں لکھتے ہیں:

مَغْلُوْلَةً : غُلٌّ سے مشتق ہے، جس کا معنی گردن کا طوق ہے، جس کے ساتھ ہاتھ بھی باندھ دیے جائیں، جیسا کہ مجرموں اور قیدیوں سے کیا جاتا ہے، مراد بخل اور کنجوسی ہے اور "الْبَسْطِ "(کھولنا) سے مراد سخاوت ہے۔ مَحْسُوْرًا جو تھک ہار کر چلنے سے رہ جائے۔ یعنی بالکل بخیلی کرو گے تو خالق و مخلوق دونوں کے ہاں ملامت کیے ہوئے بن جاؤ گے اور پورا ہاتھ کھول دو گے اور سب کچھ دے کر خالی ہاتھ ہو جاؤ گے تو اہل و عیال کی ملامت کے ساتھ ساتھ زندگی کی

---

[1] سورۃ الإسراء: ۲۹

دوڑ میں تھک ہار کر بیٹھ رہو گے، پھر ممکن ہے کہ بھیک مانگنے تک کی نوبت آ جائے۔ سب سے بہتر میانہ روی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَ لَمْ يَقْتُرُوْا وَ كَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾[1]۔

اور رحمان کے بندے وہ ہیں جو خرچ کرتے وقت نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل، بلکہ ان کا خرچ اعتدال اور میانہ روی کے درمیان ہوتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُوْلُ))[2]۔

بہترین صدقہ وہ ہے جس کے بعد غنا موجود رہے (انسان فقیر نہ ہو جائے) اور ابتدا ان سے کرو جن کی تم پرورش کر رہے ہو۔

معاملات میں غلو اور انتہا پسندی کی مختلف صورتیں علماء نے ذکر کی ہیں، جو اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ دین اسلام میں اعتدال ہی اصل ہے اور افراط و تفریط دونوں ممنوع ہیں۔ محدثین وفقہاء کے نزدیک معاملات میں غلو کی چند نمایاں شکلیں درج ذیل ہیں:

لین دین میں غلو

معاشی لین دین میں اسلام نے عدل وانصاف، امانت داری اور شفافیت کو بنیادی اصول بنایا ہے۔ اس میں ہر قسم کی زیادتی، ظلم، دھوکہ اور افراط و تفریط کو غلو اور انتہا پسندی قرار دیا گیا ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں جس کی چند بنیادی صورتیں درج ذیل ہیں:

۱. ناپ تول میں کمی بیشی

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ. الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُونَ . وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَزَنُوهُمْ يُخْسِرُونَ ﴾[3]۔

ہلاکت ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لیے، جو خود لیتے وقت پورا لیتے ہیں اور دوسروں کو دیتے وقت کمی کرتے ہیں۔

---

[1] الفرقان:٦٧

[2] صحیح بخاری، الزکوۃ، باب لا صدقۃ إلا عن ظهر غنى:١٤٢٦

[3] المطففین:١-٣

امام قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فِيهِ تَغْلِيظٌ فِي تَطْفِيفِ الْكَيْلِ وَالْوَزْنِ، وَهُوَ مِنْ غُلُوِّ الْفَسَادِ فِي الْمُعَامَلَاتِ"[1]۔

اس آیت میں ناپ تول میں کمی کرنے پر سخت وعید آئی ہے، اور یہ معاملات میں فساد اور غلو کی بدترین شکل ہے۔

اسی بنا پر قرآن نے ایک دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا: ﴿وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ﴾[2]۔

ناپ اور ترازو کو انصاف کے ساتھ پورا کرو۔

۲. سود

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾"[3]۔

اور اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اسلام میں جائز تجارت مباح اور باعثِ برکت ہے، لیکن سود لینا دینا سختی سے ممنوع اور گناہ کبیرہ ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الرِّبَا مِنْ أَعْظَمِ أَنْوَاعِ الْغُلُوِّ فِي الْمُعَامَلَاتِ، وَفِيهِ ظُلْمٌ بَيِّنٌ، لِذَلِكَ شُبِّهَ بِحَرْبِ اللَّهِ وَرَسُولِهِ" [4]۔

ربا (سود) معاملات میں سب سے بڑی غلو کی شکل ہے، اس میں کھلا ظلم ہے، اسی لیے اسے اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے برابر قرار دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَعَنَ اللَّهُ آكِلَ الرِّبَا، وَمُوكِلَهُ، وَكَاتِبَهُ، وَشَاهِدَيْهِ)) [5]

اللہ تعالیٰ نے سود کھانے والے، دینے والے، لکھنے والے اور اس پر گواہی دینے والے سب پر لعنت فرمائی ہے۔

۳. خرید و فروخت میں دھوکہ دہی

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے ((مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا))[6]۔ جس نے ہمیں دھوکہ دیا، وہ ہم میں سے نہیں

---

[1] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۱۹، ص۲۵۱

[2] الأنعام: ۱۵۲

[3] البقرۃ: ۲۷۵

[4] تفسیر ابن کثیر، ج۱، ص۳۲۵

[5] صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب لعن آکل الربا، حدیث: ۱۵۹۸

[6] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب قول النبی ﷺ: من غشنا فلیس منا حدیث: ۱۰۱

ہے۔یعنی دھوکہ دہی کرنے والا شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور امتِ مسلمہ کے طریقے پر نہیں ہے، اس کا یہ عمل اسلامی اخلاقیات کے منافی ہے۔ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فِيهِ دَلَالَةٌ عَلَى أَنَّ الْغُشَّ مِنْ غُلُوِّ الْمُحَرَّمَاتِ، لِأَنَّهُ يُفْسِدُ أَمْوَالَ النَّاسِ وَيُضَيِّعُ الثِّقَةَ"[1]۔

اس حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ دھوکہ حرام میں سب سے بڑی غلو کی صورت ہے، کیونکہ یہ لوگوں کے مال کو برباد کرتا اور اعتماد کو ضائع کرتا ہے۔

۴. ذخیرہ اندوزی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ((لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا خَاطِئٌ))[2]۔ ذخیرہ اندوزی کرنے والا گناہ گار ہی ہوتا ہے۔امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الِاحْتِكَارُ هُوَ غُلُوٌّ فِي حَبْسِ الْأَصْلَاحِ، يُؤَدِّي إِلَى ضَرَرِ الْمُسْلِمِينَ، فَنَهَى عَنْهُ الشَّرْعُ" [3]۔

ذخیرہ اندوزی اصلاحی چیزوں کو روکنے میں غلو ہے، جو مسلمانوں کے نقصان کا باعث بنتی ہے، اس لیے شریعت نے اسے منع کر دیا۔

۵. جھوٹی قسمیں اور ناجائز تجارتی ہتھکنڈے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:((الْحَلِفُ مَنْفَقَةٌ لِلسِّلْعَةِ، مَمْحَقَةٌ لِلْبَرَكَةِ))[4]۔

قسم کھانا (تجارت میں) سامان کو تو بیچ دیتا ہے، مگر برکت کو مٹا دیتا ہے۔

یعنی جھوٹی یا بار بار کی قسمیں وقتی طور پر خریدار کو متوجہ کر کے مال فروخت کرا دیتی ہیں، لیکن اس کاروبار سے برکت ختم ہو جاتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الْكَذِبُ وَالْحَلِفُ الْبَاطِلُ فِي الْبُيُوعِ مِنْ غُلُوِّ الْفَسَادِ، وَهُوَ أَعْظَمُ أَسْبَابِ مَحْقِ الْبَرَكَةِ "[5]۔

---

[1] ابن حجر، فتح الباری، ج۱، ص۳۸۶

[2] صحیح مسلم، حدیث:۱۶۰۵

[3] النووی، شرح النووی علی مسلم، ج۱۱، ص۴۳

[4] صحیح البخاری، حدیث:۲۰۸۷

[5] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۲۸، ص۲۲

تجارت میں جھوٹ اور جھوٹی قسم غلو کے ساتھ بدترین فساد ہے، اور یہ برکت کے ختم ہونے کے بڑے اسباب میں سے ہے۔

اسلام نے معاشی لین دین میں اعتدال، دیانت اور انصاف کو بنیادی اصول قرار دیا ہے اور ان تمام رویّوں کی سختی سے مذمت کی ہے جو مالی بے اعتدالی یا ظلم کا باعث بنتے ہیں۔ معاشی انتہا پسندی کی کئی صورتیں قرآن و سنت میں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں، جیسے ناپ تول میں کمی بیشی کرنا، سودی کاروبار میں ملوث ہونا، جھوٹ بول کر یا دھوکہ دے کر منافع کمانا، ذخیرہ اندوزی کرنا، یا جھوٹی قسموں کے ذریعے گاہک کو فریب دینا۔ یہ تمام اعمال نہ صرف اخلاقی انحطاط کی علامت ہیں بلکہ پورے معاشی نظام میں بے اعتمادی اور بدعنوانی کو فروغ دیتے ہیں۔

اسلام کے نزدیک تجارت محض منافع کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا"، جو اس بات کی دلیل ہے کہ دیانت داری کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے برعکس، جو شخص دھوکہ دہی، ناجائز منافع خوری یا سودی لین دین میں ملوث ہوتا ہے، وہ نہ صرف شریعت کی خلاف ورزی کرتا ہے بلکہ معاشرتی انصاف کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔ مفسرین کے مطابق، ایسے اعمال معیشت میں فساد، غربت اور بے برکتی کا باعث بنتے ہیں۔

اسلام ایک متوازن اور پاکیزہ معاشی نظام پیش کرتا ہے جو نہ سرمایہ دارانہ خودغرضی کو قبول کرتا ہے اور نہ اشتراکیت کی زیادتی کو، بلکہ عدل، مساوات اور امانت کے اصولوں پر قائم ایک ایسا نظام چاہتا ہے جس میں ہر فرد کے حقوق محفوظ ہوں۔ یہی توازن اور شفافیت اسلامی معیشت کی روح ہے، جو فرد اور معاشرے دونوں کے لیے امن، خوشحالی اور انصاف کی ضمانت بنتی ہے۔

٦. قرض و ادائیگی میں ٹال مٹول

قرض اور ادائیگی میں سختی یا بلاوجہ ٹال مٹول کو بھی انتہا پسندی اور غلو شمار کیا گیا ہے، کیونکہ یہ ایک طرف ظلم ہے اور دوسری طرف حقوق العباد کی پامالی۔ اس پر قرآن و سنت میں سخت وعید آئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کو ظلم قرار دیا ہے: آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

((مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ))[1]۔ صاحبِ حیثیت آدمی کا قرض کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص قرض ادا کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور پھر بھی تاخیر کرتا ہے، تو یہ محض تاخیر نہیں بلکہ ظلم ہے، اور ظلم اسلام میں سب سے بڑی برائی ہے۔ یہ طرزِ عمل قرض کے معاملے میں غلو ہے، کیونکہ وہ جائز وقت سے بڑھا کر اپنے نفس کی خواہشات کو مقدم کرتا ہے۔

قرض خواہ پر سختی کرنے والے کے لیے وعید کرتے ہوئے آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: ۲۴۰۰، صحیح مسلم، حدیث: ۱۵۶۴

((مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيدُ إِتْلَافَهَا أَتْلَفَهُ اللَّهُ، وَمَنْ أَخَذَهَا يُرِيدُ أَدَاءَهَا أَدَّى اللَّهُ عَنْهُ))[1]

جس نے لوگوں کا مال (قرض) لیا اس نیت سے کہ وہ اسے ضائع کر دے گا، اللہ تعالیٰ اسے ضائع کر دیتا ہے اور جس نے نیت کی کہ اسے ادا کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے ادائیگی کا سبب بنا دیتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں مالی معاملات کو نہایت حساس اور ذمہ دارانہ دائرہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ انسانی حقوق، اعتماد اور عدل سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ نبی کریم ﷺ کی یہ حدیث اس حقیقت کو واضح کرتی ہے کہ جو شخص قرض لیتے وقت اسے واپس کرنے کی نیت نہ رکھے یا جان بوجھ کر دوسروں کا مال ضائع کرے، وہ بدترین غلو اور خیانت کا مرتکب ہوتا ہے، جو نہ صرف دینی اعتبار سے گناہِ کبیرہ ہے بلکہ اللہ کے غضب اور عذاب کا باعث بھی بنتا ہے۔ اسلام نے ایسے رویے کو "معاملاتی انتہا پسندی" قرار دیا ہے کیونکہ یہ دیانت، شفافیت اور اعتماد کے اصولوں کو مجروح کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں شریعت نے حسنِ نیت، امانت داری، اور آسانی کے ساتھ معاملات کرنے کو بہترین طرزِ عمل قرار دیا ہے۔

معاشی انتہا پسندی دراصل اس وقت جنم لیتی ہے جب انسان دولت کے معاملے میں توازن کھو دیتا ہے۔ کچھ لوگ مال کی حرص اور دنیاوی لالچ میں اتنے آگے بڑھ جاتے ہیں کہ جائز و ناجائز کی تمیز مٹا دیتے ہیں، جبکہ کچھ زہد کے نام پر محنت اور معیشت سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ دونوں صورتیں دین کے مزاج کے خلاف ہیں۔ جب دولت کو فخر، طاقت یا برتری کا ذریعہ سمجھا جائے تو معاشرے میں ناانصافی، طبقاتی فرق، حسد، اور محرومی کے احساسات بڑھ جاتے ہیں۔ اسی طرح جب دولت کے استعمال میں ظلم، استحصال، یا رشوت شامل ہو جائے تو پورا معاشی ڈھانچہ بگڑ جاتا ہے۔

اسلام نے واضح طور پر سکھایا ہے کہ حقیقی برکت دیانت داری، نیت کی صفائی، اور عدل میں ہے، نہ کہ حرام ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت میں۔ قرآن نے سود، ذخیرہ اندوزی، دھوکہ دہی اور ناانصافی کو معاشی فساد کی جڑ قرار دیا ہے، کیونکہ یہ اعمال نہ صرف انفرادی اخلاق کو تباہ کرتے ہیں بلکہ اجتماعی نظام کو بھی بگاڑ دیتے ہیں۔ لہٰذا اسلام کا پیغام یہ ہے کہ انسان اپنی معاشی زندگی میں میانہ روی، اعتدال اور دیانت کو اپنائے۔ جب تجارت میں شفافیت، قرض میں امانت، اور خرچ میں توازن قائم رہتا ہے تو پورا معاشرہ امن، استحکام اور خوشحالی کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ یہ وہی معاشی توازن ہے جسے اسلام نے "برکت" کا راز قرار دیا ہے۔ ایک ایسا توازن جو نہ صرف دنیا میں انصاف قائم کرتا ہے بلکہ آخرت میں کامیابی کی ضمانت بھی بنتا ہے۔

---

[1] صحیح البخاری، حدیث: ۲۳۸۷

باب سوم

مسلم معاشروں پر انتہا پسندی کے اثرات

فصل اول　　انتہا پسندی کے نظری و فکری اثرات

فصل دوم　　مذہبی رواداری کا فقدان اور فرقہ وارانہ تنازعات

فصل سوم　　خاندانی و سماجی زندگی میں انتہا پسندی کے مظاہر

فصل چہارم　　انتہا پسندی کے سیاسی، معاشی و تعلیمی آثار

فصل اول

انتہا پسندی کے نظری و فکری اثرات

فصل اول

انتہا پسندی کے نظری و فکری اثرات

مسلم معاشروں پر انتہا پسندی کے اثرات کا جائزہ لینے سے قبل مسلم معاشرہ کی تعریف اور نظری و فکری کا مفہوم ائمہ کرام کی روشنی میں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

مسلم معاشرہ: تعریف واہمیت

اسلامی معاشرہ ایک ایسا مثالی اور جامع نظامِ زندگی ہے جو رنگ، نسل، زبان یا قومیت کے بجائے خالصتاً ایمان، تقویٰ اور اسلامی اخوت کے رشتے پر استوار ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں کسی انسان کی حیثیت اس کے خاندان یا نسب سے نہیں بلکہ اس کے ایمان، اخلاق اور کردار سے پہچانی جاتی ہے۔ اسلام نے معاشرتی زندگی کی بنیاد عدل، مساوات، اخوت، خیر خواہی، اور باہمی تعاون جیسے اعلیٰ اصولوں پر رکھی ہے، تاکہ ہر فرد کو عزت، انصاف اور تحفظ حاصل ہو۔ امام الماوردی رحمۃ اللہ علیہ الاحکام السلطانیہ لکھتے ہیں:

"المجتمعُ الإسلاميُّ هو الجماعةُ التي تنتظمُ في ظلِّ إمامٍ عادلٍ، لإقامةِ الدينِ وسياسةِ الدنيا به."[1]

اسلامی معاشرہ وہ جماعت ہے جو ایک عادل حاکم کے زیرِ سایہ دین کے قیام اور دنیا کی درست تدبیر کے لیے منظم ہو۔

ماوردی نے اسلامی معاشرے کی تعریف سیاسی و فقہی نظم کے لحاظ سے کی ہے۔ یعنی شریعت کے نفاذ کے لیے ایک منظم اجتماعی نظام ہے۔

امام ابو حامد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"المجتمعُ الإسلاميُّ هو الذي يقومُ على التآلفِ بين أفرادِهِ، والتناصحِ في الدين، والتعاونِ على البرِّ والتقوى، وتقديمِ المصلحةِ العامةِ على الهوى الشخصيّ."[2]

اسلامی معاشرہ وہ ہے جو اپنے افراد کے درمیان محبت، دین میں خیر خواہی، نیکی اور تقویٰ پر باہمی تعاون، اور ذاتی خواہشات پر اجتماعی مصلحت کو ترجیح دینے پر قائم ہو۔

---

[1] الماوردی، الأحکام السلطانیہ، ص ١٧

[2] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج ٢، ص ٣٢٢

امام غزالی اسلامی معاشرہ کی بنیاد کو "اخلاقی و روحانی ہم آہنگی" قرار دیتے ہیں۔ اس میں دین اور دنیا کا توازن مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ جبکہ ابن تیمیہ "معاشرت" (مجتمع اسلامی) کو عقیدہ و عمل کی وحدت پر قائم دیکھتے ہیں۔ یعنی ایمان، شریعت اور اخلاق کا باہمی تعلق۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"المجتمعُ الإسلاميُّ هو الذي يجتمعُ أهلُه على طاعةِ الله ورسوله، ويتناصحون فيما بينهم، ويأمرون بالمعروفِ وينهون عن المنكرِ."[1]

اسلامی معاشرہ وہ ہے جس کے لوگ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پر جمع ہوں، باہم خیر خواہی کریں، اور نیکی کا حکم اور برائی سے روکنے کا نظام قائم رکھیں۔

علامہ القرطبی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"والمجتمعُ الصالحُ هو الذي تُقامُ فيه حدودُ الله، وتُحفظُ فيه الحقوقُ، وتُصانُ فيه الكرامةُ الإنسانيةُ، ويُعظَّمُ فيه العدلُ."[2]

صالح اسلامی معاشرہ وہ ہے جہاں اللہ کی حدود قائم ہوں، حقوق محفوظ ہوں، انسانی عزت کی حفاظت ہو، اور عدل و انصاف کو بلند مقام دیا جائے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کے نزدیک فقہی اعتبار سے اسلامی معاشرہ: احکامِ شریعت کے نفاذ اور انسانی وقار کے تحفظ کا مجموعہ قرار دیتے ہیں۔ جبکہ امام شاطبی رحمہ اللہ "المجتمع الإسلامی" کو مقاصدِ شریعت کے نفاذ کا مظہر سمجھتے ہیں، آپ لکھتے ہیں:

"قيامُ المجتمعِ الإسلاميِّ إنما يكونُ بتحقيقِ مقاصدِ الشريعةِ في حفظِ الدينِ والنفسِ والعقلِ والنسلِ والمالِ."[3]

اسلامی معاشرہ اس وقت قائم ہوتا ہے جب شریعت کے مقاصد — دین، جان، عقل، نسل اور مال — کی حفاظت کی جائے۔

یہ وہ جامع تعریف ہے جس پر جدید فقہی مفکرین نے بھی اعتماد کیا ہے۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۲۸، ص۳۰۸

[2] تفسیر القرطبی، ج۵، ص۲۵۶

[3] الشاطبی، الموافقات، ج۲، ص۸

اسلامی معاشرے کی اہمیت

اسلامی معاشرہ دراصل وہ متوازن اور منظم نظامِ زندگی ہے جو ایمان، عدل، اور باہمی تعاون کے اصولوں پر قائم ہوتا ہے۔ اس معاشرے میں دین و دنیا کے تقاضوں کے درمیان ایک خوبصورت توازن پایا جاتا ہے، جہاں ہر معاملہ شریعت اور اخلاقی اقدار کے مطابق انجام دیا جاتا ہے۔ یہاں انسان کی قدر و منزلت کا معیار نہ نسل، دولت یا طاقت ہے، بلکہ تقویٰ، کردار اور انسانیت ہے۔ اسلامی معاشرت میں اخوت، انصاف، اور رحمت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں، اور ہر فرد معاشرتی بھلائی، اصلاح، اور نیکی کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔

ابن خلدون اسلامی معاشرے کو دینی و تہذیبی وحدت کے تصور کے تحت دیکھتے ہیں، جو نظریاتی بنیاد پر استوار ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

"المجتمعُ الإسلاميُّ هو العمرانُ البشريُّ القائمُ على العصبيةِ للدينِ، لا للنسبِ، يجمعُ بين السياسةِ والشرعِ"[1]

اسلامی معاشرہ وہ انسانی تمدن ہے جو نسب یا قومیت کے بجائے دین کی وابستگی پر قائم ہو اور جس میں سیاست اور شریعت ایک دوسرے سے مربوط ہوں۔

اسلامی معاشرہ شوریٰ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے اصولوں پر استوار ہوتا ہے، جہاں ذاتی مفاد کے بجائے اجتماعی بھلائی کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس کا مقصد شریعت کے بنیادی مقاصد یعنی دین، جان، عقل، نسل اور مال کی حفاظت کو یقینی بنانا ہے۔ اسلامی معاشرہ انتہا پسندی، ظلم اور افراط و تفریط سے پاک ایک ایسا معتدل نظام پیش کرتا ہے جو علم، عدل اور رحمت کی بنیاد پر قائم ہو کر انسانیت کے لیے امن، انصاف اور فلاح کا پیغام دیتا ہے۔

نظری و فکری: مفہوم

"نظری" (Ideological) سے مراد وہ بنیادی عقائد، تصورات اور فکری بنیادیں ہیں جن پر کوئی فرد یا گروہ اپنے نظریات، طرزِ فکر اور رویوں کو قائم کرتا ہے۔ یہ انسان کی فکری اور اعتقادی ساخت کی جڑ ہے جو اس کے طرزِ زندگی اور سوچ کے دائرے کو متعین کرتی ہے۔ جب کوئی گروہ یہ عقیدہ بنا لیتا ہے کہ صرف اس کا فہمِ دین ہی درست اور باقی سب باطل ہیں، تو یہی نظری انتہا پسندی کہلاتی ہے۔ اس درجے کی سخت گیر سوچ عقیدے اور اصولوں میں غلو پیدا کرتی ہے اور انسان کو عدل و اعتدال سے دور کر دیتی ہے۔ اس لیے نظری کا تعلق بنیادی طور پر "عقیدہ، اصول اور نظریۂ حیات" سے ہے، جو کسی شخص یا جماعت کے فکری ڈھانچے کی بنیاد بنتے ہیں۔

---

[1] ابن خلدون، مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۱۲

"نظری اثرات" سے مراد یہ ہے کہ انتہا پسندی سب سے پہلے عمل میں نہیں بلکہ فکر اور نظریہ میں جنم لیتی ہے۔ جب کسی فرد یا گروہ کے دینی یا فکری تصورات غلط تعبیرات، محدود سوچ، یا تعصب پر مبنی ہو جائیں، تو یہ نظریاتی انحراف انتہا پسندی کی جڑ بن جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ یہی بگاڑ عملی، سیاسی، مذہبی اور سماجی سطح پر شدت پسندی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ نظری اثرات کے مطالعے سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ کس طرح ناقص دینی فہم، فکری جمود، اور غلط تعبیرات شدت پسندی کے فکری ڈھانچے کو جنم دیتے ہیں، جو بعد میں معاشرے کے امن اور ہم آہنگی کو متاثر کرتا ہے۔

"فکری" (Intellectual) سے مراد وہ ذہنی، علمی اور تجزیاتی طریقہ ہے جس کے ذریعے انسان کسی نظریے کو سمجھتا، اس پر غور کرتا اور اسے عملی زندگی میں برتتا ہے۔ فکری توازن کا تعلق سوچنے، سمجھنے، اور دلیل کے ساتھ فیصلے کرنے کی صلاحیت سے ہے۔ جب کوئی شخص دوسروں کے خیالات کو برداشت نہیں کرتا، اختلاف کو دشمنی سمجھتا ہے، یا اجتہاد اور تجدیدِ فکر سے گریز کرتا ہے، تو یہی فکری جمود یا انتہا پسندی ہے۔ فکری انحراف دراصل عقل، علم، اور توازنِ فکر کی کمی سے پیدا ہوتا ہے، جو انسان کو تعصب اور تنگ نظری کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے فکری زاویہ "سوچ، فہم، تجزیہ اور استدلال کے طریقے" سے تعلق رکھتا ہے جو انسان کے فکری رویے کو متوازن یا منحرف بنا سکتا ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ "نظری زاویہ" وہ ہے جو کسی عقیدہ، نظریہ، یا فکری تصور کی بنیاد سے متعلق ہوتا ہے، یعنی انسان کی سوچ کا بنیادی پسِ منظر۔ جبکہ "فکری زاویہ" وہ ہے جو اس نظریے کو سمجھنے، پرکھنے اور اس پر عمل کرنے کے طرز سے متعلق ہے۔ دوسرے لفظوں میں، نظری زاویہ فکر کی بنیاد ہے، اور فکری زاویہ اس بنیاد کی عملی تعبیر ہے جو انسان کے علم، عقل اور استدلال میں ظاہر ہوتی ہے۔ ذیل میں چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں جن سے ہم یہ فرق استنباط کر سکتے ہیں:

امام غزالی رحمہ اللہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"مَن جَمَّدَ فِكْرَهُ عَلَى ظَاهِرِ النَّصِّ فَقَدْ عَطَّلَ العَقْلَ "[1]

جو شخص نص کی ظاہری تشریح پر جم جائے اس نے اپنی عقل کو معطل کر دیا ہے۔

[1] الغزالی ابو حامد محمد بن محمد، الاقتصاد فی الاعتقاد، دار البصائر، القاہرہ، ج ۱ ص ۷۹

یہاں غزالی نے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نصوص کی محض ظاہری پیروی کرنا(یعنی نظری تصوّر کو ایک قسم کا عقیدہ بنالینا) عملی عقل اور تجزیے کو معطل کر دیتا ہے۔یعنی نظری رویہ (نص کا سمجھنا) نے فکری سوچ (عقل و استدلال) کو بند کر دیا۔ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"الغلوّ في الدين يمنع الاجتهاد و يؤدي إلى الجمود الفكري"[1]

دین میں غلو اجتہاد کو روک دیتا ہے اور فکری جمود کا باعث بنتا ہے۔

اس قول سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ جب نظریات میں غلو ہو جائے تو وہ شخص افکار کی لچک کھو دیتا ہے،یعنی نظری تصوّر (غلو عقیدہ) فکری رویہ (اجتہاد، تحقیق و تجدید) کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ اس کی وضاحت کرتے ہیں:

"شرع الله جاء لتحقيق مصالح العباد و تذليل الجمود لا تكريسه"[2]

اللہ کی شریعت بندوں کی مصلحت کے لیے آئی ہے اور جمود کو توڑنے کے لیے نہ اسے پائیدار کرنے کے لیے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بیان واضح طور پر نظری اور فکری فرق کو اجاگر کرتا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ شریعت کا مقصد نظری انسداد جمود اور فکری حرکت ہے،یعنی صرف اصول و عقیدہ پر نہ ٹھہرا جائے بلکہ فکر و تجدید کو تسلیم کیا جائے۔ان ائمہ کی اقوال سے یہ فرق یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ جب نظری عقیدہ جمود اختیار کرلے تو وہ فکری سوچ کو معطل کر دیتا ہے،یعنی نظری غلو و تعصب فکری حرکت اور تحقیق کی راہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

انتہاپسندی اور علمی و فکری جمود

انتہا پسندی دراصل علمی اور فکری جمود کا بنیادی سبب بنتی ہے۔یہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کوئی فرد یا گروہ اپنے نظریات کو حرفِ آخر اور ناقابلِ تنقید سمجھنے لگتا ہے۔اس رویے کے نتیجے میں سوچنے، سوال کرنے اور تحقیق کرنے کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے، اور انسان اپنی رائے سے آگے دیکھنے کی جرأت کھو بیٹھتا ہے۔یہی کیفیت فکری تنگی کو جنم دیتی ہے جو علم و دانش کے ارتقاء میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔جب ذہن سوالات سے خالی ہو جاتا ہے تو فہمِ دین اور علم دونوں جامد ہو جاتے ہیں، اور یہی جمود فکری انحطاط کا آغاز ہے۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ص ۴۳۴

[2] مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۱۲

ایسے ماحول میں اجتہاد، غور و فکر، اور فکری آزادی کی روح کمزور پڑ جاتی ہے۔ مذہب کے نام پر اندھی تقلید کو علم سمجھ لیا جاتا ہے، اور نئے علمی یا فکری زاویوں کے لیے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ نتیجتاً معاشرہ علمی ترقی، فکری تنوع، اور فہمِ دین کے توازن سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس جمود کے زیرِ اثر انسان اپنی رائے کو ہی دین کا معیار سمجھنے لگتا ہے اور کسی اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کرتا۔ وہ دوسروں کی سوچ کو کفر یا گمراہی قرار دے کر فکری مکالمے کے امکانات ختم کر دیتا ہے۔

جب یہ سوچ عام ہو جاتی ہے تو معاشرہ برداشت، رواداری، مکالمہ اور تحقیق جیسی اعلیٰ اقدار سے خالی ہو جاتا ہے۔ عقل و شعور کی وسعت محدود ہو جاتی ہے، اور علم کے سرچشمے خشک ہونے لگتے ہیں۔ یوں انتہا پسندی بتدریج ایک ایسے فکری قید خانے میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں نہ سوال کی گنجائش باقی رہتی ہے، نہ تجدیدِ فکر کی۔ یہی علمی و فکری جمود معاشرے کی فکری بقا اور علمی ترقی کے لیے سب سے بڑا خطرہ بن جاتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾[1]

اور بے شک ہم نے بہت سے جن و انس دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں جن سے سمجھتے نہیں، آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے نہیں، کان ہیں جن سے سنتے نہیں، وہ چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔

تفسیر ابن کثیر میں ہے:

"أي لا ينتفعون بالعقل الذي وهبهم الله، فجمُدت أفكارهم عن الحقّ، وركنوا إلى الجهل والعصبية."[2]

یعنی وہ اللہ کی دی ہوئی عقل سے فائدہ نہیں اٹھاتے، ان کی فکر حق کے ادراک سے جمود کا شکار ہو جاتی ہے، اور وہ جہالت و تعصب پر جم جاتے ہیں۔

یہ آیت اس بات کو واضح کرتی ہے کہ جب انسان فکر و بصیرت سے کام لینا چھوڑ دے تو اس کی عقل جمود کا شکار ہو جاتی ہے، اور یہی علمی جمود انتہا پسندی کی بنیاد بنتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

(1) الأعراف:۱۷۹

(2) تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص۲۵۲

﴿قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ﴾[1]

کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں، ان کے برابر ہو سکتے ہیں جو نہیں رکھتے؟

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح کرتے ہیں:

"الآية دلالة على شرف العلم وذمّ الجهل، ومن ترك العلم ورضي بالجهل فقد جمد فكره وانحرف عن سبيل الحقّ."[2]

یہ آیت علم کی فضیلت اور جہالت کی مذمت پر دلالت کرتی ہے، اور جو علم کو چھوڑ کر جہالت پر راضی ہو جائے وہ فکری جمود اور راہِ حق سے انحراف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسلام میں علم کو بے حد اہمیت حاصل ہے، کیونکہ یہی انسان کو اپنے رب کی پہچان اور بندوں کی خدمت کا سلیقہ سکھاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں اہلِ علم کی تعریف اور جاہلوں کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ علم انسان کے کردار، سوچ اور اخلاق کو نکھارتا ہے، جبکہ جہالت اسے گمراہی اور تنگ نظری میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جو قوم علم سے غافل ہو جائے، وہ ترقی کے بجائے زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ جہاں علم کی قدر ختم ہو جائے، وہاں عقل و شعور کی روشنی بجھ جاتی ہے، اور اسی اندھیرے میں شدت پسندی اور فکری جمود جنم لیتے ہیں۔ اس لیے، صحیح راستے پر قائم رہنے اور فکری بیداری کے لیے علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ﴾[3]۔ کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنالیا؟

الطبری رحمہ اللہ وضاحت کرتے ہیں:

"أي أطاع هواه فيما أحبّ وكره، فصار عقله تابعًا لشهوته، ففقد ميزان الفكر السليم."[4]

یعنی اس نے اپنی خواہشات کی پیروی کی، جس کے نتیجے میں اس کی عقل خواہش کی غلام بن گئی اور صحیح فکر کا توازن ختم ہو گیا۔

جب انسان اپنی خواہشات کے قبضے میں آ جاتا ہے تو وہ عقل و شعور کی روشنی سے دور ہو جاتا ہے۔ خواہشات کی اندھی پیروی انسان کو حق اور باطل کے درمیان فرق سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔ ایسی کیفیت میں اس

---

[1] سورۃ الزمر: ۹

[2] تفسیر القرطبي، ج۱۵، ص۲۵۸

[3] سورۃ الفرقان: ۴۳

[4] تفسیر الطبري، ج۱۹، ص۳۴

کی فطرت کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ اپنی نفسانی خواہشات کو ہی سچائی کا معیار سمجھنے لگتا ہے۔ قرآن مجید نے ایسے لوگوں کو گمراہ اور نقصان اٹھانے والا قرار دیا ہے۔

اسی لیے عقل و فکر کی حفاظت اور صحیح رہنمائی اسی وقت ممکن ہے جب انسان اپنی خواہشات کو شریعت کے تابع رکھے۔ جو شخص خواہشات کے پیچھے چلتا ہے، وہ آہستہ آہستہ اپنے فکری شعور کو کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی سوچ مفلوج ہو جاتی ہے اور وہ حق کو سامنے دیکھنے کے باوجود قبول نہیں کرتا۔ یہی حالت علمی اور فکری جمود کہلاتی ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ((هلك المتنطعون» قالها ثلاثًا))۔[1] حد سے بڑھنے والے (انتہا پسند) ہلاک ہوئے نبی ﷺ نے یہ بات تین بار فرمائی۔

امام نووی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"المتنطعون: هم المتعمّقون في الكلام والاعتقاد بغير علم، فيقعون في الغلوّ الذي يفسد الفكر والدين."[2]

متنطعون: سے مراد وہ لوگ ہیں جو علم کے بغیر باتوں اور عقائد میں گہرائی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اسی

غلو کی وجہ سے فکری اور دینی فساد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

نبی ﷺ نے اس بات سے خبردار فرمایا کہ دینی معاملات میں غیر ضروری سختی اور فکری تکلف، عقل و علم کے توازن کو برباد کر دیتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الغلوّ في الدين يوجب الجمود العقلي، لأنّه يُغلق باب الاجتهاد، ويُفسد ميزان العقل."[3]

دین میں غلو عقلی جمود پیدا کرتا ہے، کیونکہ یہ اجتہاد کے دروازے بند کر دیتا ہے اور عقل کے توازن کو بگاڑ دیتا ہے۔

دین میں غلو دراصل اعتدال سے انحراف اور افراط و تفریط کا نام ہے۔ جب انسان دین کے احکام میں حد سے تجاوز کرتا ہے تو وہ فہم و تدبر کی راہ چھوڑ دیتا ہے۔ غلو کی یہی کیفیت عقل کو جمود اور فکر کو تعصب میں مبتلا کر دیتی ہے۔

---

(1) صحیح مسلم، رقم: ۲۶۷۰

(2) النووی، شرح صحیح مسلم، ج۱۶، ص ۲۲۰

(3) ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۰، ص ۱۶۴

نتیجتاً اجتہاد اور تحقیق کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور امت فکری زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔ اسلام نے ہمیشہ میانہ روی اور اعتدال کو دین کی اصل روح قرار دیا ہے۔ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"كلّ من جاوز حدّ الاعتدال في الفكر فقد خرج عن مقصود الشريعة، لأنّ الشريعة جاءت لرفع الجمود لا لإقراره."[1]

جو شخص فکری اعتدال کی حد سے تجاوز کرتا ہے وہ شریعت کے مقصد سے ہٹ جاتا ہے، کیونکہ شریعت جمود کو توڑنے کے لیے آئی ہے، اسے قائم رکھنے کے لیے نہیں۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو زندگی کے ہر پہلو میں توازن اور اعتدال سکھاتا ہے اور انسان کو ہر طرح کی انتہا پسندی سے دور رکھتا ہے۔ فکری اعتدال دراصل شریعت کی اصل روح ہے جو سوچ، دلیل اور عمل کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتی ہے۔ جو شخص اس اعتدال سے ہٹ جاتا ہے، وہ شریعت کے حقیقی مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔ شریعت انسان کو جمود اور سختی سے نکال کر غور و فکر، سمجھ بوجھ اور اصلاح کی راہ پر چلنے کی دعوت دیتی ہے۔ اسی اعتدال میں فرد کی کامیابی اور معاشرے کی بھلائی پنہاں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"من جمد فكره على ظاهر النصّ دون فهم المقصود، فقد عطل العقل وأغلق باب الحكمة."[2]

جو شخص نص کے ظاہر پر جم جائے اور اس کے مقصود کو نہ سمجھے، اس نے اپنی عقل کو معطل کر دیا اور حکمت کا دروازہ بند کر لیا۔

نصوصِ شرعیہ کا فہم محض الفاظ کے ظاہر تک محدود نہیں بلکہ ان کے مقاصد و حکمتوں کے ادراک سے مکمل ہوتا ہے۔ جو شخص صرف ظاہر پر اصرار کرتا ہے، وہ شریعت کی روح تک رسائی سے محروم رہتا ہے۔ ایسی روش عقل و تدبر کو معطل اور اجتہاد کے دروازے کو بند کر دیتی ہے۔ اسلام نے ہمیشہ غور و فکر، تفقہ فی الدین اور حکمت کی تلاش کو سراہا ہے۔ لہٰذا نصوص کے فہم میں مقاصدِ شریعت کا ادراک ناگزیر ہے تاکہ دین کی جامع حکمت واضح ہو۔

---

[1] الشاطبی، الاعتصام، ج ۲، ص ۱۵۰

[2] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۱۳۲

اجتہاد اور تجدیدِ فکر کا فقدان

انتہا پسندی انسان کی عقل و سوچ کو مفلوج کر دیتی ہے، جس کے نتیجے میں اجتہاد، تحقیق اور فکری تازگی کا عمل رک جاتا ہے۔ اس سے اسلامی فکر کی وسعت، گہری سمجھ اور نصوص کی درست تعبیر کی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے۔ ایسے معاشرے میں گفتگو کا دروازہ بند ہو جاتا ہے، اختلاف کو برداشت کے بجائے دشمنی سمجھا جاتا ہے، اور علم کے مقابلے میں تعصب کو اہمیت ملتی ہے۔ یہی جمود امتِ مسلمہ کے علمی زوال، اندرونی کمزوری اور فکری پستی کی جڑ بن جاتا ہے۔

قرآن و سنت سے واضح ہوتا ہے کہ فکری اور نظری انتہا پسندی دراصل غلو، تعصب، اور دین کی خود ساختہ تشریحات کا نتیجہ ہے۔ یہ رویہ امت کو علم، اتحاد، اور دانائی کے راستے سے ہٹا کر اختلاف، نفرت، اور تکفیر کی راہ پر لے جاتا ہے۔ اس سے دین کی روح کے بجائے ذاتی رائے اور ضد کو فوقیت مل جاتی ہے، جس کے نتیجے میں امت فکری طور پر منتشر اور نظری طور پر کمزور ہو جاتی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾[1]

اور ان لوگوں کی طرح نہ بنو جو واضح دلائل آنے کے بعد بھی تفرقہ میں پڑ گئے اور اختلاف کرنے لگے۔

اسلام کا پیغام ہمیشہ انتہا پسندی کے بجائے اعتدال، سوچ بچار اور فکری توازن پر مبنی ہے۔ یہ دین انسان کو زندگی کے ہر معاملے میں میانہ روی، برداشت، انصاف اور حکمت کے ساتھ چلنے کی ہدایت دیتا ہے تاکہ فرد اور معاشرہ دونوں فکری اور عملی طور پر مضبوط رہیں۔ اسلام میں کسی بھی معاملے میں حد سے بڑھ جانا پسندیدہ نہیں، چاہے وہ عقیدہ ہو، عبادت ہو یا باہمی تعلقات۔ اعتدال ہی وہ سنہری اصول ہے جو انسان کو افراط و تفریط کے خطرات سے محفوظ رکھتا ہے اور اسے سچائی، دانائی اور درست فہم کی راہ دکھاتا ہے۔ یہی توازن اسلام کے جامع اور آفاقی نظامِ فکر کا بنیادی جوہر ہے، جو انسانیت کو امن، عدل اور اعتدال کی راہ پر قائم رکھتا ہے۔

اسی فکری اور دینی انحراف کے بارے میں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ مذکورہ آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"التفرّق بعد البيان سببه الغلوّ والتعصّب للرأي، وهو من أعظم مظاهر الانحراف الفكري والديني."[2]

---

[1] آل عمران:۱۰۵

[2] تفسیر القرطبی، ج۴، ص۱۰۲

واضح دلائل کے باوجود تفرقے کا سبب غلو اور رائے پر تعصب ہے، جو فکری اور دینی انحراف کی بڑی علامت ہے۔ سورۃ المائدہ میں ہے:

﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِنْ قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا﴾[1]۔

کہہ دو اے اہلِ کتاب! اپنے دین میں ناحق حد سے نہ بڑھو، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے خود گمراہ ہوئے اور بہت سوں کو گمراہ کیا۔

امام طبری رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"النهي عن الغلوّ في الدين يشمل كلّ من تجاوز حدود الله في الاعتقاد أو العمل، لأنّ ذلك يفضي إلى الفتن والانقسام الفكري."[2]۔

دین میں غلو سے ممانعت ہر اس شخص کے لیے ہے جو عقیدہ یا عمل میں اللہ کی حدود سے تجاوز کرتا ہے، کیونکہ یہ رویہ فتنہ اور فکری تقسیم کا باعث بنتا ہے۔

اسلام اعتدال اور میانہ روی کا دین ہے جو ہر طرح کے غلو اور افراط سے روکتا ہے۔ دین میں غلو کا مطلب اللہ کی مقرر کردہ حدود سے تجاوز اور اپنے نظریات یا اعمال کو حد سے بڑھانا ہے۔ ایسا طرزِ عمل امت میں فتنہ، انتشار اور فکری انتشار پیدا کرتا ہے۔ قرآن و سنت نے واضح طور پر غلو کو گمراہی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ لہٰذا ایک مومن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عقیدہ و عمل میں اعتدال اور توازن کو قائم رکھے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

"الغلوّ في الدّين يفسد العقل كما يفسد العمل، لأنّه يخرج الإنسان عن مقصود الشريعة إلى التعصّب والبدعة."[3]

دین میں غلو عقل کو بھی بگاڑ دیتا ہے جیسے عمل کو بگاڑ دیتا ہے، کیونکہ یہ انسان کو شریعت کے مقصد سے ہٹا کر تعصب اور بدعت کی طرف لے جاتا ہے۔

---

[1] المائدۃ:۷۷

[2] تفسیر الطبری، ج۱۰، ص۳۲۱

[3] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۲۸، ص۵۲۵

امام شاطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فإنّ الغلوّ من أعظم أسباب الفتنة الفكرية، إذ يجعل الإنسان يظنّ الحقّ محصورًا في نفسه، فيكفّر غيره بغير علم."(1)

غلو فکری فتنے کا سب سے بڑا سبب ہے، کیونکہ یہ انسان کو یہ گمان دیتا ہے کہ حق صرف اسی کے پاس ہے، اور وہ دوسروں کو بغیر علم کے کافر قرار دیتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"من غلا في مذهبه فقد أعمى بصيرته، وصار يرى الخطأ صوابًا، والصواب خطأً."(2)

جو شخص اپنے مسلک میں غلو کرتا ہے، وہ اپنی بصیرت کھو دیتا ہے، یہاں تک کہ غلط کو درست اور درست کو غلط سمجھنے لگتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"من لم يعمل بعلمه ولا يزداد علماً وقع في الجمود والضلال. "(3)

جو اپنا علم بروئے کار نہ لائے اور علم میں اضافہ نہ کرے وہ جمود اور گمراہی کی طرف جاتا ہے۔

علم صرف معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ کردار، عمل اور اصلاح کا ذریعہ ہے۔ جو شخص علم حاصل کرنے کے باوجود اس پر عمل نہیں کرتا، وہ اس کے اصل مقصد سے محروم رہتا ہے۔ علم انسان کو بصیرت، روشنی اور نیک عمل کی طرف رہنمائی دیتا ہے، جبکہ اس پر عمل نہ کرنا فکری جمود اور عملی کمزوری پیدا کرتا ہے۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کو گمراہ قرار دیا ہے جو علم رکھتے ہیں مگر اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے، جیسے اندھیرے میں بھٹکنے والے مسافر۔ اگر علم انسان کے کردار میں بہتری نہ لائے تو وہ بوجھ بن جاتا ہے۔ اہلِ علم کی حقیقی قدر اسی وقت ہے جب وہ اپنے علم پر عمل کریں اور اس میں ترقی کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں۔ اسلام نے علم کے حصول اور اس کی تجدید کو عبادت قرار دیا ہے، کیونکہ جو شخص سیکھنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ کھو دیتا ہے، وہ زمانے سے پیچھے رہ جاتا ہے۔ علم کا تقاضا یہی ہے کہ انسان ہمیشہ غور، فکر اور عمل کی جستجو میں مصروف رہے۔

---

(1) الشاطبی، الاعتصام، ج ۲، ص ۱۵۲

(2) الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۹۴

(3) الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۳، ص ۹۴

اسلام ایک زندہ اور بیدار دین ہے جو انسان کی عقل، سوچ اور اجتہاد کو جمود سے آزاد رکھنا چاہتا ہے۔ شریعت کا مقصد صرف عبادات تک محدود نہیں، بلکہ فکری بیداری اور علمی ارتقاء کو فروغ دینا بھی ہے۔ امام غزالی، ابن تیمیہ، اور امام شاطبی جیسے ائمہ نے واضح کیا ہے کہ اجتہاد، غور و فکر، اور تجدیدِ علم ہی امت کی فکری زندگی کی علامت ہیں۔ جب امت اجتہاد کو چھوڑ دیتی ہے، تو اس کی فکری قوت کمزور ہو جاتی ہے اور معاشرہ غفلت و جمود کا شکار ہوتا ہے۔ یہی جمود آگے چل کر تعصب، انتہا پسندی، اور علمی زوال کا سبب بنتا ہے۔ شریعت انسان کو عقل اور وحی کے درمیان توازن سکھاتی ہے، تاکہ وہ دین کو سمجھنے میں میانہ روی اختیار کرے۔ اس لیے اہلِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ اجتہاد کا تسلسل امت کی فکری تازگی اور عملی ترقی کے لیے ضروری ہے۔ علم اور فکر کی تجدید دراصل اسلام کی بقا اور عروج کی ضمانت ہے، جو اسے ہر زمانے میں زندہ اور مؤثر رکھتی ہے۔

قرآنِ کریم کی تعلیمات اور مفسرین و ائمہ کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب انسان دین میں توازن اور اعتدال کھو دیتا ہے تو اس کی عقل و فکر سب سے پہلے متاثر ہوتی ہے۔ انتہا پسندی ذہن کو جامد کر دیتی ہے، جس سے تحقیق، تدبر اور اجتہاد کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ایسا شخص دین کے وسیع اور رحمت والے پیغام کو محدود کر کے صرف اپنے فہم کو ہی درست سمجھتا ہے۔ یہی رویہ تعصب، تکفیر، اور فکری جمود کو جنم دیتا ہے، جو امت کی وحدت کو نقصان پہنچاتا ہے اور علمی ترقی کی راہیں بند کر دیتا ہے۔ نتیجتاً دین کی روحانیت، اخلاق اور علم پسِ منظر میں چلے جاتے ہیں، اور دین ایک سخت نظریاتی شکل اختیار کر لیتا ہے جس میں برداشت، مکالمہ اور اختلافِ رائے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہی فکری انحراف معاشرتی بگاڑ، مذہبی شدت پسندی، اور علمی زوال کی بنیاد بنتا ہے۔

فصل دوم

مذہبی رواداری کا فقدان اور فرقہ وارانہ تنازعات

فصل دوم

مذہبی رواداری کا فقدان اور فرقہ وارانہ تنازعات

مذہبی رواداری کسی بھی مہذب، پرامن اور متوازن معاشرے کی روح ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جو انسانوں کے درمیان باہمی احترام، امن، محبت اور اتحاد کو پروان چڑھاتی ہے۔ جب معاشرے سے رواداری ختم ہو جاتی ہے تو وہاں فکری تنگی، نفرت اور تصادم جنم لیتے ہیں، اور انسان انسان کا دشمن بن جاتا ہے۔ اسلام نے عدل، اعتدال، اور اختلافِ رائے کے احترام کو امت کی وحدت کی بنیاد قرار دیا ہے، کیونکہ یہی اوصاف معاشرتی ہم آہنگی اور دینی بصیرت کو مضبوط کرتے ہیں۔ لیکن جب دین کے نام پر تعصب، گروہ بندی، اور خود ساختہ تعبیرات کو فروغ دیا جاتا ہے تو رواداری کی جگہ شدت پسندی لے لیتی ہے۔

ایسی فضا میں فرقہ وارانہ کشیدگی، فکری جمود اور مذہبی انتشار پیدا ہوتا ہے، جو امت کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ مسلم معاشروں میں انتہا پسندی کا سب سے خطرناک اثر یہی ہے کہ اس نے دین کے فہم میں تنگ نظری اور انانیت کو عام کر دیا ہے، نتیجتاً امت باہمی برداشت اور اخوت کے جذبے سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔ مختلف گروہ ایک دوسرے کو غلط اور گمراہ قرار دینے لگے ہیں، جس سے دین کی اصل روح —یعنی محبت، انصاف، اور بھائی چارہ— متاثر ہوئی ہے۔ یہ رویہ نہ صرف فکری زوال بلکہ سیاسی و سماجی کمزوری کا بھی سبب بن رہا ہے۔

قرآن و سنت نے امت کو سختی سے تفرقہ، تعصب، اور گروہ بندی سے روکا ہے، کیونکہ یہ وہ زہر ہے جو امت کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتا ہے۔ لہٰذا آج کے دور میں مذہبی رواداری کا فروغ، برداشت کے کلچر کی بحالی، اور فرقہ وارانہ انتہاپسندی کا خاتمہ مسلم معاشروں کی فکری، اخلاقی اور عملی اصلاح کے لیے نہایت ضروری ہے۔ یہی رویہ امت کو دوبارہ اتحاد، امن، اور ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ﴾[1]

اور ان لوگوں کی مانند مت ہو جاؤ جو (حق کے باوجود) تفرقہ و اختلاف اختیار کر گئے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"يَنْهَى اللَّهُ تَعَالَى عِبَادَهُ الْمُؤْمِنِينَ أَنْ يَكُونُوا كَالْأُمَمِ الَّتِي افْتَرَقَتْ عَلَى أَنْبِيَائِهَا بَعْدَهُمْ، وَأَقَامُوا الْخِلَافَ فِي دِينِ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ"۔[2]

اللہ تعالیٰ اپنے مؤمن بندوں کو منع فرماتا ہے کہ وہ ان قوموں کی مانند نہ ہو جائیں جنھوں نے اپنے انبیاء کے

---

[1] سورۃ آل عمران:۱۰۵

[2] تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص۹۴

بعد تفرقہ ڈال دیا، باوجود اس کے کہ ان کے پاس واضح دلائل آچکے تھے، پھر بھی انہوں نے دینِ الٰہی میں اختلاف اور جھگڑا شروع کر دیا۔

اسلام ایک ایسا دین ہے جو اتحاد، اتفاق اور بھائی چارے کی تعلیم دیتا ہے، اور امت کو تفرقہ، دشمنی اور گروہ بندی سے سختی سے منع کرتا ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو خبر دار فرمایا ہے کہ وہ ان قوموں کی طرح نہ بن جائیں جنہوں نے اپنے انبیاء کے بعد اختلافات پیدا کر کے آپس میں بٹوارہ کر لیا۔ حالانکہ ان کے پاس اللہ کی کتاب، واضح ہدایات اور سچی دلیلیں موجود تھیں، مگر انہوں نے حسد، انا، اور خود غرضی کے باعث دین کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ ان کا یہی رویہ ان کی اخلاقی اور روحانی تباہی کا سبب بنا۔

اسلام کا مقصد امت کو ایک عقیدہ، ایک مقصد، اور ایک شریعت کے تحت جمع کرنا ہے تاکہ وہ اجتماعی قوت کے ساتھ دین کے پیغام کو دنیا میں پھیلائیں۔ تفرقہ دراصل فکری کمزوری اور روحانی زوال کی علامت ہے، جو امت کو کمزور اور باہم متصادم کر دیتا ہے۔ قرآن نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ اتحاد میں قوت ہے اور اختلاف کمزوری کا باعث بنتا ہے۔ اس لیے اہلِ ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی فکری وحدت، دینی اخوت، اور باہمی محبت کو قائم رکھیں، کیونکہ یہی وحدت اسلام کی اصل روح اور امت کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

امام فخر الدین الرازي رحمہ اللہ اس آیت کی تشریح یوں کرتے ہیں:

"الاختلاف في الدين بعد وضوح الدليل من أعظم أسباب الهلاك، ولذلك نهى الله المؤمنين أن يكونوا مثل من تفرق واختلف بعد مجيء البينات"۔[1]

دلیل واضح ہونے کے بعد دین میں اختلاف کرنا ہلاکت کے سب سے بڑے اسباب میں سے ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مومنین کو منع فرمایا کہ وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہوں جنہوں نے واضح دلائل کے باوجود تفرقہ اور اختلاف پیدا کیا۔

اسلام نے اتحاد و اتفاق کو امت کی بقا، استحکام اور طاقت کی بنیاد قرار دیا ہے، جبکہ اختلاف اور تفرقہ کو تباہی اور کمزوری کا سبب بتایا ہے۔ جب حق واضح ہو جائے اور دلائل روشن ہو جائیں، تو اس کے بعد اختلاف کرنا ضد، تعصب اور خود پسندی کی علامت بن جاتا ہے۔ ایسی روش انسان کو فکری گمراہی میں مبتلا کر دیتی ہے اور امت کے اخلاقی و عملی اتحاد کو پارہ پارہ کر دیتی ہے۔ قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ان پچھلی قوموں کی طرح نہ بن جائیں جنہوں نے علم، وحی اور دلائل کے باوجود تفرقہ پیدا کیا۔ ان کے اختلافات حسد، بغض اور انتقام میں تبدیل ہو گئے، جس نے ان کی ہلاکت کا سامان کیا۔

---

(1) الرازی، التفسیر الکبیر، ج۸، ص۲۲۰

اسلام کی شریعت کا مقصد یہ ہے کہ امت ایک ایمان، ایک نصب العین، اور ایک قیادت کے تحت متحد رہے تاکہ اس کی اجتماعی قوت قائم رہے۔ دین میں اختلاف دراصل ہدایت سے دوری اور حق کے انکار کے مترادف ہے۔ جو قوم واضح حق کے باوجود باہمی جھگڑوں میں مبتلا ہو جاتی ہے، وہ زوال اور کمزوری کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایک سچے مومن کا فرض ہے کہ وہ حق پر قائم رہے، اختلاف سے بچے، اور امتِ مسلمہ کے اتحاد و یگانگت کی حفاظت کو اپنی دینی ذمہ داری سمجھے۔

ارشاد باری تعالی ہے:﴿ إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ﴾[1]۔

یقیناً جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا اور مختلف فرقوں میں بٹ گئے، (اے نبی!) آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

فخر الرازی ؒ لکھتے ہیں:

"المراد أنهم تركوا الدين الحق الذي أُمروا به، وتحيّزوا إلى فرقٍ متفرقةٍ، فصار كل حزبٍ بما لديهم فرحون، وذلك أعظم أسباب الفتنة والضلال"[2]۔

مراد یہ ہے کہ انہوں نے اس دینِ حق کو چھوڑ دیا جس کا انہیں حکم دیا گیا تھا، اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے، یہاں تک کہ ہر گروہ اپنی بات پر خوش ہونے لگا۔ یہی تفرقہ فتنہ اور گمراہی کے سب سے بڑے اسباب میں سے ہے۔

اسلام نے امتِ مسلمہ کو ایک دین، ایک عقیدہ، اور ایک شریعت پر متحد رہنے کی ہدایت دی ہے۔ دینِ حق کی بنیاد توحید، اطاعتِ الٰہی، اور رسولِ اکرم ﷺ کی پیروی پر قائم ہے۔ جب انسان اس مضبوط بنیاد سے ہٹ کر اپنی خواہشات، تعصبات، اور گروہی مفادات کے پیچھے چلنے لگتا ہے تو امت میں تفرقہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی تفرقہ امت کی کمزوری، زوال، اور فتنوں کا بنیادی سبب بن جاتا ہے۔ قرآنِ مجید نے ان قوموں کی سخت مذمت کی ہے جنہوں نے دینِ الٰہی کو چھوڑ کر گروہوں میں بٹوارا کیا۔ ہر گروہ اپنی رائے اور نظریے کو ہی حق سمجھنے لگا اور یوں وہ اصل سچائی سے دور ہو گئے۔

یہ طرزِ عمل نہ صرف فکری گمراہی کو جنم دیتا ہے بلکہ عملی انتشار اور باہمی نفرت کو بھی بڑھاتا ہے۔ اسلام کا حقیقی پیغام اتحاد، بھائی چارے، اور باہمی تعاون پر مبنی ہے۔ امتِ مسلمہ کی عزت، عظمت، اور طاقت اسی میں ہے کہ وہ ایک دین اور ایک عقیدے پر قائم رہے۔ تفرقہ دراصل فتنہ، کمزوری، اور گمراہی کے دروازے کھول دیتا ہے،

---

[1] سورۃ الأنعام:۱۵۹

[2] الرازی، التفسیر الکبیر، ج۱۴، ص۲۲۱

جس کے نتیجے میں ایمان کی روشنی مدھم اور وحدت کی طاقت کمزور پڑ جاتی ہے۔

علامہ القرطبی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"أي: الذين اختلفوا في أديانهم على أهوائهم وآرائهم فصاروا فِرَقاً وأحزاباً، ﴿لَسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ﴾ أي: برئتَ منهم ومن فعلهم. وهذا نهيٌ عن التشبه بهم، وأمرٌ بلزوم الجماعة"[1]۔

یعنی وہ لوگ جنہوں نے اپنی خواہشات اور خود ساختہ آراء کے مطابق اپنے دین میں اختلافات پیدا کیے، اور فرقوں اور گروہوں میں بٹ گئے تو (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) آپ ان سے بری ہیں "یعنی آپ کا ان سے اور ان کے طرزِ عمل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس آیت میں ان جیسے بننے سے ممانعت اور جماعت و اتحاد پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

امام ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

والظاهر أن الآية عامة في كل من فارق دين الله، وكان مخالفًا له، فإن الله بعث رسوله بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله، وشرعه واحد لا اختلاف فيه ولا افتراق."[2]۔

یہ بات واضح ہے کہ یہ آیت عام مفہوم رکھتی ہے — جو کوئی بھی دینِ الٰہی میں تفرقہ پیدا کرے یا اس کی مخالفت کرے، وہ اس وعید میں شامل ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ اس لیے بھیجا کہ وہ اسے تمام مذاہب پر غالب کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ایک ہی ہے، اس میں نہ اختلاف ہے نہ تفرقہ۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کو فرقہ بندی، گروہ بندی اور مذہبی اختلافات سے دور رہنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ یہ ہدایت مسلمانوں کو پچھلی امتوں، خصوصاً یہود و نصاریٰ، کے انجام سے سبق لینے کے لیے دی گئی تاکہ وہ دین میں اتحاد، اعتدال، اور بھائی چارے کو قائم رکھیں۔ اختلاف اگر حق کی تلاش اور خیر خواہی کے جذبے سے ہو تو وہ باعثِ رحمت ہے، لیکن جب وہ ضد، تعصب اور تکبر پر مبنی ہو جائے تو وہ انتہا پسندی اور فرقہ واریت کا سبب بنتا ہے۔ یہی وہ خطرناک کیفیت ہے جو مسلم معاشروں میں فکری انتشار، اخلاقی زوال اور مذہبی تصادم کو جنم دیتی ہے۔

---

[1] القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، ج۷، ص۶۷

[2] تفسیر ابن کثیر، ج۳، ص۳۸۳

آج کے دور میں امتِ مسلمہ کو جس سب سے بڑے فتنہ اور چیلنج کا سامنا ہے، وہ فرقہ واریت ہے۔ ہر مسلک اور جماعت اپنے آپ کو حق پر سمجھتی ہے اور دوسروں کو غلط قرار دیتی ہے۔ یہ عدم برداشت اس قدر بڑھ چکی ہے کہ بعض اوقات بات ایک دوسرے کی تکفیر اور نفرت تک جا پہنچتی ہے۔ حالانکہ قرآنِ مجید اور احادیثِ نبویہ ﷺ میں واضح طور پر تفرقہ ڈالنے، گروہ بندی کرنے، اور امت کو تقسیم کرنے سے سختی سے روکا گیا ہے۔ اسلام کا پیغام وحدت، برداشت، اور احترامِ اختلاف پر قائم ہے، اور اسی میں امت کی بقا، استحکام اور ترقی کی ضمانت پوشیدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ﴾[1]۔ تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔

اس آیت میں حبل اللہ سے مراد قرآن کریم ہے۔ جس کو مضبوطی سے تھامنے کا حکم ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إن الله لا يجمع امتي اوقال:امة محمد على ضلالة ويد الله على الجماعة ومن شذ شذ في النار))[2]۔

اللہ تعالیٰ میری امت کو یا فرمایا محمد ﷺ کی امت کو گمراہی پر جمع نہیں کرے گا اور اللہ تعالیٰ کا ہاتھ جماعت پر ہے اور جو شخص جماعت سے جدا ہوا وہ جہنم میں الگ ڈالا جائے گا۔

ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِن تَكُونُوا هُنَا أَوْ هُنَاكَ، فَمَن أَرَادَ أَن يُفَرِّقَ أَمْرَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ، وَهِيَ جَمِيعٌ، فَاضْرِبُوهُ بِالسَّيْفِ، كَائِنًا مَنْ كَانَ))[3]

چاہے تم یہاں ہو یا وہاں، اگر کوئی شخص اس امت کے اتحاد میں تفرقہ ڈالنے کی کوشش کرے، جبکہ امت متحد ہو، تو تم اس کو تلوار سے قتل کر دو، چاہے وہ کوئی بھی ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو ایک آیت ایسے انداز سے پڑھتے سنا جو رسول اللہ ﷺ کی قراءت سے مختلف تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا، پھر سارا واقعہ بیان کیا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے چہرہ مبارک پر ناگواری کے آثار ظاہر ہوئے۔ آپ ﷺ نے

---

[1] آل عمران:۱۰۳

[2] الترمذی، سنن الترمذی، مصر، ج۴، ص۴۶۶

[3] مسند احمد، حدیث:۱۸۷۰۶

فرمایا: ((كِلَاكُمَا مُحْسِنٌ، فَلَا تَخْتَلِفُوا، فَإِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ اخْتَلَفُوا فَهَلَكُوا))[1]-

تم دونوں اچھا پڑھتے ہو، لیکن آپس میں اختلاف نہ کرو، کیونکہ تم سے پہلے لوگ اختلاف ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئے۔

درج بالا قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں فرقہ واریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ آج امتِ مسلمہ متعدد فرقوں میں بٹ چکی ہے۔ قرآن و سنت کی واضح تعلیمات کے باوجود امت کا اس مرض میں مبتلا ہونا نہ صرف باعثِ تشویش ہے بلکہ یہ تقسیم اُمت کو تباہی اور زوال کی راہ پر گامزن کر رہی ہے۔

انتہاپسندی کے مذہبی و فرقہ وارانہ اثرات کے بارے میں ائمہ کے اقوال:

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"إنَّ مِن أعظمِ أسبابِ الفُرقةِ والاختلافِ بين المسلمين هو الغلوُّ في الدِّين، والتعصُّبُ للرأي والمذهبِ، فإن الغلوَّ يُولِّدُ العداوةَ والبغضاءَ ويقطعُ أواصرَ الأُخوّةِ" [2]-

مسلمانوں میں تفرقہ اور اختلاف کے سب سے بڑے اسباب میں سے ایک دین میں غلو اور رائے و مسلک میں تعصب ہے، کیونکہ غلو دشمنی، بغض اور اخوت کے رشتے توڑ دیتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ مذہبی انتہاپسندی دراصل اخوتِ اسلامی کو نقصان پہنچاتی ہے۔ جب افراد یا گروہ اپنی فقہی یا فکری رائے کو مطلق حق سمجھنے لگتے ہیں، تو وہ دوسروں کی رائے کے لیے برداشت کھو دیتے ہیں، نتیجتاً فرقہ واریت، مسلکی تصادم اور مذہبی کشیدگی جنم لیتی ہے۔

اسی بات کو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایک دوسرے پیرائے میں بیان کرتے ہیں، آپ بیان کرتے ہیں:

"ما أفسدَ الدينَ إلا التعمُّقُ في الخلافِ، وتغليبُ العصبيّةِ للمذاهبِ، فصار الناسُ يَتقاتلونَ باسمِ الدينِ والدينُ منهم براءٌ"[3]-

دین کو سب سے زیادہ نقصان اختلاف میں حد سے بڑھ جانے اور مذاہب کے لیے تعصب اختیار کرنے سے پہنچا، یہاں تک کہ لوگ دین کے نام پر لڑنے لگے، حالانکہ دین ان کے طریقوں سے بری ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، حدیث: ۳۴۷۶

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۳، ص۳۴۶

[3] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج۲، ص۱۸۲

یہ قول مذہبی تنازعات کی فکری جڑوں کو ظاہر کرتا ہے۔ امام غزالیؒ نے واضح کیا کہ اختلافِ رائے جب عقیدہ و دین کا درجہ اختیار کر لے تو وہ روحِ دین کو مجروح کر دیتا ہے۔ یہی رویہ مسلم معاشروں میں مذہبی انتہا پسندی کو ہوا دیتا ہے، جہاں دین اتحاد کی بجائے تقسیم کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ وضاحت کرتے ہیں:

"كلُّ فرقةٍ غلتْ في جانبٍ من الدينِ، فتركتْ جانبًا آخرَ، فقد وقعتْ في الفسادِ والاختلافِ، لأن الدينَ كلٌّ لا يتجزأُ"[1]۔

جو بھی جماعت دین کے کسی ایک پہلو میں غلو کرے اور دوسرے پہلو کو ترک کر دے، وہ فساد اور اختلاف میں مبتلا ہو جاتی ہے، کیونکہ دین ایک مکمل نظام ہے جو تقسیم نہیں ہو سکتا۔

امام ابن القیمؒ کے نزدیک جزوی غلو (انتہا پسندی) بھی امت کے تفرقہ کا باعث بنتا ہے۔ جب کوئی گروہ اپنی مخصوص تعبیر یا رائے کو پورے دین پر نافذ کرنے لگتا ہے تو وہ توازن اور اعتدال کھو دیتا ہے۔ یہی رویہ مختلف فقہی اور فکری گروہوں میں عدمِ برداشت اور سخت رویوں کو جنم دیتا ہے، جو آخر کار مذہبی تصادم میں بدل جاتا ہے۔ اس طرح امت کا اتحاد کمزور پڑتا ہے اور دین کے اصل مقاصد پس پشت چلے جاتے ہیں۔

ہر مذہب کی اصل پہچان اس کے ماننے والوں کے اخلاق، کردار اور طرزِ عمل سے ہوتی ہے، نہ کہ صرف عقائد و نظریات سے۔ جب پیروکار حسنِ اخلاق، عدل، اور نرمی اختیار کرتے ہیں تو مذہب کو عزت ملتی ہے، مگر جب وہ سختی، تعصب اور انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو بدنامی اور نفرت پیدا ہوتی ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب نہ بنو، لہٰذا ہمیں اپنے قول و عمل میں وہ نرمی، برداشت اور اخلاق اپنانا چاہیے جو اسلام کی اصل روح ہے

امام الشاطبی رحمہ اللہ کا قول ہے:

"التشددُ في الدينِ يُنتجُ الفتنةَ والفرقةَ، والوسطيةُ تُنتجُ الوحدةَ والرحمةَ"[2]

دین میں سختی اور تشدد فتنہ و تفرقہ پیدا کرتے ہیں، جبکہ اعتدال اتحاد و رحمت کو جنم دیتا ہے۔

یہ قول اسلام کے اس اصول کی وضاحت کرتا ہے کہ اعتدال (الوسطیۃ) ہی ایک متوازن اور پرامن معاشرتی نظام کی بنیاد ہے۔ امام شاطبیؒ کے نزدیک جب انسان دین میں شدت اور غلو اختیار کرتا ہے تو اس کا انجام ہمیشہ فساد، اختلاف اور باہمی نفرت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی معاشرہ اعتدال کے راستے سے ہٹ جائے تو وہاں توازن، انصاف اور رواداری ختم ہو جاتی ہے اور مذہبی کشیدگی جنم لیتی ہے۔ اسلام کا پیغام دراصل میانہ روی اور

---

[1] ابن القیم، مدارج السالکین، ج۱، ص ۸۵

[2] الشاطبی، الاعتصام، ج۲، ص ۲۹۲

انصاف پر مبنی ہے، جس سے عدل، امن اور بھائی چارہ قائم رہتا ہے۔

ائمہ کرام کے اقوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انتہا پسندی کی اصل جڑ دین کے فہم میں غلو، تعصب اور محدود سوچ ہے۔ جب کوئی گروہ اپنی تشریح کو دین کی واحد سچائی سمجھ کر دوسروں پر مسلط کرتا ہے تو اس سے اختلاف اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ یہی روش اسلامی اخوت، سماجی امن اور فکری برداشت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ جب مذہبی رہنما اجتہاد، حکمت اور اعتدال کے اصولوں سے دور ہو جائیں تو امت کئی گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے، اور یہ تقسیم فکری و عملی کمزوری کا سبب بن جاتی ہے۔

شدت پسندی نے امتِ مسلمہ میں سب سے زیادہ نقصان تفرقہ کی صورت میں پہنچایا ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی ادوار میں پیدا ہونے والے اکثر فرقے دراصل اسی غلو اور عدمِ اعتدال کا نتیجہ تھے۔ آج کے دور میں بھی یہی رجحان دو پہلوؤں سے امت کو نقصان پہنچا رہا ہے: پہلا یہ کہ لوگ اعتدال کے راستے سے ہٹ کر شدت پسند رویے اختیار کر چکے ہیں، جس سے ان کے خیالات، اعمال اور رویوں میں توازن ختم ہو گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ اس انتہا پسندی نے دینی غیرت کو کمزور کر کے مسلکی اور جماعتی تعصبات کو فروغ دیا ہے۔ اب اسلام کی پہچان اس کی اصل تعلیمات کے بجائے فرقوں اور گروہوں کے ذریعے ہونے لگی ہے، اور اس کے نتیجے میں دین میں خود ساختہ نظریات داخل ہو گئے ہیں جو اس کی روح کے منافی ہیں۔

انتہا پسندی نے مذہبی برداشت اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو اس حد تک متاثر کیا ہے کہ آج کا مسلمان معاشرہ نفرت اور بداعتمادی میں مبتلا ہے۔ وہ دین جو غیر مسلموں کے ساتھ بھی انصاف، محبت اور انسانیت کا درس دیتا ہے، اس کے ماننے والے آج ایک دوسرے پر کفر کے فتوے لگانے سے بھی نہیں ہچکچاتے۔ ماضی میں اگرچہ فکری اختلافات موجود تھے، مگر لوگ صلہ رحمی، برداشت اور احترام کے قائل تھے۔ وقت کے ساتھ ان اختلافات میں شدت آئی اور امت دو مخالف گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ فرقہ واریت نے معاشرے کو تشدد اور خونریزی کی طرف دھکیل دیا۔

مسلکی اختلافات اور عدمِ برداشت

انتہا پسندی اب کسی ایک طبقے تک محدود نہیں رہی بلکہ معاشرے کے مختلف طبقات میں سرایت کر چکی ہے۔ اس مسلکی منافرت نے تکفیری سوچ کو فروغ دیا اور عوام میں علما کی عزت و وقار کو مجروح کیا۔ ہر فرقہ اپنے نظریے کو درست ثابت کرنے کے لیے دلائل پیش کرتا ہے اور دوسروں کے مؤقف کو رد کرتا ہے، جس کے نتیجے میں باہمی رویوں میں سختی اور نفرت پیدا ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ فرقہ واریت ایک تباہ کن عمل ہے جس نے پچھلی امتوں کو بھی ہلاکت میں ڈالا۔ اسی لیے امتِ محمدیہ کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ سابقہ قوموں کی طرح فرقہ واریت کے راستے پر نہ چلے۔ قرآنِ کریم نے ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے جو تفرقہ ڈالتے ہیں کہ اے نبی ﷺ! آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ دین کا مقصد اختلاف نہیں بلکہ اتحاد، محبت اور ہدایت کا قیام ہے۔

فصل سوم

خاندانی و سماجی زندگی میں انتہا پسندی کے مظاہر

فصل سوم

خاندانی و سماجی زندگی میں انتہا پسندی کے مظاہر

مسلم معاشروں میں خاندانی انتشار دراصل انتہا پسندی کے براہِ راست اثرات میں سے ایک ہے۔ انتہا پسندی ایک ایسا طرزِ فکر ہے جو انسانی معاشرے کے توازن، ہم آہنگی اور اخلاقی استحکام کو بری طرح متاثر کر دیتا ہے۔ جب یہ رویہ کسی فرد یا گروہ میں جڑ پکڑ لیتا ہے تو وہ برداشت، احترام اور اعتدال سے دور ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً خاندانی رشتوں میں محبت کے بجائے نفرت، نرمی کے بجائے سختی، اور باہمی اعتماد کے بجائے بدگمانی پیدا ہو جاتی ہے۔ گھر، جو محبت اور سکون کا مرکز ہونا چاہیے، فکری اختلافات اور تعصبات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں بات چیت ختم ہو جاتی ہے اور اختلاف دشمنی میں بدل جاتا ہے، جس سے خاندان کے افراد کے درمیان اعتماد، سکون اور احترام کا رشتہ ٹوٹنے لگتا ہے۔

انتہا پسندی دراصل انسان کے فکری اور اخلاقی ڈھانچے کو متزلزل کر دیتی ہے۔ یہ رویہ نہ صرف فرد کی سوچ اور عمل کو متاثر کرتا ہے بلکہ پورے معاشرتی اور خاندانی نظام کو کمزور کر دیتا ہے۔ خاندان، جو معاشرے کی بنیادی اکائی ہے، اس وقت عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے جب اس کے ارکان کے درمیان برداشت اور مفاہمت ختم ہو جائے۔ ایسے گھرانوں میں محبت و تعاون کی جگہ ضد، جبر اور برتری کی سوچ لے لیتی ہے۔ یہی رویہ آہستہ آہستہ سماجی سطح پر پھیل کر معاشرتی اعتماد، امن اور ہم آہنگی کو زائل کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں معاشرہ نفرت، بداعتمادی اور عدم برداشت کا شکار ہو جاتا ہے، جو اجتماعی زوال کی علامت ہے۔

محبت و حسنِ سلوک کا فقدان

انتہا پسندی دراصل ایک نفسیاتی اور فکری انحراف ہے جو انسان کے رویوں کو شدت اور عدم برداشت کی طرف موڑ دیتا ہے۔ جب یہ رجحان خاندانی زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ محبت، شفقت اور حسنِ سلوک کی بنیادوں کو ہلا دیتا ہے۔ گھر کا ماحول، جو امن و سکون کا گہوارہ ہوتا ہے، سختی، الزام تراشی اور بے اعتمادی کا شکار ہو جاتا ہے۔ والدین اور اولاد کے درمیان فکری خلیج پیدا ہوتی ہے، اور میاں بیوی کے تعلقات میں دراڑیں پڑنے لگتی ہیں۔ اس کیفیت میں مکالمے اور سمجھوتے کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے، اور ہر فرد اپنی رائے کو برتر سمجھنے لگتا ہے۔ نتیجتاً خاندان اپنی اصل روح—یعنی محبت، برداشت اور باہمی احترام—کھو بیٹھتا ہے۔

یہ انتہا پسندی صرف مذہبی معاملات تک محدود نہیں رہتی بلکہ سیاسی، فکری اور ثقافتی سطح پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں افراد کے درمیان تعلقات سرد پڑ جاتے ہیں اور اجتماعی تربیت کا نظام کمزور ہو جاتا ہے۔

یہی وہ پس منظر ہے جس میں انتہا پسندی کے خاندانی وسماجی اثرات کو سمجھنااور ان کا سدِباب کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، تاکہ معاشرہ دوبارہ محبت، رواداری اور اعتدال کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں اس کے سماجی و خاندانی اثرات کو دلائل کی روشنی میں سمجھنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا﴾[1]۔

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک درمیانہ (اعتدال پسند) امت بنایا۔

اس آیت میں امتِ مسلمہ کو اعتدال اور توازن کی صفت اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب انسان یا خاندان دین یا دنیا کے معاملات میں افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں، تو اعتدال کی یہ خصوصیت ختم ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً گھرانوں میں سخت گیری، الزام تراشی، اور رواداری کی کمی پیدا ہوتی ہے، جو بالآخر خاندانی انتشار کا باعث بنتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ))۔[2]

دین میں غلو (انتہا پسندی) سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو غلو ہی نے ہلاک کیا۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ انتہا پسندی صرف مذہبی بگاڑ نہیں بلکہ سماجی و اخلاقی تباہی کا ذریعہ بھی ہے۔ جب خاندان کے افراد اپنے نظریات یا طرزِ عبادت کو دوسروں پر زبردستی نافذ کرنے لگتے ہیں، تو اعتماد، محبت، اور اتفاق کی فضا ٹوٹ جاتی ہے۔ یہی خاندانی انتشار کی جڑ ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

"لَا تَرَى الْجَاهِلَ إِلَّا مُفْرِطًا أَوْ مُفَرِّطًا"۔[3]

تم کسی جاہل کو نہیں دیکھو گے مگر وہ یا تو حد سے بڑھا ہوا ہو گا یا حد سے کم۔

حضرت علیؓ کا یہ قول انسانی رویّوں میں توازن کی ضرورت کو نہایت خوبصورتی سے واضح کرتا ہے۔ دراصل، جہالت اور انتہا پسندی آپس میں گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ جب گھر کے افراد علم، فہم، اور برداشت سے دور ہو جاتے ہیں، تو ان کے رویّے یا تو ضرورت سے زیادہ سخت ہو جاتے ہیں یا بالکل لاپرواہ، اور یہی رویہ خاندانی اختلافات اور بے سکونی کا سبب بنتا ہے۔ انتہا پسندی انسان کے جذباتی توازن کو بھی بگاڑ دیتی ہے — کبھی محبت اور شفقت حد سے بڑھ کر بے جا

---

[1] سورۃ البقرہ: ۱۴۳

[2] سنن ابن ماجہ، حدیث: ۳۰۲۹

[3] نہج البلاغہ، حکمت ۷۰

جذبات میں ڈھل جاتی ہے، تو کبھی دل بالکل سخت اور بے حس ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں خاندان کے افراد کے درمیان گرم جوشی، قربت، اور باہمی ایثار کم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ، محبت اور حسنِ سلوک کا فقدان انتہا پسندی کے خاندانی زندگی پر سب سے نمایاں اور خطرناک اثرات میں سے ایک ہے۔

امام حسن البصری رحمہ اللہ (۱۱۰ھ) کا قول ہے:

"ما ازداد عبدٌ تشدُّدًا في الدين إلا ازداد من الخلق بُعدًا"[1].

جو شخص دین میں سختی اختیار کرتا ہے، وہ لوگوں سے دور ہوتا جاتا ہے۔

یہ قول خاندانی تعلقات کے لیے نہایت موزوں ہے، کیونکہ جب فرد شدت اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی سختی برتتا ہے، اور محبت و حسنِ سلوک ختم ہو جاتا ہے۔ انتہا پسندی انسان کو عبادت گزار تو بنا سکتی ہے مگر رحم دل نہیں۔ ایسے میں خاندانی زندگی محبت اور نرمی سے خالی ہو جاتی ہے۔

امام جعفر الصادق رحمہ اللہ اس حوالے سے (۱۴۸ھ) بیان کرتے ہیں:

"لا خير في عبادةٍ لا تورثُ رحمةً، ولا في علمٍ لا يزيدُ صاحبه تواضعًا"[2]. .

اس عبادت میں کوئی خیر نہیں جو رحمت پیدا نہ کرے، اور اس علم میں کوئی برکت نہیں جو حامل کو عاجزی نہ سکھائے۔

دین میں غلو انسان کے باطن کو اس طرح متاثر کرتا ہے کہ اس کے دل سے نرمی، رحم، اور توازن کی کیفیت ختم ہونے لگتی ہے۔ جب بندہ دین کی اصل روح کو سمجھنے کے بجائے شدت پسندی اور سخت تعبیرات کا شکار ہو جاتا ہے، تو اس کی عبادت محض ایک ظاہری عمل بن جاتی ہے، جبکہ اس کے اخلاق سے حلم، شفقت اور درگزر کے جذبات رخصت ہو جاتے ہیں۔ قرآن مجید نے اہلِ ایمان کو غلو سے اسی لیے روکا ہے کہ دین کی حقیقت سختی میں نہیں بلکہ محبت، اعتدال اور نرمی میں پوشیدہ ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب امتوں نے دین میں غلو اختیار کیا، تو وہ باہمی نفرت، تفرقہ اور ہلاکت کا شکار ہو گئیں۔ دل کی سختی انسان کو نصیحت سے محروم کر دیتی ہے، وہ دوسروں کی خطا پر درگزر نہیں کرتا اور عدل کے بجائے تکفیر و انکار کے راستے پر چل پڑتا ہے۔ درحقیقت، دین کی بقا اور اس کی روح کا حسن نرمی، محبت، اور توازن میں ہے۔ یہی اوصاف فرد اور معاشرے دونوں کو امن، الفت، اور روحانی بالیدگی عطا کرتے ہیں۔

---

[1] امام احمد، ابی عبد اللہ احمد بن حنبل، الزھد، دار الغد الجدید، الطبعۃ الأولی ۲۰۰۵، ص ۲۶۷

[2] الحسن بن علی بن شعبہ الحرانی، تحف العقول عن آل الرسول، المطبعۃ الحیدریہ ومکتبتھا، النجف، ۱۹۶۳ص ۳۲۱

امام الغزالی رحمہ اللہ (۵۰۵ھ) بیان کرتے ہیں:

"الغلو في الدين يوجب القسوة، والقسوة تُذهب الرِّقَّةَ والمودَّةَ بين الناس"[1].

دین میں غلو سخت دلی پیدا کرتا ہے، اور سخت دلی لوگوں کے درمیان نرمی اور محبت کو زائل کر دیتی ہے۔

یہ قول اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ جب انسان انتہا پسندی یا غلو کا شکار ہو جاتا ہے تو اس کے دل میں سختی پیدا ہو جاتی ہے، جو سب سے پہلے گھر کی فضا اور خاندانی محبت کو متاثر کرتی ہے۔ نتیجتاً وہ گرمجوشی، الفت اور باہمی احترام جو خاندان کی بنیاد ہوتی ہے، بتدریج ختم ہونے لگتی ہے اور رشتے رسمی و بے روح بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دین کے تمام احکام کو عدل، رحمت اور توازن کے اصول پر قائم کیا تاکہ انسانی معاشرہ خیر، محبت اور سکون کے ساتھ چلتا رہے۔ لیکن جب انسان ان اصولوں سے ہٹ کر شدت، ضد یا تعصب کا راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ اس الٰہی توازن سے محروم ہو جاتا ہے۔ نتیجے میں خاندان کے افراد، جو ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور محبت کے رشتے میں بندھے ہوتے ہیں، نفرت، دوری اور عدم برداشت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح وہ گھر جو سکون اور رحمت کا پیکر ہونا چاہیے، اختلاف اور بے اعتمادی کا مرکز بن جاتا ہے۔ اسلام کا اصل مزاج اعتدال، نرمی اور رحمت ہے، اور انہی اوصاف سے دلوں میں نرمی، رشتوں میں قربت اور زندگی میں سکون پیدا ہوتا ہے۔

امام ابن قیم الجوزیہ رحمہ اللہ (۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

"الدين كله خُلُق، فمن زاد عليك في الخلق زاد عليك في الدين"[2].

پورا دین دراصل اخلاق ہی کا مظہر ہے، کیونکہ نبی اکرم ﷺ نے خود فرمایا کہ "میں اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔" اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دین کا جوہر عبادات یا رسوم میں نہیں، بلکہ انسان کے اخلاقی رویّے میں پوشیدہ ہے۔ جو شخص اپنے اخلاق میں بلند ہے، دراصل وہی دین میں بھی مضبوط بنیاد رکھتا ہے۔ ائمہ کے اقوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ غلو اور انتہا پسندی انسان کے دل سے نرمی، محبت اور حسنِ سلوک کے جذبات کو مٹا دیتی ہے۔ جب دل سخت ہو جاتے ہیں، تو خاندانی زندگی سے مودّت، شفقت اور احترام کا عنصر ختم ہو جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ گھر جو محبت اور سکون کا مرکز ہونا چاہیے، سختی، الزام تراشی اور بے رخی کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان جب اپنے نظریے کو مطلق حق سمجھ کر دوسروں کے لیے نرمی اور درگزر کا رویہ ترک کرتا ہے، تو وہ نہ صرف دین کے اخلاقی جوہر سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اپنے گھر اور خاندان کو بھی اختلاف اور نفرت کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔

---

[1] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۱۱۵

[2] ابن قیم، مدارج السالکین، ج ۲، ص ۳۱۰

برداشت ورواداری کا خاتمہ

انتہا پسندی ایک ایسا رویہ ہے جو انسان کے دل و دماغ کو تنگ کر دیتا ہے۔ یہ فکری جمود اور جذباتی شدت کو جنم دیتی ہے، جس سے انسان میں برداشت اور رواداری کی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے۔ جب کوئی شخص اپنے نظریے، مسلک یا عمل کو ہی مطلق حق سمجھنے لگتا ہے اور دوسروں کی بات سننے یا قبول کرنے سے انکار کرتا ہے، تو معاشرتی ہم آہنگی کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔ یہی عدم برداشت دلوں کی سختی اور تعلقات کی کمزوری کا باعث بنتی ہے۔ اسلام میں رواداری صرف ایک سماجی خوبی نہیں بلکہ اخلاقِ نبویؐ کا بنیادی ستون ہے، جو امت کو اتحاد، محبت اور باہمی احترام کی دعوت دیتا ہے۔ جب یہ جذبہ مٹنے لگتا ہے، تو معاشرہ نفرت، تعصب اور انتشار میں بکھر جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن و سنت نے ہمیشہ نرمی، حلم اور میانہ روی کو اپنانے کی تلقین کی ہے تاکہ اختلاف رحمت بنے، دشمنی نہیں۔ خاندانی زندگی میں بھی یہی اصول لاگو ہوتا ہے؛ جب گھر کے افراد ایک دوسرے کے نظریات پر سخت مؤقف اپناتے ہیں، تو اختلافِ رائے برداشت سے نکل کر جھگڑوں اور دراڑوں میں بدل جاتا ہے، اور محبت واعتماد کی فضا ٹوٹنے لگتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (۷۲۸ھ) لکھتے ہیں:

"ما أُمر العبدُ بشيءٍ إلا وقرنَه الله بالعدل والرحمة، لأنّ الغلوَّ في الأمر يُفسد القلوبَ ويقطع الأرحام"[1]. .

اللہ تعالیٰ نے بندے کو جس چیز کا بھی حکم دیا ہے، اسے عدل اور رحمت کے ساتھ جوڑا ہے، کیونکہ کسی معاملے میں غلو دلوں کو خراب کر دیتا ہے اور رشتوں کو کاٹ دیتا ہے۔

یہ قول اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ انتہا پسندی خاندانی تعلقات پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ جب انسان کے دل میں غلو پیدا ہوتا ہے تو نرمی اور محبت کے جذبات ماند پڑ جاتے ہیں، اور رشتوں میں فاصلہ پیدا ہونے لگتا ہے۔ غلو انسان کی سوچ کو سخت کر دیتا ہے، وہ نرمی اور درگزر کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے، کیونکہ شدت پسندی دل میں موجود رحمت و شفقت کے جذبات کو کمزور کر دیتی ہے۔

ایسی کیفیت میں خاندانی تعلقات میں توازن بگڑ جاتا ہے۔ باہمی گفتگو سخت اور تلخ ہو جاتی ہے، اختلافِ رائے برداشت نہیں ہوتا، اور محبت و عزت کی جگہ الزام تراشی اور بے احترامی آ جاتی ہے۔ نتیجتاً گھر کا ماحول جو سکون اور اطمینان کا مرکز ہونا چاہیے، تناؤ اور کشمکش کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے خاندانوں میں رہنے والے افراد ذہنی دباؤ،

---

[1] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج۳، ص ۵۶

خوف اور بے چینی کا شکار ہو جاتے ہیں، جس سے رشتوں کی مضبوطی متاثر ہوتی ہے اور خاندانی نظام کمزور پڑنے لگتا ہے

نفسیاتی کشیدگی اور اضطراب

انتہاپسندی دراصل ایک غیر متوازن طرزِ فکر ہے جو انسان کی ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی کیفیت پر گہرے منفی اثرات ڈالتی ہے۔ جب کوئی شخص یا گروہ شدت پسندی کو اپنالیتا ہے تو اس کی سوچ میں سختی، عدم برداشت اور تنگ نظری پیدا ہو جاتی ہے، جس سے ذہن و دل کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے افراد ہر چیز کو یا تو مکمل درست یا مکمل غلط سمجھنے لگتے ہیں، جس سے ان کی زندگی میں میانہ روی اور فکری توازن باقی نہیں رہتا۔ نتیجتاً وہ مسلسل بے چینی، تناؤ اور اضطراب کا شکار ہو جاتے ہیں۔

انتہاپسندی انسان کو دوسروں سے الگ کر دیتی ہے، اسے تنہائی، خوف اور عدمِ اعتماد کی کیفیت میں مبتلا کر دیتی ہے۔ جب اختلافِ رائے برداشت کرنے کی صلاحیت ختم ہو جائے تو فرد مسلسل ذہنی دباؤ میں رہنے لگتا ہے، جس کا اثر نہ صرف اس کی نفسیاتی صحت پر بلکہ خاندانی اور معاشرتی تعلقات پر بھی پڑتا ہے۔ اسلام کا حقیقی مزاج سکون، توازن اور اعتدال ہے، جو انسان کے دل میں اطمینان اور معاشرت میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ لیکن جب یہ اعتدال ختم ہو جائے تو انسان کا باطن بے سکون، اور اس کی زندگی اضطراب اور کشمکش کا شکار ہو جاتی ہے۔

ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ کا قول ہے:

" فِي الْقَلْبِ شَعَثٌ لا يَلُمُّهُ إِلَّا الإِقْبَالُ عَلَى اللهِ، وَفِيهِ وَحْشَةٌ لا يُزِيلُهَا إِلَّا الأُنْسُ بِهِ فِي خَلْوَتِهِ، وَفِيهِ حُزْنٌ لا يُذْهِبُهُ إِلَّا السُّرُورُ بِمَعْرِفَتِهِ وَصِدْقِ مُعَامَلَتِهِ، وَفِيهِ قَلَقٌ لا يُسَكِّنُهُ إِلَّا الاِجْتِمَاعُ عَلَيْهِ وَالفِرَارُ مِنْهُ إِلَيْهِ"[1].

دل میں ایک بکھراؤ ہے جسے صرف اللہ کی طرف متوجہ ہونے سے سنوارا جا سکتا ہے، اور اس میں ایک تنہائی ہے جسے صرف اللہ کی خلوت میں اس سے انس پیدا کرنے سے دور کیا جا سکتا ہے، اور اس میں ایک غم ہے جسے صرف اس کی معرفت اور سچی بندگی سے خوشی میں بدلا جا سکتا ہے، اور اس میں ایک اضطراب ہے جسے صرف اللہ کی طرف رجوع اور اسی کی پناہ میں قرار حاصل ہوتا ہے۔

یہ قول دراصل اسلام کے اس جامع تصورِ سکون کو واضح کرتا ہے جو انسان کے دل و روح کو اطمینان بخشتا ہے۔ حقیقی سکون نہ سختی میں ہے، نہ شدت میں، بلکہ اعتدال، ایمان، اور اللہ تعالیٰ کی معرفت میں پوشیدہ ہے۔ جب انسان کا

---

[1] ابن القیم، الفوائد، مکتبہ دار عالم الفوائد، ریاض، سعودی عرب، ص ۶۳

دل ذکرِ الٰہی سے جڑ جاتا ہے تو وہ نفرت، غصے اور انتہا پسندی سے آزاد ہو کر حقیقی آرام پاتا ہے۔ یہی کیفیت روحانی اطمینان کی بنیاد ہے، جو کسی بھی طرح کی شدت یا غلو سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

امام غزالیؒ کے نزدیک ایمان کا اصل تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے جذبات اور رویوں میں توازن پیدا کرے، کیونکہ سکونِ قلب اسی اعتدال سے جنم لیتا ہے۔ جب انسان غصے، نفرت یا شدت پسندی میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کا دل بے چین اور روح مضطرب ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس ایمان، نرمی اور اللہ کی یاد انسان کے اندر وہ استحکام پیدا کرتی ہے جو اسے ہر قسم کی فکری اور جذباتی انتہا سے محفوظ رکھتا ہے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ مومن کا باطنی توازن اور روحانی سکون، انتہا پسندی کے تمام اثرات کے لیے سب سے مؤثر علاج ہے۔ محمد الغزالی رحمہ اللہ کا قول ہے:

"المؤمن يختار أقرب الطرق إلى السكينة والرشد "[1].

مومن وہ راستے اختیار کرتا ہے جو سکون و رشد کے قریب ہوں۔

انتہا پسندی دراصل اسی اضطرابِ قلب کی علامت ہے جو اللہ سے تعلق کمزور ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب انسان اپنی توجہ عبادت، عدل اور رحم سے ہٹا کر شدت اور مخالفت کی طرف موڑ لیتا ہے، تو اس کا دل سکون کھو دیتا ہے۔ ابن القیم رحمہ اللہ کے مطابق یہ روحانی اضطراب، فکری غلو کی جڑ ہے۔

ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ کا قول:

"من وطن قلبه عند ربه سكن واستراح، ومن أرسله في الناس اضطرب واشتد به القلق. "[2]

جس نے اپنا دل اللہ کے نزدیک ٹھہرایا، وہ سکون اور آرام پاتا ہے؛ اور جس نے دل کو لوگوں کے معاملات میں مصروف کر دیا، اس کی کشمکش و اضطراب بڑھ جاتا ہے۔

انتہا پسند افراد عام طور پر "اللہ پر توکل" کے بجائے "اپنی رائے" کو مطلق بنا لیتے ہیں۔ یہی ان کی نفسیاتی بے چینی کی بنیاد ہے۔ یعنی تسلیم و رضا ہی ذہنی دباؤ کو دور کرتی ہے، جبکہ غلو اور خود ساختہ سختی انسان کو فکری جمود اور نفسیاتی کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس بارے میں ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"فألقى نفسه بين يديه، وسلَّم الأمر كله إليه ... فاستراح حينئذٍ من الهموم والغموم والأنكاد والحسرات"[3].

---

[1] إحياء علوم الدين، ج۳، ص ۱۲

[2] ابن القیم، الفوائد، مکتبہ دار عالم الفوائد، ریاض، سعودی عرب، ص ۶۳

جب بندہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیتا ہے، تبھی اسے حقیقی راحت، سکون اور غموں سے نجات ملتی ہے۔

ایک دوسری جگہ ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"إن من عرف الله أحبه ... وانكشفت عن قلبه، الهموم والغموم والأحزان عمر قلبه بالسرور والأفراح"[1].

بے شک جس نے اللہ کو جانا وہ اُس سے محبت کرے گا۔ اور اُس کے دل سے غم، الم اور حزیں یاں دور ہو جائیں گی... اُس کا دل خوشیوں اور فرحتوں سے آباد ہو جائے گا۔

انتہا پسندی کی اصل جڑ معرفتِ الٰہی سے غفلت ہے۔ جب بندہ اپنے خالق کی رحمت اور حکمت کو پہچانتا ہے، تو اس کے دل میں سختی، تکفیر اور نفرت کی جگہ نہیں رہتی۔ محبت الٰہی دل کو وسعت دیتی ہے جبکہ "غلو" دل کو تنگ کر دیتا ہے۔ اس لیے ابن القیم رحمہ اللہ کا یہ قول شدت پسندی کے روحانی علاج کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

الشیخ الدکتور یوسف القرضاوی قول ہے:

"وأولى هذه الثمار: سكينة النفس، وطمأنينة القلب، التي يشعر بها المتوكل على ربه"[2].

اور ان میں سے پہلا پھل ہے نفس کی سکون اور قلب کی طمانینہ، جو اس پر محسوس ہوتی ہے جو اپنے رب پر توکل کرتا ہے۔

نفس کا سکون اور دل کا اطمینان دراصل اللہ پر کامل بھروسے (توکل) کا نتیجہ ہے۔ جو شخص اپنے رب پر اعتماد رکھتا ہے، وہ خوف، شک اور اضطراب سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس، انتہا پسند ذہن ہمیشہ بے چینی، غصے اور غیر یقینی کی حالت میں رہتا ہے، کیونکہ اس کا توکل کمزور پڑ چکا ہوتا ہے۔ دل کا اطمینان صرف اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی امیدیں اور بھروسہ اللہ سے جوڑ لے۔ ائمہ کے اقوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انتہا پسندی محض فکری یا نظری مسئلہ نہیں، بلکہ ایک روحانی بیماری ہے جو انسان کے باطن سے سکون، نرمی اور حسنِ سلوک کو ختم کر دیتی ہے۔ حقیقی راحت اور دل کا اطمینان صرف توکل، معرفتِ الٰہی اور عدل و توازن کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

انتہا پسندی کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ یہ معاشرے کو مختلف گروہوں اور فرقوں میں تقسیم کر دیتی ہے۔ جب شدت پسند نظریات پروان چڑھتے ہیں، تو برداشت، رواداری اور باہمی احترام ختم ہونے لگتا ہے۔ لوگ اپنے

---

[3] ابن القیم، مدارج السالکین، ج۱، ص ۴۵۲

[1] ابن القیم، روضۃ المحبین ونزھۃ المشتاقین ط. مجمع الفقہ، ص۱۴۹

[2] الدکتور یوسف القرضاوی، الإیمان والحیاۃ، دار الشروق، القاہرۃ، ص ۴۵

عقائد یا مفادات کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں اختلاف دشمنی میں اور تنوع نفرت میں بدل جاتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں باہمی اعتماد اور اتحاد کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔ نتیجتاً قومی یکجہتی اور اجتماعی فلاح پسِ پشت چلی جاتی ہے۔ انتہا پسندی انسان کو اجتماعی مفاد سے ہٹا کر خود پسندی اور تعصب کی راہ پر ڈال دیتی ہے، جو معاشرتی استحکام اور ترقی کے لیے زہرِ قاتل ہے۔ یہی تقسیم امن، محبت اور اتحاد کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

معاشرت سے مراد انسانوں کے درمیان باہمی تعلق اور میل جول کا نظام ہے، جس میں مختلف مذاہب، نسلوں اور نظریات کے لوگ ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ اسلام اس معاشرتی تنوع کو حسن کے طور پر دیکھتا ہے اور رواداری، عدل اور محبت سے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن جب معاشرے میں افراد اختلافات کو برداشت کرنے کے بجائے ان پر جھگڑنے لگیں، تو نتیجہ انتشار اور فساد کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر مسائل جنم لیتے ہیں، اور معاشرہ اپنی امن و استحکام کی بنیاد کھو بیٹھتا ہے۔ اسلام کا مقصد یہ ہے کہ لوگ باہمی احترام اور تعاون سے ایک پرامن معاشرت قائم کریں، مگر جب یہ اصول ٹوٹتے ہیں تو معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔

انتہا پسندی دراصل ایک رویہ ہے جو وقتی طور پر فکری شدت سے شروع ہو کر عملی تشدد میں بدل جاتا ہے۔ اگرچہ ہر انتہا پسند دہشت گرد نہیں ہوتا، مگر ہر دہشت گرد کے پیچھے کسی نہ کسی انتہا پسندانہ سوچ کا دخل ضرور ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے مغرب نے ظاہری مذہبی علامات جیسے داڑھی یا حجاب کو بھی انتہا پسندی کی علامت سمجھ لیا ہے، جو سراسر غلط فہمی ہے۔ پاکستانی معاشرہ دین سے محبت رکھتا ہے، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ شدت پسندی یا دہشت گردی کی تائید کرتا ہے۔ درحقیقت، معاشرتی ناانصافی، غربت اور جہالت وہ عوامل ہیں جو لوگوں کو شدت پسندی کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

اسلام اعتدال، توازن اور حکمت کا مذہب ہے۔ جو لوگ دین یا دنیا کے معاملات میں میانہ روی چھوڑ کر افراط یا تفریط کا راستہ اپناتے ہیں، وہ دراصل گمراہی میں پڑ جاتے ہیں۔ انتہا پسندی انسان کو انصاف اور عقل سے دور کر دیتی ہے، جس سے یا تو وہ غیر ضروری سختی میں پڑ جاتا ہے یا بالکل بے راہ روی اختیار کر لیتا ہے۔ شریعت کا مقصد انسان اور معاشرے دونوں کی اصلاح ہے، جبکہ غلو اس توازن کو برباد کر دیتا ہے۔ خواہ یہ شدت عبادت میں ہو یا دشمنی میں، دونوں صورتوں میں نتیجہ نقصان ہی ہوتا ہے۔ نجات صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو حدودِ الٰہی کے اندر رہ کر عدل، نرمی اور حکمت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں، کیونکہ یہی اعتدال اسلام کا حقیقی جوہر ہے۔

حضرت علیؓ کا قول ہے: "النّار غايَةُ المفْرِطينَ"[1]۔ آگ (جہنم) انتہاپسندی کرنے والوں کا انجام ہے۔

یہ کلمہ حضرت علیؓ کی حکمت و بصیرت کا عکاس ہے۔ اس میں انتہا پسندی، غلو اور افراط سے بچنے کی تنبیہ کی گئی ہے۔ جو لوگ دین، عقیدہ یا عمل میں اعتدال چھوڑ کر افراط کا راستہ اختیار کرتے ہیں، ان کا انجام جہنم ہے۔ اسلام میں توازن، اعتدال اور میانہ روی کو اصل قرار دیا گیا ہے، جبکہ افراط و تفریط گمراہی اور ہلاکت کا سبب بنتے ہیں۔

غلو نہ صرف عقیدہ کو بگاڑتا ہے بلکہ معاشرتی تعزیرات، انتشار، فرقہ بندی اور تشدد کا سبب بنتا ہے۔ غلو نے پچھلی امتوں کو تباہ کیا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

"هَلَكَ فِيَّ رَجُلانِ: مُحِبٌّ غالٍ، ومُبغِضٌ قالٍ"[2]۔

میرے بارے میں دو قسم کے لوگ ہلاک ہوئے: ایک وہ جو مجھ سے محبت میں حد سے بڑھ گیا (غلو کیا)، اور دوسرا وہ جو مجھ سے دشمنی میں حد سے آگے بڑھ گیا۔

یہ قول حضرت علیؓ کی گہری بصیرت اور امت کے باطنی حال پر روشنی ڈالتا ہے۔ آپؓ نے واضح فرمایا کہ میری محبت میں غلو کرنے والے اور میری دشمنی میں حد سے تجاوز کرنے والے دونوں راہِ حق سے بھٹک گئے — کیونکہ محبت اگر اعتدال سے نکل جائے تو شرک اور بدعت کی طرف لے جاتی ہے، اور دشمنی اگر حد سے بڑھ جائے تو کفر و نفاق کی طرف۔ اس میں امت کے لیے اعتدال، انصاف اور میانہ روی کا گہرا درس پوشیدہ ہے۔

آنحضرت کا ﷺ ارشاد ہے:

"يا علي، إنَّ فيك مثلاً من عيسى بن مريم؛ أحَبَّهُ قومٌ فأفرطوا في حبه، فهلكوا فيه، وأبغضه قوم فأفرطوا في بغضه "[3]۔

---

[1] ابن عبد الحکم، نہج البلاغۃ، الحکمۃ رقم ۱۱۷، ابن أبي الحدید، شرح نہج البلاغۃ، ج۱۸، ص۲۷۸، القاضی التنوخی، غرر الحکم ودرر الکلم، رقم ۱۰۴۲۲

ابن عبد البر، الاستیعاب في معرفۃ الأصحاب، ج۳، ص۱۰۹۳

[2] ابن عبد الحکم، نہج البلاغۃ، خطبۃ رقم ۱۲۷، ابن أبي الحدید، شرح نہج البلاغہ، ج۴، ص۱۰۶، حلیہ الأولیاء، لأبي نعیم الأصبہانی، ج۱، ص ۸۴

ابن عبد البر، الاستیعاب في معرفۃ الأصحاب، ج۳، ص۱۰۹۳

[3] مسند الإمام أحمد بن حنبل، ج۱، ص۱۶۰، حدیث نمبر ۱۳۷۹، المستدرک علی الصحیحین للحاکم، ج۳، ص۱۳۰، رقم ۴۶۱۶، الحاکم نے اس حدیث کو "صحیح الإسناد" کہا ہے، اور الذہبي نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

اے علی! تم میں حضرت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کی ایک مثال ہے؛ ایک گروہ نے ان سے محبت میں حد سے تجاوز کیا تو اسی (غلو) میں ہلاک ہو گیا، اور ایک گروہ نے تم سے بغض میں حد سے بڑھ کر دشمنی کی تو وہ بھی ہلاک ہو گیا۔

یہ حدیث حضرت علیؓ کے مقام و مرتبہ میں توازن اور اعتدال کی تعلیم دیتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے امت کو یہ تنبیہ فرمائی کہ جیسے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کچھ لوگوں نے محبت میں حد سے بڑھ کر انہیں الوہیت کا درجہ دے دیا اور کچھ نے ان سے نفرت میں انکار اور دشمنی کی انتہا کر دی، ویسا ہی طرزِ عمل حضرت علیؓ کے بارے میں بھی اختیار کیا جائے گا۔ ایک گروہ محبت میں افراط کرتے ہوئے انہیں خدا کے درجے تک بلند کرے گا، جبکہ دوسرا گروہ دشمنی میں ان کے فضائل اور حقائق کا انکار کرے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؓ نہ نبی ہیں، نہ خدا، بلکہ نبی ﷺ کے برحق خلیفہ، جلیل القدر صحابی، شجاع، عادل، اور اہلِ ایمان کے لیے محبت واحترام کے مستحق ہیں۔

اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے امت کو افراط و تفریط دونوں سے دور رہنے کی ہدایت دی ہے۔ آپ ﷺ نے واضح فرمایا کہ حضرت علیؓ کے بارے میں نہ غلو کیا جائے، نہ بغض رکھا جائے، بلکہ اعتدال اور انصاف کے راستے پر چلا جائے۔ محبت کا حقیقی مفہوم اندھی عقیدت نہیں، بلکہ اتباع اور اطاعت ہے۔ اور بغض کا نتیجہ ہمیشہ گمراہی، حق سے دوری، اور ہلاکت کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لہٰذا امت کے لیے اصل راہِ نجات وہی ہے جو میانہ روی، محبت اور حق پسندی پر مبنی ہو۔

یہ حدیث ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ دین میں توازن اور اعتدال ہی اصل روح ہے۔ محبت اگر حد سے بڑھ جائے تو شرک کے قریب کر دیتی ہے، اور نفرت اگر انتہا کو پہنچے تو ظلم اور انکارِ حق کا باعث بن جاتی ہے۔ حضرت علیؓ کا احترام ایمان کا تقاضا ہے، مگر انہیں الوہیت کا درجہ دینا گمراہی ہے۔ اسی طرح ان سے بغض رکھنا یا ان کے فضائل کا انکار کرنا بھی باطل طرزِ عمل ہے۔ نبی ﷺ نے اسی توازن کو برقرار رکھنے کی تعلیم دی تاکہ امت غلو اور نفرت دونوں سے محفوظ رہے۔

آخر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علیؓ کی محبت ایمان کا حصہ ہے، مگر یہ محبت عقل، علم اور شریعت کی حدود میں رہ کر ہونی چاہیے۔ نبی ﷺ کی اس نصیحت میں امت کے لیے ایک دائمی اصول موجود ہے کہ وہ اپنے ائمہ، صحابہ، اور اولیاء کے بارے میں ہمیشہ عدل، اعتدال اور سچائی کے دائرے میں رہے۔ یہی رویہ ایمان، اتحاد، اور نجات کا ضامن ہے۔

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ محبت یا نفرت میں زیادتی کس طرح عقلی توازن کو بگاڑتی ہے، اور خاندان و معاشرہ میں منافرت، گروہ بندی، اور تصادم کو جنم دیتی ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا قول ہے۔

"يجب أن تتجنبوا التغير في أمر دين الله فوحدتكم في خصوص حق تكرهونها خير لكم من تفرقكم في خصوص باطل تحبونه"[1]۔

تمہیں چاہیے کہ اللہ کے دین کے معاملے میں تبدیلی سے بچو، کیونکہ تمہاری وہ وحدت جس میں تمہیں (کچھ) ناپسندیدہ باتیں ہوں، تمہاری اس تفرقہ بازی سے بہتر ہے جس میں تمہیں (باطل کے) کچھ پہلو پسند آئیں۔

تشدد کا فروغ

جب کسی معاشرے میں فکری اختلاف کو علم، دلیل اور مکالمے کے بجائے طاقت اور تشدد سے دبانے کا رواج بن جاتا ہے، تو وہاں فکری جمود اور اجتماعی بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے معاشرے میں لوگوں کی رائے کی قدر ختم ہو جاتی ہے، برداشت اور رواداری کی فضا ماند پڑ جاتی ہے، اور ہر وہ شخص جو مختلف سوچ رکھتا ہو، خوف اور عدمِ تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے۔

تشدد صرف جسمانی نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ فکری آزادی کو بھی چھین لیتا ہے۔ جب انسان اپنی بات کہنے سے ڈرتا ہے تو اس کی سوچ رک جاتی ہے، اور وہ نفرت، جبر اور انتقام کے دائرے میں قید ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں دلوں میں بدگمانی جنم لیتی ہے، تعلقات میں کھنچاؤ بڑھتا ہے، اور ذہنی اضطراب پورے معاشرے میں پھیل جاتا ہے۔

جب امن و سکون ختم ہو جائے تو معاشرے کی بنیادیں کمزور ہو جاتی ہیں۔ لوگ ایک دوسرے کے دشمن بننے لگتے ہیں، خاندانوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں، اور مختلف طبقات کے درمیان نفرت اور دوری بڑھ جاتی ہے۔ نتیجتاً معاشرہ اجتماعی دباؤ اور ذہنی تناؤ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسلام نے ایسے حالات سے بچنے کے لیے نہایت خوبصورت اصول دیا ہے۔ اس نے اختلاف کو رحمت قرار دیا اور سکھایا کہ اختلافِ رائے کو تشدد کے بجائے گفتگو، عدل اور حکمت سے حل کیا جائے۔ جب بات چیت، انصاف اور تحمل کو ترجیح دی جاتی ہے تو دلوں میں سکون، ذہنوں میں اطمینان اور معاشرے میں حقیقی امن قائم رہتا ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا ہے۔ یہ ان کے ایک خطبے یا مکتوب کے حصے کے طور پر منقول ہے، جس میں انہوں نے امت کو اتحاد پر قائم رہنے اور شیطانی وسوسوں سے بچنے کی نصیحت کی۔

---

[1] ابن عبد الحکم، محمد بن عبد اللہ، سیرة عمر بن عبد العزیز، المکتبہ العربیہ، ۱۹۲۷، ص:۵۶؛ ابن الجوزی، ابو الفرج عبد الرحمن بن ابی الحسن، صفۃ الصفوة، المحقق خالد مصطفی طرطوسی، دار الکتاب العربی، بیروت لبنان، ۱۴۳۳ھ، ج ۲، ص ۱۲۸، ابو نعیم الاصبہانی، احمد بن عبد اللہ الاصفہانی، حلیہ الأولیاء، السعادة مصر، ج ۵، ص ۲۹۲

"وَإِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ يَسَّرَ لَكُمْ سُبُولَهُ، وَأَرَادَ بِنَفْسِكُمْ فَتْنَةً تُفَتِّتُكُمْ مِنَ الْوَحْدَةِ، فَاجْتَنِبُوا أَفْكَارَهُ وَسِحْرَهُ"[1]۔

اور بے شک شیطان نے تمہارے لیے اپنے راستے آسان کر دیے ہیں، اور وہ تمہاری ذات کے بارے میں ایک ایسی آزمائش چاہتا ہے جو تمہیں تمہاری وحدت (اتحاد) سے جدا کر دے۔ لہٰذا تم اس کے خیالات اور اس کے فریب (جادو) سے بچو۔

جب لوگ فرقہ وارانہ سوچ اختیار کر لیتے ہیں یا کسی نظریے یا حکومت کے خلاف شدت اور غصے کے ساتھ ردِّعمل ظاہر کرنے لگتے ہیں، تو معاشرتی اتحاد ٹوٹنے لگتا ہے، اعتماد کی فضا ختم ہو جاتی ہے، اور نتیجے میں معاشرہ فساد اور انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ انتہا پسندی انسان کے اخلاقی اور عقلی توازن کو تباہ کر دیتی ہے۔ عقیدہ و عبادت میں شدت پسندی انسان کی سوچ اور احساسات کو بگاڑ دیتی ہے، اور اسے اعتدال و توازن کی راہ سے ہٹا دیتی ہے۔

یہ بات حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی گہری بصیرت کو ظاہر کرتی ہے کہ امت کا تفرقہ دراصل شیطان کی چال ہے، جس کا مقصد امت کے اتحاد اور ایمان کو کمزور کرنا ہے۔ اس لیے اس تفرقے سے بچنا ایمان کے تحفظ اور امت کی وحدت کے قیام کے لیے ضروری ہے۔

اسلام نے اختلاف کے حل کے لیے تشدد، نفرت یا زبردستی کے بجائے علم، بردباری اور مکالمے کا راستہ اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ یہی رویہ امت کو امن، سکون اور فکری پختگی کی طرف لے جاتا ہے۔ جب اختلاف میں غلو اور شدت آجاتی ہے، تو معاشرہ خوف، اضطراب اور انتشار میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس سے امن و اتحاد کی بنیادیں ہلنے لگتی ہیں۔۔ امام الشافعی رحمہ اللہ کا قول ہے:

"ما ناظرتُ أحدًا إلا أحببتُ أن يُوفَّقَ ويُسَدَّدَ ويكونَ عليه رعايةٌ من الله وحِفظ"[2]

میں نے جب بھی کسی سے علمی مناظرہ کیا تو میری خواہش یہ ہوتی تھی کہ اللہ اسے ہدایت اور درست رائے عطا کرے اور وہ اللہ کی حفاظت میں رہے۔

---

[1] ابن عبد الحکم، سیرۃ عمر بن عبد العزیز، ص:۵۹، ابن الجوزی، صفۃ الصفوۃ، ج۲، ص۱۲۹

[2] ابن عساکر، ثقۃ الدین، ابو القاسم علی بن الحسن بن ھبۃ اللہ، دار الکتاب العربي–بیروت، ۱۴۰۴ تبیین کذب المفتری، ص۶۸

امام شافعی رحمہ اللہ کا یہ قول فکری اختلاف میں اخلاص، شفقت اور عدمِ تشدد کی تعلیم دیتا ہے۔ ان کے نزدیک مقصد کسی کو نیچا دکھانا نہیں بلکہ حق تک پہنچنا ہے۔ تشدد اس روح کو ختم کر دیتا ہے اور اختلاف کو عداوت میں بدل دیتا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول ہے:

"الناسُ محتاجون إلى مداراةٍ ورفقٍ، والأمرُ بالمعروفِ والنهيُ عن المنكرِ لا يكونُ بالعنفِ والشدة"[1]

لوگوں کو نرمی اور حسنِ سلوک کی ضرورت ہے، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سختی اور تشدد سے نہیں کیا جاتا۔

یہ قول واضح کرتا ہے کہ دین کی اصلاحی دعوت میں بھی اگر سختی شامل ہو جائے تو دلوں میں نفرت پیدا ہوتی ہے۔

تشدد فکری اصلاح کے بجائے انتشار اور اضطراب کا باعث بنتا ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ کا قول ہے:

"ليس الإيمان بالتمنّي ولا بالتحلّي، ولكن ما وقر في القلب وصدّقه العمل، والمؤمن وقور، لا يَفحشُ ولا يجهلُ"[2]۔

ایمان آرزوؤں اور دعووں سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ دل میں رچنے اور عمل سے ثابت ہونے کا نام ہے، اور مومن وقار والا ہوتا ہے، نہ فحش کلام کرتا ہے نہ جہالت (تشدد) میں پڑتا ہے۔

تشدد اور جہالت ایمان کے خلاف صفات ہیں۔ فکری اختلاف اگر تشدد میں بدل جائے تو ایمان کے وقار کو مجروح کرتا ہے۔ امام مالک رحمہ اللہ کا قول ہے:

"كلٌّ يُؤخذُ من قولِه ويُردُّ، إلا صاحبَ هذا القبر (ﷺ)"[3]

ہر شخص کی بات لی جا سکتی ہے اور رد بھی کی جا سکتی ہے، سوائے اس ہستی کے جو اس قبر (نبی ﷺ) میں آرام فرما ہیں۔

---

[1] ابن مفلح الحنبلی، ت شعیب الأرناؤوط، مؤسسۃ الرسالہ ۱۴۱۹–۱۹۹۹، الآداب الشرعیہ، ج ۱، ص ۲۳۴

[2] ابن الجوزي، صفۃ الصفوۃ، ج ۳، ص ۲۲۷

[3] ابن عبد البر، ابو عمر یوسف بن عبد البر، جامع بیان العلم وفضلہ، المحقق: ابو الأشبال الزہیری، دار ابن الجوزي، ج ۲، ص ۹۱

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے فکری آزادی اور اختلافِ رائے کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے۔ جب یہ وسعتِ فکر ختم ہو جائے اور انسان اپنی رائے کو مطلق حق سمجھے، تو یہی شدت اور انتہا پسندی کا آغاز ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"إنَّ الدِّينَ كلَّه مبناه على العدل، فإذا خرج عن العدل إلى الظلم فليس من الدين"[1]

دین کی بنیاد عدل پر ہے، جب کوئی معاملہ عدل سے ہٹ کر ظلم بن جائے تو وہ دین کا حصہ نہیں رہتا۔

تشدد، ظلم اور جبر دراصل عدل کے منافی ہیں۔

جب فکری اختلاف میں انصاف اور حلم ختم ہو جائے تو مذہبی بنیاد پر نفرت اور معاشرتی اضطراب جنم لیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک صحیح حدیث ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((الرفقُ ما كانَ في شيءٍ إلَّا زانَهُ، وما نُزِعَ من شيءٍ إلَّا شانَهُ))[2]

نرمی جس چیز میں ہوتی ہے، اسے زینت بخشتی ہے، اور جس چیز سے نکال دی جاتی ہے، اسے عیب دار بنا دیتی ہے۔

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح انداز میں بتایا کہ نرمی اور برداشت انسان کے رویے کی اصل خوبصورتی ہیں، جبکہ شدت، غصہ، یا تشدد کسی بھی فکر یا عمل کو بدصورت بنا دیتے ہیں۔ یہ حدیث دراصل انتہا پسندی کے خلاف ایک جامع اصول فراہم کرتی ہے۔ علمانے اسی بنیاد پر فرمایا کہ اسلام کا حقیقی مزاج افراط و تفریط کے بجائے رفق، نرمی، اور اعتدال پر قائم ہے۔ جہاں نرمی شامل ہوتی ہے وہاں خوبصورتی اور برکت آ جاتی ہے، اور جہاں سے نرمی نکل جائے، وہاں دلوں میں سختی اور تلخی پیدا ہو جاتی ہے۔ اختلافات کو نرمی، علم، اور صبر کے ساتھ حل کرنا ہی معاشرتی امن و سکون کی ضمانت ہے، جب کہ سختی اور تشدد ان اختلافات کو نفرت اور انتہا پسندی میں بدل دیتے ہیں۔ یہی کیفیت دراصل انتہا پسندی کی اخلاقی اور نفسیاتی جڑ ہے۔

انتہا پسندی کا اثر خاندانی اور معاشرتی زندگی پر نہایت گہرا اور تباہ کن ہوتا ہے۔ جب برداشت، رواداری اور اعتدال کو چھوڑ دیا جاتا ہے، تو اس کے منفی اثرات سب سے پہلے گھر کے ماحول میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایسے رویے والدین اور اولاد کے درمیان احترام اور اعتماد کو ختم کر دیتے ہیں۔ گھر میں سختی، تلخی، اور نفرت کا ماحول پیدا ہو جاتا

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۱۴۶

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الرفق، حدیث: ۲۵۹۴

ہے، جس سے خاندانی نظام کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس ماحول میں نئی نسل مثبت تربیت حاصل نہیں کر پاتی، اور نتیجے میں پورا معاشرتی توازن بگڑ جاتا ہے۔

سماجی سطح پر بھی انتہا پسندی کا اثر نہایت نقصان دہ ہے۔ یہ اختلافِ رائے کو دشمنی میں بدل دیتی ہے، اور معاشرے میں نفرت، خوف، اور بے اعتمادی کو جنم دیتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہونے کے بجائے دشمن بن جاتے ہیں، تعاون کی جگہ تصادم لے لیتا ہے، اور اجتماعی ادارے کمزور ہو جاتے ہیں۔ انصاف، برابری، اور امن کے اصول پامال ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ معاشرتی اور خاندانی زندگی میں برداشت، گفت وشنید، اور اعتدال کو فروغ دیا جائے، تاکہ ایک پرامن، متوازن، اور باہمی احترام پر مبنی معاشرہ وجود میں آسکے۔

الغرض انتہا پسندی کا اثر خاندانی اور سماجی زندگی پر نہایت گہرا اور تباہ کن ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں برداشت، رواداری اور اعتدال کا دامن چھوڑ دیا جاتا ہے تو سب سے پہلے اس کے اثرات گھر کے ماحول پر ظاہر ہوتے ہیں۔ انتہاپسند رویے والدین اور اولاد کے درمیان احترام اور اعتماد کو ختم کر دیتے ہیں۔ گھر کی فضا میں سختی، نفرت اور عدمِ برداشت پیدا ہو جاتی ہے جس سے خاندانی نظام کمزور ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں نسلِ نو مثبت تربیت حاصل نہیں کر پاتی اور معاشرتی توازن بگڑ جاتا ہے۔ سماجی سطح پر انتہا پسندی اختلافِ رائے کو دشمنی میں بدل دیتی ہے اور معاشرے میں تقسیم، خوف اور بے اعتمادی کو جنم دیتی ہے۔ افراد ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں اور تعاون کی بجائے تصادم عام ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں سماجی ادارے کمزور پڑ جاتے ہیں، انصاف اور مساوات کے اصول مجروح ہوتے ہیں، اور امن وسکون کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرتی وخاندانی زندگی میں برداشت، مکالمہ اور اعتدال کے اصولوں کو فروغ دیا جائے تاکہ ایک متوازن، پرامن اور باہمی احترام پر مبنی معاشرہ تشکیل پا سکے۔

فصل چہارم
انتہا پسندی کے سیاسی، معاشی و تعلیمی آثار

فصل چہارم

انتہا پسندی کے سیاسی، معاشی و تعلیمی اثرت

انتہا پسندی کے سیاسی اثرات

انتہا پسندی کے سیاسی اثرات کسی بھی ملک کے استحکام، امن اور نظامِ حکومت کے لیے انتہائی خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ جب شدت پسندانہ سوچ سیاست میں داخل ہو جاتی ہے تو اختلافِ رائے دشمنی میں بدل جاتا ہے، قومی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے، اور معاشرے میں ظلم، بغاوت اور انتشار جنم لیتا ہے۔ ایسی سیاست میں مکالمہ، برداشت، اور جمہوری اصول کمزور پڑ جاتے ہیں، نتیجتاً ادارے غیر مؤثر ہو جاتے ہیں اور قانون کی بالادستی ختم ہونے لگتی ہے۔ شدت پسندی کے زیرِ اثر سیاسی جماعتیں نظریاتی بصیرت کھو کر انتقام، تعصب اور جذباتی نعروں پر جمع ہونے لگتی ہیں۔ فیصلے عقل وعدل کے بجائے نفرت اور جذبات پر مبنی ہونے لگتے ہیں، جس سے ریاست داخلی انتشار، بغاوت اور خانہ جنگی کی طرف بڑھتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر بھی ایسی ریاست کی ساکھ مجروح ہوتی ہے اور اسے تنہائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں انتہا پسندی نہ صرف فکری و اخلاقی زوال کا باعث بنتی ہے بلکہ پورے سیاسی نظام کو عدمِ استحکام اور بداعتمادی کی بھینٹ چڑھادیتی ہے

سیاسی نظم میں عدل، اور اتحاد کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اس لیے ائمہ و سلفِ صالحین سیاسی نظام کے استحکام کے لیے سیاسی نظم، عدل پر زور دیتے ہیں، حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ عدل و مساوات کی اہمیت بیان کرتے ہیں:

"فَلْيَكُنْ أَمْرُ النَّاسِ عِنْدَكَ فِي الْحَقِّ سَوَاءً فَإِنَّهُ لَيْسَ فِي الْجَوْرِ عِوَضٌ عَنِ الْعَدْلِ"[1]۔

لوگوں کے معاملات میں تم سب کے ساتھ حق میں برابر رویّہ رکھو؛ کیونکہ ظلم کی جگہ عدل کا نعم البدل نہیں ہوتا۔

ایک دوسری جگہ آپ بیان کرتے ہیں کہ ظلم کے ساتھ ریاستیں قائم نہیں رہتی ہیں:

" الْمُلْكُ يَبْقَى مَعَ الْكُفْرِ وَلَا يَبْقَى مَعَ الظُّلْمِ"[2]۔

ریاست کفر کے ساتھ باقی رہ سکتی ہے مگر ظلم کے ساتھ نہیں۔

---

[1] السید الشریف الرضی، نہج البلاغہ، مؤسسۃ الأعلمی للمطبوعات، بیروت، ص ۲۵

[2] التمیمی، عبد الواحد بن محمد، غرر الحکم ودرر الکلم، تحقیق عبد الواحد آمدی، دار الکتب الإسلامیہ، تہران، رقم ۸۶۰۲، ص ۴۱۶

یہ قول اس بات کی واضح دلیل ہے کہ سیاسی نظم و استحکام کا بنیادی ستون عدل ہے؛ جب عدل زائل ہو تو سیاسی انتشار جنم لیتا ہے یہی نقطہ انتہا پسندی کے سیاسی اثرات کی مرکزی دلیل بن سکتا ہے۔ یہ قول سیاسی انتہا پسندی کے بنیادی نقصان کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب حکومت ظلم، انتقام یا شدت پسندی پر قائم ہو تو اس کا زوال یقینی ہوتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے:

"الْعَدْلُ قِوَامُ الْبَرِيَّةِ، وَنِظَامُ السِّيَاسَةِ"[1]- عدل ہی مخلوق کی بقاء اور سیاست کا نظام ہے۔

امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"الْعَدْلُ أَصْلُ الْأُمُورِ، وَبِهِ تَسْتَقِرُّ الدُّوَلُ"[2]-

عدل امور کی بنیاد ہے، اور اسی کے ذریعے ریاستیں مستحکم ہوتی ہیں۔

امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں عدل کو نہ صرف اخلاقی بلکہ سماجی و سیاسی کلچر کا ستون قرار دیا گیا ہے۔ یہی دلیل بتاتی ہے کہ جب سیاسی طاقت عدل کے بجائے نظریاتی یا انتقامی ایجنڈے پر مبنی ہو تو ریاستی استحکام متاثر ہوتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ سیاست میں عدل و اخلاق کی ضرورت زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بالعدلِ تنتظمُ أمورُ الدُّنيا، وبالظُّلمِ تتفكّكُ الدولُ"[3]-

عدل سے دنیا کے معاملات منظم رہتے ہیں، اور ظلم سے ریاستیں ٹوٹ جاتی ہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے واضح کیا کہ سیاسی عدل ہی استحکام کی بنیاد ہے، جبکہ ظلم اور انتہا پسندی ریاستی نظام کو منتشر کر دیتے ہیں۔

ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ فتنہ و بغاوت فساد پیدا کرتے ہیں:

"ستونُ السياسةِ الشرعيةِ هو إقامةُ العدلِ بين الناس، فمن تجاوزَه أفسدَ الدينَ والدنيا"[4]-

سیاسی نظام کی بنیاد لوگوں میں عدل قائم کرنا ہے، جو اس سے تجاوز کرے وہ دین و دنیا دونوں کو بگاڑ دیتا ہے۔

---

[1] التمیمی، عبد الواحد بن محمد، غرر الحکم و درر الکلم، رقم ۳۳۷۵

[2] السید الشریف الرضی، ابو الحسن محمد بن الحسین الموسوی، نہج البلاغہ، ص ۴۵

[3] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۲، ص ۳۲۳

[4] ابن تیمیہ، السیاسۃ الشرعیہ فی اصلاح الراعی والرعیۃ، دار الفکر، دمشق ص ۵

یہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا جامع نظریہ ہے جو واضح کرتا ہے کہ جب سیاست عدل سے خالی ہو اور شدت پسندی پر مبنی ہو تو وہ نظامِ ریاست اور دین دونوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔

ریاستی استحکام کی بنیاد عدل و شوریٰ اسلامی سیاسی فلسفہ "عدل" اور "شوریٰ" پر قائم ہے۔ انتہا پسندی ان دونوں کو ختم کر دیتی ہے۔ قرآن نے فرمایا:وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ "[1]- ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے پاتے ہیں۔

جب شوریٰ (مشاورت) کی جگہ تشدد اور زور زبردستی لے لیتی ہے تو ریاست کمزور، اور مذہب کی اصل روح (عدل و مشاورت) ختم ہو جاتی ہے۔

اسلام نے سیاست اور معیشت دونوں کو عدل، دیانت اور شفافیت کے اصولوں پر استوار کرنے کی ہدایت دی ہے تاکہ انسانی زندگی توازن اور انصاف پر قائم رہے۔ لیکن جب دین کو خالص ہدایت، اخلاق اور روحانی تربیت کے بجائے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ بنالیا جائے تو یہی رویہ انتہا پسندی کو جنم دیتا ہے۔ ایسے حالات میں ریاستی استحکام، عدلِ اجتماعی اور معاشی توازن بری طرح متاثر ہو جاتے ہیں۔ اسلام میں سیاست دراصل عبادت کا تسلسل ہے، جس کا مقصد انصاف، خیر خواہی اور عوام کی خدمت ہے، مگر جب مذہب کو اقتدار اور نظریاتی بالادستی کے حصول کا ہتھیار بنا دیا جائے تو دین کی روح مجروح ہو جاتی ہے۔ انتہا پسند گروہ اپنے سیاسی مفادات کو "دینی فریضہ" کا رنگ دے کر مذہب کے اصل مقصد، یعنی تزکیۂ نفس اور عدلِ اجتماعی، کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ نتیجتاً وہی دین جو امن، توازن اور انصاف کا ضامن ہے، طاقت اور تسلط کی دوڑ میں محض ایک سیاسی نعرہ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے خبردار کیا ہے:

﴿ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴾[2]

حق کو باطل کے ساتھ خلط مت کرو، اور حق کو مت چھپاؤ جب کہ تم جانتے ہو (کہ حق کیا ہے)۔

یہ آیت ان لوگوں پر منطبق ہوتی ہے جو دینی مفہوم کو سیاسی مفاد سے آلودہ کر دیتے ہیں۔ امام علی رضی اللہ تعالی عنہ نے فرمایا:

"إِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَةً، وَمَنْ ضَاقَ عَلَيْهِ الْعَدْلُ فَالْجَوْرُ عَلَيْهِ أَضْيَقُ" [3]

عدل میں کشادگی ہے، اور جس پر عدل تنگ ہو جائے، ظلم اس پر زیادہ تنگی لاتا ہے۔

---

[1] سورۃ الشوریٰ:۳۸

[2] سورۃ البقرہ:۴۲

[3] السید الشریف الرضی، نہج البلاغہ، خطبہ ۱۵

جب مذہب کو طاقت حاصل کرنے یا اقتدار قائم کرنے کے وسیلے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے تو نتیجہ ہمیشہ عدل کے خاتمے اور ظلم کے غلبے کی صورت میں نکلتا ہے۔ ایسی صورت میں ریاست اپنی اخلاقی بنیاد اور ادارہ جاتی استحکام کھو بیٹھتی ہے، کیونکہ طاقت کے حصول کی دوڑ عدل و انصاف کے نظام کو کمزور کر دیتی ہے۔ اسلام نے سیاست اور مذہب کے تعلق کو عدل، مشاورت اور خدمتِ خلق کے اصولوں پر قائم کیا ہے تاکہ اقتدار انسانیت کی بھلائی کا ذریعہ بنے، نہ کہ ذاتی مفادات یا گروہی تسلط کا۔ لیکن جب شدت پسندی سیاست میں داخل ہو جاتی ہے تو شوریٰ کی جگہ جبر، خدمت کی جگہ مفاد، اور عدل کی جگہ طاقت کا استعمال آ جاتا ہے۔ یہی طرزِ عمل ریاست کے استحکام کو کھوکھلا کر دیتا ہے، اداروں پر عوام کا اعتماد ختم کر دیتا ہے، اور معاشرہ انتشار و بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ حقیقی سیاسی و دینی توازن اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب اقتدار کو خدمتِ خلق اور عدلِ اجتماعی کا ذریعہ سمجھا جائے، نہ کہ تسلط یا غلبے کا ہتھیار۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے: "مَنْ عَدَلَ نَفَعَ، وَمَنْ ظَلَمَ ضَرَّ "[1]- جو عدل کرے وہ نفع دیتا ہے، اور جو ظلم کرے وہ نقصان پہنچاتا ہے۔

یہ قول اس حقیقت کو اجاگر کرتا ہے کہ ریاستوں کی بقا اور مضبوطی کا انحصار عدل پر ہے، نہ کہ انتہا پسندی یا طاقت کے بے جا استعمال پر۔ عدل دراصل محض اخلاقی خوبی نہیں بلکہ سیاسی استحکام کی ضمانت بھی ہے۔ امام علیؑ کے قول میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ ظلم کسی بھی حکومت کے لیے زوال کا پیش خیمہ ہے۔ کفر پر مبنی نظام اگر عدل و قانون کے مطابق چلے تو کچھ عرصہ قائم رہ سکتا ہے، مگر ظلم کے زیرِ سایہ کوئی ریاست پائیدار نہیں رہتی۔ ظلم عوام کے اعتماد کو متزلزل کر دیتا ہے، اداروں کو کمزور کرتا ہے اور انصاف کے بجائے انتقام و بدعنوانی کو فروغ دیتا ہے۔ جب طاقتور طبقے قانون سے بالاتر ہو جائیں تو نظامِ عدل مفلوج ہو جاتا ہے۔ ظلم معاشرے میں نفرت، بے چینی اور بغاوت کے بیج بوتا ہے، جو آخرکار انتشار اور ریاستی کمزوری میں بدل جاتے ہیں۔ سیاسی انتہا پسندی دراصل اسی ظلم کی ایک شکل ہے، جو طاقت کے ناجائز استعمال اور اختلافِ رائے کو کچلنے پر مبنی ہوتی ہے۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جن قوموں نے عدل سے روگردانی کی، وہ جلد ہی زوال پذیر ہو گئیں۔ امام علیؑ کا یہ قول دراصل حکمرانوں کے لیے ایک ابدی رہنمائی ہے کہ اقتدار کا دوام صرف عدل سے ممکن ہے۔

عدل ہی وہ ستون ہے جس پر سیاسی استحکام کی بنیاد قائم رہتی ہے۔ جب حکمران انصاف کو اپنا شعار بناتے ہیں تو عوام کا اعتماد ان پر بڑھتا ہے، اور وہ دل سے ریاست کے ساتھ وفادار رہتے ہیں۔ عدل ظلم، ناانصافی اور طاقت کے غلط استعمال کا خاتمہ کرتا ہے، جس سے امن و اطمینان اور اعتماد کی فضا جنم لیتی ہے۔ اگر حکومت ذاتی مفاد یا گروہی

[1] التمیمی، عبد الواحد بن محمد، غرر الحکم، حدیث ۴۸۰۸

تعصب پر چلائی جائے تو عوامی بغاوت، انتشار اور انار کی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ عدل دراصل معاشرے میں وہ توازن پیدا کرتا ہے جو حاکم و محکوم، طاقتور و کمزور، اور اکثریت و اقلیت کے درمیان اعتماد قائم کرتا ہے۔ جب سیاسی نظام عدل پر استوار ہوتا ہے تو ادارے مضبوط ہوتے ہیں، قانون کی بالادستی قائم رہتی ہے، اور قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں بھی عدل کو امن، اصلاح اور امت کے اتحاد کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، کیونکہ عدل ہی سے ایک منصفانہ، پائیدار اور متوازن معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

ائمہ کرام نے ظلم و جبر کے مقابلے میں صبر کی تلقین اس لیے کی ہے کہ بغاوت اور شورش سے امت میں انتشار اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک اگرچہ ظلم ناپسندیدہ ہے، مگر فتنہ و خونریزی اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ، امام نوویؒ، ابن تیمیہؒ اور دیگر ائمہ نے واضح کیا کہ اگر حکومت ظلم کے باوجود اسلام کے بنیادی اصولوں کو قائم رکھے تو اس کے خلاف خروج جائز نہیں۔ ان کے نزدیک اصلاح صبر، خیر خواہی، اور دعا کے ذریعے ممکن ہے، نہ کہ قتال و بغاوت سے۔ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ جب بھی امت نے حکمرانوں کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اس کے نتیجے میں خونریزی، کمزوری اور داخلی انتشار پیدا ہوا۔ ائمہ کا مقصد ظالم کی حمایت نہیں بلکہ امت کو بڑے نقصان سے محفوظ رکھنا تھا۔ امام طحاویؒ نے عقیدہ طحاویہ میں فرمایا کہ "ہم حکمرانوں کے خلاف تلوار نہیں اٹھاتے خواہ وہ ظالم ہوں"، کیونکہ اس طرزِ عمل میں امت کے اتحاد، امنِ عامہ، اور ریاستی استحکام کی حفاظت پوشیدہ ہے۔ یہی اعتدال اور صبر کا راستہ دراصل دین کی حکمت اور امت کی بقا کا ضامن ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ حاکم کے خلاف مسلح بغاوت سے روکتے ہیں:

"لاَ يَجُوزُ الْخُرُوجُ عَلَى الأَئِمَّةِ وَإِنْ جَارُوا"[1]۔

حکمرانوں پر خروج جائز نہیں، اگرچہ وہ ظلم کریں۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول سیاسی اعتدال کی بنیاد رکھتا ہے۔ وہ طاقت یا انتقام کے ذریعے نظام گرانے کے بجائے اصلاح و صبر کی تلقین کرتے ہیں تاکہ امت انتشار سے بچی رہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ حکمران کے ظلم پر صبر کرنے کی تلقین کرتے ہیں:

"الصبرُ على جَوْرِ الأئِمّةِ من السُّنّة، ولا نُقاتِلُ السُّلطانَ"[2]۔

حاکم کے ظلم پر صبر سنت ہے، ہم حکمران سے قتال نہیں کرتے۔

---

[1] علامہ مُلا علی قاری، شرح الفقہ الأکبر، تحقیق: محمد زاہد الکوثری، دار البشائر الإسلامیۃ، بیروت، ۲۰۰۱ء، ص ۳۰۲

[2] ابن ابی عاصم، السنۃ، تحقیق محمد ناصر الدین الألبانی، مکتب المعارف، ریاض، ۱۹۹۴ء، حدیث ۱۰۱۷

یہ قول امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کی سیاسی حکمت کو ظاہر کرتا ہے کہ انتہا پسندی اور مسلح مزاحمت معاشرتی بگاڑ کو بڑھاتی ہے، اصلاح کو نہیں۔

اس طرح امام مالک رحمۃ اللہ علیہ خونریزی اور بغاوت سے منع کرتے ہیں:

"إنّ دماء المسلمين عظيمةٌ عند الله، فلا تريقوها بالباطل"[1]۔

مسلمانوں کا خون اللہ کے نزدیک بہت قیمتی ہے، اسے ناحق نہ بہاؤ۔

ائمہ کرام کے اقوال سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انتہا پسندی کسی بھی ریاست کے سیاسی نظام اور استحکام کے لیے انتہائی خطرناک ہے۔ جب حکمرانی عدل، انصاف، مشاورت اور رواداری کی بجائے ظلم، تعصب اور بغاوت پر مبنی ہو جائے تو سیاسی ادارے کمزور اور غیر مؤثر ہو جاتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر وہ نظام جو انصاف اور عدل سے خالی رہا، اس کا انجام زوال، انتشار اور کمزوری کی صورت میں ہوا۔ ائمہ نے امت کو یہ سبق دیا کہ عدل ہی اقتدار کے دوام اور ریاستی استحکام کی ضمانت ہے، جبکہ ظلم اور شدت پسندی حکومت کو تباہ کر دیتی ہے۔ جب لوگ تکفیر، نفرت اور انتقام کے جذبات میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو امت اپنی وحدت کھو بیٹھتی ہے اور داخلی انتشار جنم لیتا ہے۔ اسی لیے ائمہ نے اصلاحِ نظام کے لیے صبر، نصیحت، علم اور اعتدال پر مبنی جدوجہد کو ترجیح دی۔ سیاسی رواداری اور عدل دراصل وہ ستون ہیں جن کے بغیر ریاست قائم نہیں رہ سکتی، اور جب یہ اوصاف غائب ہو جاتے ہیں تو معاشرتی امن اور انصاف کا توازن بگڑ جاتا ہے اور امت فتنہ و زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔

مذہب کے نام پر سیاسی گروہ بندی اور مفاد پرستی اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جب مذہب کو اقتدار یا سیاسی بالادستی کے حصول کے لیے استعمال کیا جائے تو وہ امت کی وحدت کی بجائے تفرقہ اور اختلاف کا سبب بنتا ہے۔ ہر گروہ اپنے سیاسی مفاد کے مطابق اسلام کی تعبیر پیش کرتا ہے، جس سے ایک ہی دین کے اندر کئی نظریاتی اور سیاسی ریاستیں وجود میں آجاتی ہیں۔ یہی رویہ انتہا پسندی کی فکری جڑ ہے، جو نہ صرف سیاسی استحکام کو نقصان پہنچاتا ہے بلکہ معاشرت میں دشمنی، نفرت اور انتشار کو فروغ دیتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سیاست اور مذہب میں اعتدال، عدل، اور مشاورت کو اپنایا جائے تاکہ امت کی وحدت، ریاستی استحکام اور سماجی امن قائم رہ سکے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خبردار کیا:

"مَن نَصَبَ نَفْسَهُ لِلنَّاسِ إِمَامًا فَعَلَيْهِ أَنْ يَبْدَأَ بِتَعْلِيمِ نَفْسِهِ قَبْلَ تَعْلِيمِ غَيْرِهِ"[2]۔

---

[1] مالک بن انس بن مالک بن عامر الأصبحی المدنی، المدونہ الکبری، بیروت، دار صادر، ج ۴، ص ۲۲۳

[2] السید الشریف الرضی، نہج البلاغہ، حکمت ۷۳

جو شخص خود کو لوگوں پر امام (رہنما) بنائے، اسے چاہیے کہ پہلے اپنی اصلاح کرے، پھر دوسروں کو تعلیم دے۔

یعنی قیادت اخلاقی اصلاح کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتی۔ جب قیادت کا معیار مذہبی نعرہ اور شعار ہو، نہ کہ کردار، فہم اور انصاف، تو نتیجہ انتہا پسندی کے سائے میں ریاست اور معاشرہ دونوں متاثر ہوتے ہیں۔ مذہبی انتہا پسندی کے زیر اثر گروہ ریاستی اداروں کو "غیر اسلامی" قرار دے کر ان کی مخالفت کو اپنا "جہاد" سمجھنے لگتے ہیں۔ اس سے نہ صرف ریاستی نظم و نسق متاثر ہوتا ہے بلکہ عدالتی نظام اور قانون کی بالادستی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ نتیجتاً ریاست "نظریاتی بحران" کا شکار ہو جاتی ہے، جس میں حکمران اور عوام دونوں عدم استحکام اور انتشار کا سامنا کرتے ہیں۔

انتہا پسندی کے معاشی اثرات

انتہا پسندی کے معاشی اثرات کسی قوم کی ترقی اور استحکام کے لیے انتہائی نقصان دہ ہیں۔ جب معاشرت میں خوف، عدم اعتماد اور عدم تحفظ کا ماحول پیدا ہوتا ہے، تو سرمایہ کاری رک جاتی ہے، تجارتی سرگرمیاں سکڑ جاتی ہیں، اور روزگار کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ شدت پسندی امن و امان کو تباہ کر کے معیشت کے بنیادی ڈھانچے کو کمزور کرتی ہے، جس کے نتیجے میں مہنگائی، غربت اور بیروزگاری میں اضافہ ہوتا ہے۔ ریاست کو ترقیاتی منصوبوں کے بجائے اپنی توانائی اور وسائل سیکیورٹی اور جنگی اخراجات پر صرف کرنا پڑتے ہیں، جس سے مالی بحران جنم لیتا ہے۔ ایسے ماحول میں تعلیم، صحت اور سماجی بہبود کے شعبے متاثر ہوتے ہیں، اور معاشرہ ترقی اور خوشحالی سے دور ہو جاتا ہے۔

انتہا پسندی کے معاشی اثرات کے حوالے سے اگرچہ کلاسیکی ائمہ نے جدید اصطلاحات جیسے "انتہا پسندی" یا "معاشی بحران" استعمال نہیں کیں، مگر ان کے اقوال میں عدل، امن، ظلم، فساد اور دولت کے استقرار کے اصول واضح ہیں۔ یہ اصول براہِ راست معاشی استحکام، ترقی اور ریاستی خوشحالی سے متعلق ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ انتہا پسندی کا خاتمہ صرف اخلاقی وسیاسی ضرورت نہیں بلکہ معاشی استحکام، امن اور خوشحالی کے لیے بھی لازم ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نقل کرتے ہیں:

"إِنَّ اللَّهَ يُقِيمُ الدَّوْلَةَ الْعَادِلَةَ وَإِنْ كَانَتْ كَافِرَةً، وَلَا يُقِيمُ الظَّالِمَةَ وَإِنْ كَانَتْ مُسْلِمَةً"[1]۔

اللہ تعالیٰ عادل ریاست کو قائم رکھتا ہے خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، اور ظالم ریاست کو قائم نہیں رکھتا خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو۔

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۱۴۶

یہ قول ظاہر کرتا ہے کہ ظلم اور انتہاپسندی ریاست کے استحکام اور معیشت دونوں کو کمزور کر دیتی ہے، جب کہ عدل ہی خوشحالی اور دوام کی ضمانت ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"إِنَّ فِي الْعَدْلِ سَعَادَةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ، وَفِي الظُّلْمِ شَقَاوَتَهُمَا، وَاللَّهُ يُمْكِنُ لِلدَّوْلَةِ الْعَادِلَةِ وَإِنْ كَانَتْ كَافِرَةً، وَلَا يُمْكِنُ لِلظَّالِمَةِ وَإِنْ كَانَتْ مُسْلِمَةً"[1]۔

عدل میں دنیاو آخرت کی سعادت ہے، جبکہ ظلم میں دونوں کی شقاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ عادل ریاست کو قائم رکھتاہے

اگرچہ وہ کافر ہو، اور ظالم ریاست کو قائم نہیں رکھتا اگرچہ وہ مسلمان ہو۔

یہ اصولی بات معیشت پر براہِ راست اثر ڈالتی ہے، کیونکہ عدل سرمایہ، تجارت، اور امنِ بازار کی بنیاد ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کا قول ہے:

"اعْلَمْ أَنَّ النِّظَامَ فِي أُمُورِ الدُّنْيَا وَالدِّينِ مَعْقُودٌ عَلَى الْمُلْكِ، وَالْمُلْكُ لَا يَسْتَقِيمُ إِلَّا بِالشَّرِيعَةِ، وَالشَّرِيعَةُ لَا تُقَامُ إِلَّا بِالْمُلْكِ "[2]۔

جان لو کہ دنیا و دین کا نظام حکومت سے قائم ہے، اور حکومت شریعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اور شریعت حکومت کے بغیر نافذ نہیں ہو سکتی۔

انتہاپسندی حکومت و شریعت کے اس توازن کو توڑ دیتی ہے، جس سے معیشت، امن اور معاشرتی ترقی متاثر ہوتی ہے۔

امام الماوردي رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"الْعَدْلُ قِوَامُ الْمُلْكِ، وَبِهِ تَصْلُحُ الرَّعِيَّةُ، وَيَسْتَقِيمُ أَمْرُ الدُّنْيَا وَالدِّينِ"[3]۔

عدل ہی حکومت کا قائم رکھنے والا ستون ہے، اسی سے رعایا درست ہوتی ہے، اور دنیا و دین کے امور سنورتے ہیں۔

---

[1] ابن القیم، الطرق الحکمیہ فی السیاسہ الشرعیہ، ص ۱۳

[2] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۱۷

[3] الماوردی، آدب الدنیاوالدین، ص ۱۳۱

یہ قول واضح کرتا ہے کہ ظلم، شدت پسندی یا انتہا پسندی حکومت اور معیشت دونوں کے زوال کا باعث بنتی ہے۔

امام ابن خلدون کا قول ہے:

"الظلمُ مؤذنٌ بخراب العمران"[1]۔ ظلم (اور شدت پسندی) تمدن و معیشت کے زوال کی علامت ہے۔

ابن خلدون کے مطابق ظلم اور ناانصافی کے نتیجے میں تجارت و صنعت ختم ہو جاتی ہے، لوگ ہجرت کر جاتے ہیں، اور ریاست کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے۔ سیاسی انتہا پسندی کا معاشی و سماجی ردِّ عمل مذہبی سیاست کے نتیجے میں معاشرہ خوف، انتشار اور عدمِ یقین کا شکار ہوتا ہے۔ سرمایہ کار بھاگتے ہیں، ترقی رک جاتی ہے، اور وسائل چند گروہوں کے ہاتھ میں مرتکز ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ عوامی غربت اور محرومی میں اضافہ کرتا ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا:

"غَلَاءُ السِّعْرِ يُسِيءُ الْخُلُقَ وَيُذْهِبُ الْأَمَانَةَ "[2]۔

قیمتوں کا بڑھ جانا اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے اور امانت داری کو ختم کر دیتا ہے۔

یعنی جب معیشت میں عدمِ توازن پیدا ہوتا ہے تو سماجی اخلاق بھی بگڑ جاتے ہیں۔ اور یہی مذہبی انتہا پسندی کے معاشی نتائج میں سے ایک ہے۔

انتہا پسندی کے تعلیمی اثرت

انتہا پسندی کے تعلیمی اثرات ایک نہایت اہم اور پیچیدہ مسئلہ ہیں، کیونکہ تعلیم کسی بھی معاشرے کی فکری ترقی اور اخلاقی تعمیر کا بنیادی ستون ہے۔ جب تعلیمی نظام میں شدت پسندی داخل ہو جاتی ہے تو علم کا اصل مقصد، یعنی انسان میں شعور، توازن، حکمت اور رواداری پیدا کرنا، متاثر ہو جاتا ہے۔ ایسے ماحول میں طلبہ کی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتیں کمزور پڑ جاتی ہیں اور ان کی فکری دنیا تعصب، نفرت اور سخت نظریات کے دائرے تک محدود رہ جاتی ہے۔

اس کے نتیجے میں مکالمے اور اختلافِ رائے کو برداشت کرنے کی روایت ختم ہو جاتی ہے، اور طلبہ میں تنقیدی سوچ کی گنجائش کم ہو جاتی ہے۔ تعلیم، جو اصل میں فکر کی آزادی اور علمی ترقی کا ذریعہ ہونی چاہیے، شدت

---

[1] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۲۸۶

[2] الکلینی، ابو جعفر محمد بن یعقوب بن اسحق الرازی، الکافی ، دار المعارف بیروت لبنان، ج ۵، ص ۱۵۱

پسندی کے اثر سے جمود اور تنگ نظری پیدا کرتی ہے۔ ایسے نظام سے پروان چڑھنے والی نسلیں معاشرتی ہم آہنگی کے بجائے تقسیم، تعصب اور تضاد کا باعث بنتی ہیں۔

مزید بر آں، انتہا پسندی علمی اداروں میں اساتذہ اور طلبہ کے تعلقات کو بھی متاثر کرتی ہے۔ علم کے فروغ کے بجائے نظریاتی شدت اور یک رخی سوچ کو اہمیت دی جاتی ہے، جس سے تعلیم کا اصل مقصد یعنی انسان کی فکری اور اخلاقی تربیت پس منظر میں رہ جاتا ہے۔ اس لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ تعلیمی نظام میں رواداری، مکالمہ، اور فکری تنوع کی فضا قائم کی جائے تا کہ معاشرہ علم، عقل اور توازن کی بنیاد پر ترقی کر سکے۔ امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"العلمُ قال اللهُ، قال رسولُه، قال الصحابةُ، ليس بالتمويه ولا بالتقليدِ، ولكن بالاتّباعِ والبصيرةِ"[1]۔

علم یہ ہے کہ آدمی کہے: اللہ نے فرمایا، رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اور صحابہؓ نے فرمایا۔ یہ دکھاوے یا اندھی تقلید کا نام نہیں بلکہ بصیرت اور اتباع کا نام ہے۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے واضح کیا کہ علم کا مقصد بصیرت پیدا کرنا ہے، نہ کہ جمود یا شدت۔ جب علم بصیرت سے خالی ہو جائے تو انتہا پسندی جنم لیتی ہے، جو تعلیم کے توازن کو بگاڑ دیتی ہے۔

دنیا میں جہالت سے بڑا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ یہ وہ اندھیرا ہے جو انسان کے فکر، کردار اور اعمال کو بگاڑ دیتا ہے۔ امام غزالیؒ کا یہ قول اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہر فساد، فتنے اور انتہا پسندی کی جڑ دراصل جہالت میں چھپی ہوئی ہے۔ جب انسان علم، فہم اور بصیرت سے خالی ہو جاتا ہے تو اس کے فیصلے جذبات، تعصب اور نفرت کی بنیاد پر بنتے ہیں، اور یہی کیفیت معاشروں میں تقسیم، دشمنی اور بداعتمادی کو جنم دیتی ہے۔

جہالت انسان کو انصاف سے دور اور ظلم کے قریب لے جاتی ہے۔ علم و تعلیم وہ روشن چراغ ہیں جو دل و دماغ کو منور کر کے انسان میں توازن، بردباری اور بصیرت پیدا کرتے ہیں۔ جس معاشرے میں علم کی قدر ختم ہو جاتی ہے، وہاں انتہا پسندی، جمود اور تعصب لازمی طور پر جنم لیتے ہیں۔

علم انسان کو خود شناسی، حقیقت پسندی اور دوسروں کے حقوق کے احترام کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام غزالیؒ کے نزدیک جہالت سے نجات انسان کی اصلاح، امن اور سماجی فلاح کا بنیادی زینہ ہے۔ علم کی روشنی میں ہی

---

[1] ابن قیم، إعلام الموقعین، ج۱، ص ۴۶

انسان اپنے افکار و اعمال میں اعتدال اختیار کرتا ہے اور معاشرہ بھی ترقی، اتحاد اور امن کی راہ پر گامزن رہتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"ليس في العالم شرٌّ أعظم من الجهل، وهو أصل كلّ فسادٍ في الدين والدنيا"[1]۔

دنیا میں جہالت سے بڑا کوئی شر نہیں، یہی دین و دنیا کے ہر فساد کی جڑ ہے۔

انتہا پسندی دراصل جہالت اور ناقص فہم کا نتیجہ ہے۔ جب تعلیم کا مقصد عقل اور علم کے بجائے جذبات کو بھڑکانا ہو، تو یہ جہالت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

جو شخص صرف کتابوں کے صفحات اور الفاظ سے علم حاصل کرے، مگر اس کے ساتھ فہم، بصیرت اور عملی تربیت نہ ہو، وہ علم کی اصل روح سے محروم رہتا ہے۔ امام شافعیؒ کا یہ قول اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ علم محض عبارتوں یا معلومات کا مجموعہ نہیں بلکہ استاد کی رہنمائی، غور و فکر اور عملی تجربے کے ساتھ سمجھنے اور اپنانے کا نام ہے۔

جب تعلیم صرف مطالعے اور یادداشت تک محدود ہو جائے اور اس میں تدبر، مکالمہ، عملی تربیت اور بصیرت شامل نہ ہو، تو وہ علم کے بجائے غلط فہمیوں، سخت نظریات اور تعصب کو جنم دیتا ہے۔ ایسے طالب علم میں فکری سختی اور انتہا پسندی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ وہ علم کو اعتدال، حکمت اور فہم کے ساتھ استعمال کرنا نہیں جانتا۔

سچی تعلیم وہ ہے جو انسان کو سوچنا، سمجھنا اور عمل کرنا سکھائے۔ اگر تربیت اور بصیرت کو نظر انداز کیا جائے تو علم صرف ایک دعویٰ اور کتابی معلومات تک محدود رہ جاتا ہے۔ امام شافعیؒ کا یہ قول ہمیں یاد دلاتا ہے کہ علم کی اصل بنیاد استاد کی صحبت، تدبر اور حسنِ فہم ہے، نہ کہ محض کتابی معلومات یا لفظی یادداشت۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ علم کے آداب پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"من تفقَّه من بطون الكتب ضيّع الأحكام"[2]۔

جو صرف کتابوں کے صفحات سے (بغیر فہم و تربیت کے) فقہ سیکھے، وہ احکام کو ضائع کر دیتا ہے۔

امام شافعی نے علمی تربیت اور اعتدال کی اہمیت پر زور دیا۔ جب تعلیم میں رہنمائی اور تدبر کی کمی ہو، تو اس کے نتائج میں فکری انتہا پسندی ظاہر ہوتی ہے۔

---

[1] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۳۴

[2] البیہقی، ابو بکر أحمد بن الحسین، المحقق: السید احمد صقر مناقب الشافعی، مکتبۃ دار التراث - القاہرہ الطبعۃ: الأولی، ۱۳۹۰ھ - ج ۲، ص ۱۷۱

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ وضاحت کرتے ہیں:

"كلّ من عبد الله بغير علمٍ كان ما يفسد أكثر مما يصلح"[1]۔

جو شخص علم کے بغیر اللہ کی عبادت کرتا ہے، وہ اصلاح سے زیادہ فساد پیدا کرتا ہے۔

یہ قول اس حقیقت کو بیان کرتا ہے کہ علم سے عاری تعلیم یا مذہبی تربیت انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے، کیونکہ اس میں حکمت اور فہم کا عنصر نہیں ہوتا۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"من ابتدع في الإسلام بدعة يراها حسنة فقد زعم أن محمداً خان الرسالة"[2] ۔

جس نے دین میں کوئی نئی چیز ایجاد کی اور اسے اچھا سمجھا، اس نے گویا یہ گمان کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔

یہ قول تعلیم میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہٹنے کے خطرے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو انتہا پسندی کی جڑ بن سکتی ہے۔ اگر تعلیم صرف رسمی مطالعے یا نظریاتی سختی پر مبنی ہو اور سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اصولوں سے دور ہو جائے، تو یہ طلبہ کے رویوں میں افراط و تفریط پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے تعلیمی ماحول میں شدت پسندی اور سخت رویہ طلبہ کے اخلاق و کردار کو متاثر کرتا ہے اور ان کے دلوں سے علم کی محبت کم ہو جاتی ہے۔

جب تعلیم میں برداشت، نرمی اور رواداری کی بجائے جبر اور سختی شامل ہو، تو طلبہ ذہنی دباؤ، خوف اور ضد کا شکار ہو جاتے ہیں، جس سے ان کی فکری نشوونما رک جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں علمی اور اخلاقی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور طلبہ میں تعصب اور سخت نظریات پروان چڑھنے لگتے ہیں۔

اس کے برعکس، اگر تعلیم نرمی، توازن اور حکمت کے ساتھ دی جائے تو یہ طلبہ کی تربیت میں حسن، اخلاق، عدل اور اعتدال پیدا کرتی ہے۔ نرمی جس چیز میں شامل کی جائے اسے زینت بخشتی ہے اور جس سے نکالی جائے اسے عیب دار کر دیتی ہے۔ یہی اصول تعلیم میں بھی صادق آتا ہے اور اس کے ذریعے ایک متوازن، مہذب اور باشعور نسل پروان چڑھتی ہے۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲، ص ۳۰۱

[2] الشاطبی، الاعتصام، ج ۱، ص ۶۴

تعلیمی اداروں میں یہ فضا قائم ہو جائے تو علم روشنی اور اخلاق کا سرچشمہ بن جاتا ہے، نہ کہ انتہا پسندی اور سخت نظریات کا ذریعہ۔ امام ابن رجب حنبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"ما أُدخِل الرفق في شيءٍ إلا زانه، ولا نُزِع من شيءٍ إلا شانه"[1].

نرمی جس چیز میں شامل کی جاتی ہے اسے زینت دیتی ہے، اور جس سے نکال دی جاتی ہے اسے عیب دار کر دیتی ہے۔

یہ قول علم کی حقیقت اور اس کے مقصد کو نہایت واضح انداز میں بیان کرتا ہے کہ علم محض معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ فہم و بصیرت ہے جو انسان کو صحیح راہ کی پہچان عطا کرتی ہے۔ جب علم سے فہم اور تدبر کا عنصر غائب ہو جائے تو وہ علم انسان کو گمراہی، سختی اور انتہا پسندی کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسی تعلیم جو توازن، رواداری اور حقیقت شناسی سے خالی ہو، اصلاح کے بجائے فساد کو جنم دیتی ہے اور انسانی رویوں میں تعصب، خود پسندی اور جذباتی شدت پیدا کرتی ہے۔

فہم کے بغیر علم انسان کے دل میں سختی اور تعصب کو پروان چڑھاتا ہے، جبکہ فہم اور بصیرت انسان میں عاجزی، عدل اور درست فیصلہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ کرام نے علم کے ساتھ فہم اور تدبر کی تربیت کو لازمی قرار دیا، کیونکہ علم جب بصیرت اور فہم کے ساتھ ملتا ہے تو وہ انتہا پسندی اور جذباتی شدت سے محفوظ رہتا ہے۔

تعلیم اگر فہم و تدبر کے ساتھ جاری رہے تو نہ صرف فرد باشعور بنتا ہے بلکہ معاشرت میں بھی امن، عدل اور اعتدال کے فروغ کے لیے راہیں ہموار ہوتی ہیں۔ علمی ماحول میں سختی، جبر یا نظریاتی شدت اخلاقی بگاڑ پیدا کرتی ہے، جبکہ نرمی، توازن اور تدبر تربیت کی قدر اور حسن کو بڑھاتے ہیں۔ اس طرح علم، فہم اور تربیت کا امتزاج انسان کی شخصیت کو مکمل اور معاشرتی نظام کو متوازن بناتا ہے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"العلم بلا فهمٍ كالجسد بلا روحٍ"[2]۔ فہم کے بغیر علم ایسا ہے جیسے روح کے بغیر جسم

---

[1] ابن رجب حنبلی، زین الدین ابو الفرج عبد الرحمن بن شہاب الدین البغدادی، جامع العلوم والحکم، مکتبہ الإیمان ۱۹۰۰ص ۱۵۶

[2] الخطیب البغدادی ، احمد بن علی بن ثابت، تاریخ بغداد، دار الکتب العلمیۃ، بیروت–لبنان، الطبعۃ الأولی، ۱۴۱۷ھ–۱۹۹۷م، ج ۱۳، ص ۳۳۴

تعلیم کا اصل مقصد محض معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ انسان کے اندر بصیرت، فہم اور توازن پیدا کرنا ہے۔ جب تعلیم صرف معلومات کے ذخیرے تک محدود رہ جائے اور اس میں تدبر، غور و فکر اور عملی شعور شامل نہ ہو تو یہ علم نہ صرف انتہا پسندی کی راہ ہموار کرتا ہے بلکہ دل و دماغ میں سختی، تعصب اور خود پسندی کو جنم دیتا ہے۔

بصیرت وہ قوت ہے جو انسان کو درست اور غلط میں تمیز سکھاتی ہے اور علم کو عملِ صالح کی سمت لے جاتی ہے۔ اگر یہ عنصر تعلیم سے غائب ہو تو طالب علم محض ظاہری علم حاصل کرتا ہے لیکن اس کے اندر نرمی، اعتدال اور فہم پیدا نہیں ہوتا۔ بصیرت انسان کو یہ سکھاتی ہے کہ اختلاف رائے فطری ہے، دشمنی نہیں، اور یہی توازن معاشرت میں امن و ہم آہنگی قائم رکھتا ہے۔

تعلیم میں تدبر، فہم اور نرمی کے امتزاج سے ہی معاشرہ فکری جمود سے نکل کر ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔ ائمہ کرام نے علم کو ہمیشہ بصیرت اور فہم کے ساتھ جوڑا کیونکہ بصیرت کے بغیر علم ایک ایسا ہتھیار بن جاتا ہے جو تخلیق کی بجائے تباہی اور نفرت پیدا کرتا ہے۔ حقیقی تعلیم وہ ہے جو عقل کو منور، دل کو نرم اور شخصیت کو متوازن بنائے، تاکہ انسان نہ صرف علم میں ماہر ہو بلکہ اخلاق، انصاف اور اعتدال کے فروغ کا ذریعہ بھی بنے۔

باب چہارم

انتہا پسندی کے انسداد کے فکری، اخلاقی اور تربیتی جہات

فصل اول   فکری اصلاح کا لائحہ عمل

فصل دوم   اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا اسلامی منہج

فصل سوم   تربیتی و تعلیمی حکمتِ عملی

فصل چہارم   اسلامی معاشرتی نظام اور عملی اقدامات

فصل اول

فکری اصلاح کا لائحہ عمل

فصل اول

فکری اصلاح کا لائحہ عمل

موجودہ دور میں مسلم معاشرے فکری انتشار، مذہبی تشدد اور انتہا پسندی جیسے سنگین مسائل کا سامنا کر رہے ہیں، جنہوں نے دین کے اصل پیغامِ رحمت، اعتدال اور انصاف کو دھندلا دیا ہے۔ اسلام نے ہمیشہ درمیانی راہ، توازن اور اعتدال کو انسان کے فکری و عملی رویوں کا محور قرار دیا ہے، تاکہ فرد اور معاشرہ ہر قسم کے افراط و تفریط سے محفوظ رہ سکے۔ فکری اصلاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنی سوچ کو قرآن و سنت کے معیار پر استوار رکھیں اور جذبات یا ذاتی مفادات کی بجائے علم، حکمت، دلیل اور اخلاق کو بنیاد بنائیں۔ اسلامی فکر میں انتہا پسندی کی جڑیں جہالت، تقلیدِ جامد، سیاسی و ذاتی مفادات اور فکری انحراف میں پنہاں ہیں، جن کا واحد علاج علم و بصیرت اور فکری تربیت کے فروغ میں مضمر ہے۔ اعتدالِ فکر وہ اصولی معیار ہے جو انسان کو افراط و تفریط سے بچاتا اور دین کے مقاصدِ شریعت کو سمجھنے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ فکری اصلاح کے ذریعے ہی انتہا پسندی کے اسباب کا خاتمہ اور اعتدال پر مبنی معاشرے کی تشکیل ممکن ہے۔ قرآن و سنت پر مبنی یہ فکری بنیادیں انسان کے عقیدہ، عمل اور اخلاق میں توازن پیدا کرتی ہیں اور افراط و تفریط سے بچنے کا ضامن بنتی ہیں۔

فکری اصلاح اور اعتدالِ فکر کی اسلامی بنیادیں

فکری اصلاح کا مقصد فرد اور معاشرے کی سوچ کو قرآن و سنت کے اعتدال پر استوار کرنا ہے، تاکہ مذہب کو غلو، سطحی تعبیرات اور جذباتی ردِعمل سے پاک کرکے اس کے اصل مقاصدِ ہدایت کو نمایاں کیا جاسکے۔ اس لائحہ عمل کا محور علم، بصیرت، مکالمہ اور اخلاقی تزکیہ ہے، جو انتہا پسندی کے فکری اسباب کو جڑ سے ختم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ موجودہ دور میں جب فکری انتہا پسندی نے مذہبی بیانیے کو مسخ کر کے تشدد، نفرت اور تعصب کو فروغ دیا ہے، تو اس کا واحد اور مؤثر علاج اصلاحِ فکر اور منہجِ اعتدال کی بحالی میں مضمر ہے۔

اسلام کا فکری نظام مکمل طور پر وحیِ الٰہی پر قائم ہے، جس کی بنیاد قرآن و سنت کی تعلیمات ہیں۔ ان تعلیمات کا مقصد صرف عقائد و عبادات کی رہنمائی نہیں بلکہ انسانی فکر، رویے اور فہمِ دین کو درست سمت دینا بھی ہے۔ فکری انحراف اور انتہا پسندی اسی وقت جنم لیتی ہے جب انسان کا ذہن وحی سے دور ہو کر جذبات، مفادات یا ناقص تعبیرات کا شکار ہو جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن و سنت کی روشنی میں فکری تشکیل کا لائحہ عمل دراصل انسانی شعور کو وحی کے توازن پر استوار کرنا ہے، تاکہ دین کا پیغام عقل، علم، عدل اور رحمت کے دائرے میں سمجھا جاسکے۔

اسلامی فکری اصلاح کا پہلا اور سب سے بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر شخص کی سوچ کو وحیِ الٰہی کی روشنی میں درست سمت میں ڈھالا جائے، تاکہ فرد نہ صرف دینی اور اخلاقی حوالے سے متوازن بنے بلکہ معاشرت میں امن، رواداری اور انصاف کی فضا قائم رکھنے میں بھی کردار ادا کرے۔ یہ اصلاح فرد کی ذہنی و فکری تربیت کے ساتھ ساتھ عملی اور اخلاقی رہنمائی پر بھی زور دیتی ہے، تاکہ علم اور عمل دونوں میں اعتدال قائم رہے اور انتہا پسندی کے خطرات کو جڑ سے ختم کیا جاسکے۔

اسلامی فکری اصلاح کا پہلا اصول وحی الٰہی کی روشنی میں درست فکر کی تشکیل ہے۔ قرآن مجید نے متعدد مقامات پر غلو سے منع کیا ہے ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ ﴾[1]۔ یہ آیت اس امر کی واضح دلیل ہے کہ دین میں زیادتی اور انتہا پسندی فکری انحراف کی علامت ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:(
(إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ))[2]

یعنی دین میں غلو سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے امتیں اسی سبب ہلاک ہوئیں۔

فکری اصلاح اسی قرآنی و نبوی تعلیم کی روشنی میں ہونی چاہیے جس میں دین کا فہم توازن، حکمت اور اعتدال کے ساتھ حاصل کیا جائے۔ اسلام میں فکری اصلاح اور اعتدالِ فکر محض ایک نظری یا فردی عمل نہیں بلکہ ایک اجتماعی اور ادارہ جاتی ذمہ داری ہے، جس میں ریاست، علما، مشائخ، تعلیمی ادارے اور ذرائع ابلاغ سب اپنا حصہ ادا کرتے ہیں۔ قرآن و سنت نے ہر طبقے کو اپنے دائرے میں رہ کر نہ صرف فکر کی اصلاح بلکہ اعتدالِ مزاج کے فروغ کی عملی ذمہ داری بھی سونپی ہے، تاکہ معاشرہ ہر سطح پر فکری اور اخلاقی توازن کے ساتھ مضبوط اور مستحکم رہ سکے۔

فہمِ قرآن کے ذریعے فکری بصیرت کی تربیت

فہمِ قرآن کے ذریعے فکری بصیرت کی تربیت اسلام کی علمی و فکری روح کا بنیادی حصہ ہے۔ قرآنِ کریم انسان کو محض الفاظ کی تلاوت کا نہیں بلکہ تدبر، تفکر اور تعقل کا حکم دیتا ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ﴾[3]۔ کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے؟ نیز ارشاد باری تعالی ہے:﴿إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ﴾[4]، ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ فکری تشکیل صرف نصوص پڑھنے سے نہیں بلکہ ان میں غور و تدبر

---

[1] سورۃ النساء:۱۷۱

[2] النسائی، سنن النسائی، رقم:۳۰۵۹

[3] سورۃ النساء:۸۲، سورۃ محمد:۲۴

[4] سورۃ الرعد:۳

کرنے سے ممکن ہے۔ فکری بصیرت تدبر سے پیدا ہوتی ہے جو انسان کو حق و باطل، اعتدال و انتہا، اور خیر و شر کے درمیان تمیز سکھاتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی تعلیمات میں قرآن کو نور اور ہدایت قرار دیا، جو دلوں کو منور کرتا اور فہمِ دین میں توازن پیدا کرتا ہے۔ فہمِ قرآن کا مقصد محض علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ایسی عملی بصیرت پیدا کرنا ہے جو انسان کے کردار، فیصلوں اور اجتماعی رویوں میں عدل، حکمت اور رواداری کو راسخ کرے۔ جب امت قرآن کے معانی و مقاصد میں تدبر کو شعار بناتی ہے تو فکری جمود، تعصب اور انتہا پسندی خود بخود زائل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا فہمِ قرآن کے ذریعے فکری بصیرت کی تربیت ہی وہ بنیاد ہے جس پر اعتدال پسند اور بامقصد امت کی تعمیر ممکن ہے۔ قرآن مجید فکری اصلاح کی اولین بنیاد ہے۔ قرآن نہ صرف عقائد کی تعلیم دیتا ہے بلکہ تفکر، تدبر اور تعقل کی دعوت دیتا ہے۔ فہمِ قرآن ہی وہ ذریعہ ہے جو امتِ مسلمہ کو فکری بصیرت، اعتدال اور اصلاحِ فکر کی راہ دکھاتا ہے۔ ذیل میں اس امر کی وضاحت ائمہ و مفسرین کے اقوال کی روشنی میں کی جاتی ہے۔

قرآن کا درست فہم انسان کو رشد و گمراہی کے درمیان تمیز عطا کرتا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"مَن فَهِمَ القُرْآنَ عَلَى وَجْهِهِ، تَبَيَّنَ لَهُ سَبِيلُ الرُّشْدِ وَطَرِيقُ الْغَيِّ"[1]

جو شخص قرآن کو اس کے اصل مفہوم کے ساتھ سمجھتا ہے، وہ رشد و ہدایت اور گمراہی کے راستے میں فرق پہچان لیتا ہے۔

یہ قول واضح کرتا ہے کہ فہمِ قرآن فکری شعور اور تمیزِ حق و باطل کی تربیت کا ذریعہ ہے۔ فہمِ قرآن کے ذریعے فکری بصیرت کی تربیت دراصل اسلامی فکری تشکیل کا سب سے بنیادی منہج ہے، کیونکہ قرآن انسان کی عقل، وجدان اور فکر کو بیدار کرتا ہے۔ قرآن محض تلاوت کے لیے نہیں بلکہ تدبر، تفکر اور تفقہ کے لیے نازل ہوا تاکہ انسان اپنی فکری سمت درست کر سکے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا:

"القُرْآنُ جُعِلَ لِلتَّدَبُّرِ وَالِاعْتِبَارِ لِتَتَكَوَّنَ بِهِ الْعُقُولُ وَتَسْتَقِيمَ الْأَفْكَارُ[2]

قرآن تدبر و غور کے لیے نازل کیا گیا تاکہ اس کے ذریعے عقلیں تشکیل پائیں اور افکار سیدھے ہوں۔

یعنی قرآن صرف تلاوت کے لیے نہیں، بلکہ فکری تشکیل اور فہم و بصیرت کے لیے نازل ہوا ہے۔ فہمِ قرآن انسان کو اعتدال، عدل اور رحمت کے اصول سکھاتا ہے، اور اسے فکری غلو و افراط سے محفوظ رکھتا ہے۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی*، ج۱۳، ص ۳۹۰

[2] الشاطبی، الموافقات، ج۴، ص ۱۰۲

قرآنِ مجید علم و ہدایت کا ایک بے کنار سمندر ہے جس کی گہرائیاں لا محدود ہیں۔ جو شخص تدبر اور غور و فکر کے ساتھ اس میں ڈوبتا ہے، وہ ہمیشہ نئی بصیرتیں اور معرفت حاصل کرتا ہے۔ قرآن ہر دور اور ہر انسان کے لیے ہدایت کا سرچشمہ ہے جو فکر و شعور کو جِلا بخشتا ہے۔ اس کی آیات انسان کے دل و دماغ کو منور کرتی ہیں اور اسے ایمان و عمل کی راہوں پر گامزن کرتی ہیں۔ یوں جو قرآن میں غور کرتا ہے وہ اپنے دین، ایمان اور کردار میں مزید پختگی اور بصیرت حاصل کرتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"القرآن بحرٌ لا ساحلَ له، من تدبره ازدادَ بصيرةً في دينه[1] "

قرآن ایک بے کنار سمندر ہے، جو اس میں غور کرتا ہے وہ اپنے دین میں مزید بصیرت حاصل کرتا ہے۔

یہاں "بصیرت" فکری اور روحانی تربیت دونوں کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

امام رازیؒ نے فرمایا کہ قرآن عقل کو روشن اور فکر کو پاکیزہ کرنے والا ذریعہ ہے۔ خالص عقل اور صحیح نقل ایک دوسرے کے مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کی تکمیل ہیں، کیونکہ دونوں کا ماخذ وحیِ الٰہی ہے۔ قرآنِ مجید انسان کو عقل کے درست استعمال، غور و فکر اور تدبر کی دعوت دیتا ہے تاکہ وہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ وحی صرف معلومات فراہم نہیں کرتی بلکہ انسان کے قلب و عقل کو پاکیزگی، توازن اور راہِ راست عطا کرتی ہے۔ اس تربیت کے نتیجے میں انسانی عقل خود غرضی، نفسانی خواہشات اور گمراہی سے محفوظ رہتی ہے اور حق کی پہچان کے ساتھ عملِ صالح کی راہ پر مضبوطی سے قائم رہتی ہے۔ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"العقلُ الصريحُ لا يُخَالِفُ النَّقْلَ الصَّحيحَ، بل القرآنُ يُنَمِّي الْعَقْلَ وَيُزَكِّيهِ"[2]

خالص عقل صحیح نقل کے مخالف نہیں، بلکہ قرآن عقل کو نشوونما دیتا ہے اور اسے پاکیزہ بناتا ہے۔

قرآن فکری اعتدال اور توازن پیدا کرتا ہے، جو بصیرت کی اصل بنیاد ہے۔

جو شخص قرآنِ مجید کو اپنا رہنما اور امام نہیں مانتا، وہ حقیقت میں اپنی نفسانی خواہشات کا قیدی بن جاتا ہے۔ قرآن انسان کو ہدایت، عدل، تقویٰ اور فلاح کی راہوں کی طرف بلاتا ہے، جبکہ نفس اسے غلط راہوں، ظلم و جور اور تباہ کن راستوں کی طرف لے جاتا ہے۔ جب انسان وحیِ الٰہی سے منہ موڑ لیتا ہے تو اس کے فیصلے اور اعمال خواہشات و جذبات کے تابع ہو جاتے ہیں، اور اس کی زندگی میں سکون، مقصد اور توازن ختم ہو جاتے ہیں۔ ایسے حالات میں انسان اپنی فلاح و نجات کے بجائے ہلاکت، گمراہی اور اضطراب کی طرف بڑھتا ہے۔ لہٰذا قرآن کو چھوڑ کر نفس کی

---

[1] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۲۸۵

[2] الرازی، التفسیر الکبیر، ج ۱، ص ۳۶

پیروی کرنا محض ایک ذاتی انتخاب نہیں بلکہ انسان کی دنیا و آخرت دونوں کے لیے نقصان اور خطرہ ہے۔ قرآن کو رہنما بنانے سے ہی زندگی میں بصیرت، عدل اور سکون پیدا ہوتا ہے، اور انسان اپنے اعمال اور فیصلوں میں توازن اور حکمت قائم رکھ پاتا ہے۔

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے فرمایا:"من لم يجعل القرآن إمامَه قاده هواه إلى الردى "[1]

جو قرآن کو اپنا امام نہیں بناتا، وہ اپنے نفس کی پیروی میں ہلاکت کی طرف جاتا ہے۔

یعنی فہمِ قرآن انسان کو ہر قسم کے فکری انحراف اور گمراہی سے محفوظ رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید اس لیے نازل فرمایا کہ انسان اس کے معانی پر غور و فکر کرے اور اسے اپنی زندگی کے لیے رہنما بنائے۔ قرآن محض تلاوت یا الفاظ کے لیے نہیں بلکہ تدبر، تفکر اور عمل کے لیے نازل ہوا ہے۔ جب انسان اس کے پیغام کو سمجھ کر اپنی زندگی میں نافذ کرتا ہے تو دل و دماغ روشن ہوتے ہیں، ہدایت نصیب ہوتی ہے اور سکون قلب حاصل ہوتا ہے۔ قرآن انسان کو حق و باطل میں تمیز کرنا سکھاتا ہے، اس کے اخلاق کو بلند کرتا ہے اور اسے عدل، صبر اور تقویٰ کی طرف راغب کرتا ہے۔ یہی تدبر اور عمل انسان کو دنیا و آخرت میں کامیابی اور قربِ الٰہی تک پہنچانے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

" إنما أنزل الله هذا القرآن ليتدبر الناس معانيه ويعملوا بما فيه من الهدى" [2]

اللہ نے قرآن اسی لیے نازل کیا تاکہ لوگ اس کے معانی میں غور کریں اور اس کے مطابق عمل کریں۔

یہ تدبر فکری و عملی بصیرت کی بنیاد ہے۔

ائمہ کے اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ فہمِ قرآن کا مقصد صرف معلومات جمع کرنا نہیں بلکہ عقل و فکر کو منور کرنا، باطن کو سنوارنا اور عمل کو اعتدال پر استوار کرنا ہے۔ قرآن کے تدبر سے انسان حق و باطل، عدل و ظلم، غلو و اعتدال میں فرق سمجھتا ہے، اور یہی فکری بصیرت کی اصل علامت ہے۔ فہمِ قرآن کی تربیت انسان کی فکری اور اخلاقی اصلاح کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔ قرآن انسان کو سوچنے، غور کرنے اور حقائق کو پرکھنے کا طریقہ سکھاتا ہے، تاکہ اس کی عقل خود غرضی، خواہشات یا گمراہی کی گرفت سے محفوظ رہے۔

جب انسان قرآن کے پیغام کو تدبر اور تفکر کے ساتھ سمجھتا ہے تو اس کی سوچ میں وسعت پیدا ہوتی ہے، اس کے رویے میں توازن آتا ہے اور اس کے فیصلے حکمت و فہم پر مبنی ہوتے ہیں۔ یہی فہمِ قرآن انسان کو جذباتی انتہاؤں،

---

[1] ابن قیم الجوزیہ، محمد بن ابیبکر بن ایوب بن سعد، دار الکتب العلمیہ - بیروت، الفوائد ص ۸۵

[2] الطبری، تفسیر الطبری، ج ۱، ص ۲۳

تعصب اور شدت پسندی سے بچاتا ہے اور اعتدال، انصاف اور رحم دلی کی راہ دکھاتا ہے۔ فکری بصیرت وہ روشنی ہے جو قرآن کے فہم سے دلوں میں اترتی ہے اور انسان کو صحیح اور غلط کے درمیان تمیز سکھاتی ہے، اور اسی روشنی سے معاشرے میں علم، رواداری اور امن کو فروغ ملتا ہے۔

اس طرح فہمِ قرآن نہ صرف فرد کی ذہنی و فکری ترقی کا سبب بنتا ہے بلکہ پوری امت کے فکری توازن اور استحکام کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ اسی تدبر سے امت میں علمی بلوغت، عملی حکمت اور فکری توازن پیدا ہوتا ہے، جو انتہا پسندی کے مقابل فکری اصلاح کا سب سے مؤثر راستہ ہے۔

یوں ائمہ کے اقوال سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قرآن فکری تربیت کا سب سے بڑا وسیلہ ہے، جو انسان کے اندر حق و باطل میں تمیز، علمی حکمت، اعتدال اور اصلاحِ فکر کی بنیاد رکھتا ہے۔ یہی فہم و تدبر انسان کو انتہا پسندی کے نقصانات سے محفوظ رکھتا ہے اور اعتدالِ فکر کو فروغ دیتا ہے۔

سیرتِ نبوی سے فکری توازن کی رہنمائی

نبی اکرم ﷺ کی سیرت دراصل قرآنِ مجید کی عملی تفسیر ہے۔ آپ ﷺ نے الٰہی تعلیمات کو توازن، نرمی اور حکمت کے ساتھ عملی طور پر پیش کیا۔ سیرتِ نبوی فکری اعتدال، عملی توازن اور حکمتِ عملی کی مکمل مثال ہے۔ آپ ﷺ نے اپنے قول و عمل کے ذریعے امت کو یہ سبق دیا کہ دین میں غلو، سختی یا بے اعتدالی کے بجائے اعتدال، نرمی اور بصیرت اختیار کی جائے۔ آپ ﷺ کا اندازِ دعوت یہ عملی نمونہ ہے کہ معاشرتی اصلاح دلوں کی محبت کے ذریعے ممکن ہے، نہ کہ جبر یا نفرت کے ذریعہ۔۔ قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کے بارے میں فرمایا: ﴿ وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ ﴾[1]۔ یعنی آپ تمام جہانوں کے لیے رحمت بن کر آئے۔

یہی رحمت فکری توازن کی بنیاد ہے، جو شدت پسندی کے مقابلے میں حکمت، صبر اور رواداری کو فروغ دیتی ہے۔ نبی ﷺ نے اختلاف کے باوجود عدل و انصاف قائم رکھا، اور دشمنوں کے ساتھ بھی احسان کا معاملہ کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ))[2]، یعنی دین آسانی کا نام ہے۔ نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ((يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا))[3]۔

---

[1] سورۃ الأنبیاء: ۱۰۷

[2] صحیح بخاری، حدیث: ۳۹

[3] صحیح بخاری، حدیث: ۶۹

ائمہ کے اقوال اور سیرتِ نبوی سے واضح ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ فکری توازن کے لیے عملی رہنمائی کا سب سے مضبوط ذریعہ ہیں، جو امت کو اعتدال، حکمت اور اعتصام باللہ کی راہ دکھاتے ہیں۔ فکری توازن کی بنیاد دراصل سنتِ نبوی میں مضمر ہے، جس نے اعتدال، رحمت اور حکمت کو ہر عمل میں عملی صورت دی۔ یہی سنت انسان کو افراط و تفریط اور انتہاپسندی کے نقصانات سے محفوظ رکھتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سنت زندگی کے ہر پہلو میں توازن اور میانہ روی کی کامل مثال ہے۔ آپ ﷺ نے عبادت، معاملات، اخلاق اور معاشرت میں معتدل رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دی تاکہ انسان نہ شدت و سختی کا شکار ہو اور نہ سستی و غفلت کا۔ جو شخص اس اعتدال پر مبنی سنت کی پیروی کرتا ہے، وہ فکری، اخلاقی اور عملی اعتبار سے درست راہ پر رہتا ہے اور انتہا پسندی سے محفوظ رہتا ہے۔ سنتِ نبوی انسان کو اعتقادی اور عملی دونوں پہلوؤں میں روشن سمت عطا کرتی ہے اور اسی پر عمل کرنا حقیقی نجات اور رضائے الٰہی کا راستہ ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ علیہ قول ہے:

"الاقتداءُ برسولِ الله ﷺ في الاعتدالِ هو طريقُ النجاة"[1]

رسول اللہ ﷺ کی اعتدال پر مبنی سنت کی پیروی ہی نجات کا راستہ ہے۔

ان کے نزدیک فکری توازن صرف اعتقادی نہیں بلکہ اخلاقی، عملی اور سماجی سطح پر بھی لازم ہے۔

دین میں اعتدال وہ راہ ہے جس کی طرف نبی اکرم ﷺ نے امت کو رہنمائی کے لیے بلایا، کیونکہ یہ راستہ فطرت انسانی، حکمت اور توازن پر مبنی ہے۔ آپ ﷺ نے نہ سختی کو اختیار کرنے کی تلقین فرمائی اور نہ ہی غفلت اختیار کرنے کو، بلکہ میانہ روی کو دین کی اصل روح قرار دیا۔ اعتدال انسان کو عبادت، معاملات اور اخلاق میں حد سے تجاوز کرنے سے محفوظ رکھتا ہے اور اسے افراط و تفریط کے نقصان سے بچاتا ہے۔ نبی ﷺ کی تعلیمات واضح کرتی ہیں کہ دین رحمت اور سہولت پر مبنی ہے، نہ کہ مشقت اور بوجھ پر۔ اس لیے جو شخص اس معتدل راستے پر قائم رہتا ہے، وہی حقیقی صراطِ مستقیم پر گامزن ہوتا ہے اور دنیا و آخرت میں سکون و توازن حاصل کرتا ہے۔ امام رازی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"الاعتدالُ في الدينِ هو المنهجُ الذي دعا إليه النبي ﷺ"[2]

دین میں اعتدال وہی راستہ ہے جس کی طرف نبی ﷺ نے دعوت دی۔

---

[1] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج۳، ص ۳۷

[2] الرازی، تفسیر الرازی، ج۲، ص ۲۱۴

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"دِينُ النَّبِيِّ ﷺ وَسَطٌ بَيْنَ الْغَالِي فِيهِ وَالْجَافِي عَنْهُ"[1]

نبی ﷺ کا دین ان لوگوں کے درمیان اعتدال پر ہے جو اس میں غلو کرتے ہیں اور جو اس سے بے پرواہ رہتے ہیں۔

یہ قول واضح کرتا ہے کہ فکری توازن صرف نظری نہیں بلکہ عملی زندگی میں سنتِ نبوی کی پیروی سے حاصل ہوتا ہے۔امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے فکری غلو کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

"ما أمر الله بأمرٍ إلا وللشيطان فيه نزعتان: إما إلى تفريطٍ وتقصيرٍ، وإما إلى إفراطٍ وغلوٍ"[2]

اللہ نے جس چیز کا حکم دیا، شیطان اس میں دو راستے کھولتا ہے—ایک غلو و افراط کا اور دوسرا تقصیر و تفریط کا۔

یہ فکری و روحانی بصیرت سیرتِ نبوی سے حاصل ہونے والی متوازن راہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"الشريعةُ كلُّها عدلٌ ورحمةٌ ومصالحُ، فكلُّ مسألةٍ خرجت عن ذلك فليست من الشريعة"[3]

شریعت سراسر عدل، رحمت اور مصلحت پر مبنی ہے، جو چیز ان اصولوں کے خلاف ہو، وہ شریعت کا حصہ نہیں۔

یہ بیان سیرتِ نبوی کی روح کو ظاہر کرتا ہے کہ فکری توازن کا مطلب ہر مسئلے میں عدل اور رحمت کو مرکز بنانا ہے۔

ائمہ کے اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ سیرتِ نبوی فکری توازن کے لیے منہجِ اعتدال، عدل، رحمت اور حکمتِ عملی فراہم کرتی ہے۔ نبی ﷺ نے غلو کو مسترد کر کے درمیانی راہ کو اپنایا، جسے ائمہ نے "اصلِ ہدایت" قرار دیا۔ لہٰذا سیرتِ نبوی کا مطالعہ اور اس پر عمل، فکری اصلاح اور توازن کے قیام کا سب سے مضبوط ذریعہ ہے۔

علم و تحقیق پر مبنی فکری قیادت کی تیاری

علم و تحقیق پر مبنی فکری قیادت کسی بھی قوم کے فکری شعور اور تہذیبی استحکام کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ایسی قیادت محض اقتدار یا خطابت سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے گہری علمی بصیرت، تحقیقی مہارت اور فکری

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۱۱، ص۱۸

[2] ابن قیم، مدارج السالکین، ج۲، ص۴۹۶

[3] الشاطبی، الاعتصام، ج۲، ص۲۹۱

پختگی لازمی ہے۔ فکری قیادت وہ قوت ہے جو معاشرے کے فکری، اخلاقی اور دینی رخ کو درست سمت میں رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ قرآن و سنت نے علم کو قیادت کی بنیاد قرار دیا ہے، کیونکہ علم وہ روشنی ہے جو اندھیروں میں راستہ دکھاتی ہے۔ جب قیادت علم و تحقیق سے مزین ہو، تو وہ تقلید کے بجائے اجتہاد، تعصب کے بجائے رواداری اور انتشار کے بجائے وحدت پیدا کرتی ہے۔ اس طرح کی قیادت قوم کے فکری سرمایہ کو محفوظ رکھتی اور نوجوان نسل میں شعور و بصیرت پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا موجودہ دور میں علم و تحقیق پر مبنی فکری قیادت کی تیاری امت کی فکری اصلاح، تہذیبی تحفظ اور عملی احیائے دین کے لیے ناگزیر ہے۔ قرآن نے بارہا علم کو فکر کی بنیاد قرار دیا ہے: ﴿و قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ ﴾[1]

اسلامی تاریخ میں ائمہ و علماء نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ قیادت محض اقتدار یا نسب پر نہیں، بلکہ علم، فہم، تحقیق اور بصیرت پر مبنی ہونی چاہیے۔ علمی قیادت ہی وہ قوت ہے جو فکری انتشار کو ختم کر سکتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک قیادت کا مقصد لوگوں کو راہِ ہدایت پر لانا اور عدل و حق کے نظام کو قائم کرنا ہے، جو صرف علم و بصیرت رکھنے والا شخص ہی انجام دے سکتا ہے۔ اقتدار یا شہرت پر مبنی قیادت انسان کو خود پسندی اور ظلم کی طرف مائل کر دیتی ہے، جب کہ علم پر مبنی قیادت عدل، حکمت اور رہنمائی کو فروغ دیتی ہے۔ ایسی قیادت جذبات کے بجائے عقل و وحی کی روشنی میں فیصلے کرتی ہے۔ علم اور بصیرت قیادت کے لیے وہ بنیاد ہیں جن پر فکری استقامت اور عملی عدل قائم ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

إِنَّمَا يَسْتَحِقُّ أَنْ يُتَّبَعَ وَيُقْتَدَى بِهِ مَنْ كَانَ عَالِمًا بِاللهِ وَبِدِينِهِ، دَاعِيًا إِلَيْهِ عَلَى بَصِيرَةٍ[2]

قیادت اور اقتداء کا مستحق صرف وہ شخص ہے جو اللہ اور اس کے دین کا علم رکھتا ہو، اور بصیرت کے ساتھ لوگوں کو اس کی طرف بلاتا ہو۔

اس لیے امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک حقیقی رہنما وہی ہے جو علم کے ذریعے قوم کو بصیرت، توازن اور ہدایت عطا کرے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک قیادت کا معیار علم و بصیرت ہے، نہ کہ اقتدار یا شہرت۔

اسی بات کو امام غزالی رحمہ اللہ ایک دوسرے پیرائے میں بیان کرتے ہیں آپ لکھتے ہیں:

"الإمامةُ في الدِّين لا تَثبُتُ إلا بالعلمِ الذي يُوصِلُ إلى معرفةِ الحقِّ[3] "

---

[1] سورۃ الزمر: ۹

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۱۱، ص ۲۲

[3] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۹۴

دین میں امامت (قیادت) اسی وقت قائم ہوتی ہے جب اس کے پاس وہ علم ہو جو حق کی معرفت تک پہنچا سکے۔
امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ بیان فکری قیادت کے لیے علم و تحقیق کی شرط کو واضح کرتا ہے۔

علم کو قیادت اور اصلاح کی روح کہا گیا ہے کیونکہ علم بغیر کے نہ تو درست رہنمائی ممکن ہو سکتی ہے اور نہ حقیقی تبدیلی۔ علم انسان کو حق و باطل میں تمیز، عدل و ظلم میں فرق، اور فیصلوں میں بصیرت عطا کرتا ہے۔ قیادت جب علم پر قائم ہو تو وہ قوم کو ترقی، اتحاد اور فکری استقامت کی طرف لے جاتی ہے۔ اسی طرح اصلاحِ معاشرہ بھی اسی وقت پائیدار ہوتی ہے جب وہ علم، فہم اور حکمت کی بنیاد پر ہو۔ یوں علم ہی وہ قوت ہے جو قیادت کو بصیرت اور اصلاح کو اثر انگیزی عطا کرتی ہے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"العلمُ إمامُ العملِ، والعملُ تابعٌ له، ولا قيادةَ بلا علمٍ"[1]

علم عمل کا امام ہے، عمل اس کا تابع ہے، اور علم کے بغیر کوئی قیادت ممکن نہیں۔

یہ قول علم کو قیادت اور اصلاح دونوں کی روح قرار دیتا ہے۔

عالم وہ ہوتا ہے جو علم و بصیرت کی روشنی میں حق کا راستہ پہچانتا اور دوسروں کو اس کی طرف بلاتا ہے۔ اس کی رہنمائی اعتدال، عدل اور ہدایت پر مبنی ہوتی ہے۔ بر عکس اس کے، جہالت انسان کو جذبات، تعصب اور غلو کی راہوں پر ڈال دیتی ہے۔ جب قیادت علم سے خالی ہو تو امت میں انتشار اور انحراف پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے علم ہی وہ بنیاد ہے جو قیادت کو ہدایت، توازن اور اصلاح کا سرچشمہ بناتی ہے۔ اسی حوالے سے امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"العالمُ هو القائدُ إلى الهدى، والجهلُ يقودُ إلى الغلوِّ والانحراف "[2]

عالم ہی ہدایت کی طرف رہنمائی کرنے والا قائد ہوتا ہے، جبکہ جہالت غلو اور انحراف کی طرف لے جاتی ہے۔

امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک امت کے لیے سب سے رحمت والا رہنما وہ ہے جو علم و بصیرت کے ذریعے امت کو اعتدال پر قائم رکھے۔ ایسی قیادت علم کے ذریعے گمراہی، فکری انحراف اور افراط و تفریط کا سدِّباب کرتی ہے اور امت کی فکری و عملی اصلاح کا حقیقی ذریعہ بنتی ہے۔ علم پر مبنی قیادت محض نظری رہنمائی نہیں بلکہ عملی میدان میں بھی معاشرتی استحکام پیدا کرتی ہے۔ یہ افراد میں فکر و کردار کی پختگی پیدا کرتی ہے اور انہیں شدت پسندی یا غلو سے

---

[1] الشاطبی، الاعتصام، ج۲، ص۲۱۰

[2] ابن قیم، مفتاح دار السعادۃ، دار الکتب العلمیہ، ج۱، ص۶۵

محفوظ رکھتی ہے۔ اسی قیادت کے ذریعے امت فکری زوال سے نجات پا کر اصلاح، اعتدال اور توازن کی راہ پر گامزن ہوتی ہے۔

ایسی قیادت اسلام کے فکری پیغام کو جدید دنیا کے تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ جب علم قیادت کی بنیاد بن جائے تو نہ صرف فکر میں توازن پیدا ہوتا ہے بلکہ عمل میں اخلاص اور معاشرت میں عدل بھی قائم رہتا ہے۔ یوں علم و تحقیق پر مبنی قیادت امتِ مسلمہ کے فکری و اخلاقی احیاء اور اصلاح کا سب سے مؤثر ذریعہ بن جاتی ہے، جو امت کو فکری اور عملی طور پر مضبوط اور متوازن بناتی ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"أشرفُ الناسِ مَن كان عالِمًا مُهْتَدِيًا يَهْدِي غَيْرَهُ"[1]

سب سے شریف انسان وہ ہے جو خود علم و ہدایت یافتہ ہو اور دوسروں کو بھی راہِ ہدایت دکھائے۔

یہ بیان واضح کرتا ہے کہ فکری قیادت صرف اسی صورت میں مؤثر ہو سکتی ہے جب رہنما خود علم و بصیرت کی روشنی میں ہو۔ اسلامی تصورِ قیادت میں علم اور فہمِ دین بنیادی ستون ہیں، کیونکہ یہی عناصر قیادت کو معاشرتی، فکری اور اخلاقی اصلاح کی صلاحیت عطا کرتے ہیں۔ ایسی قیادت کا مقصد محض اقتدار حاصل کرنا نہیں بلکہ امت کی فکری رہنمائی، اخلاقی تربیت اور اصلاحِ حال ہے۔

علم وہ طاقت ہے جو انسان کو حق و باطل میں تمیز سکھاتی ہے اور فکری انحرافات سے محفوظ رکھتی ہے۔ جب معاشرہ جہالت، تقلیدِ بلا فکر یا جذباتی رجحانات کا شکار ہو جاتا ہے تو افراط و تفریط، غلو اور انتہا پسندی جنم لیتی ہے، لیکن علم و تحقیق سے توازن، اعتدال اور فکری بصیرت کو فروغ ملتا ہے۔ ایک باشعور رہنما اپنی علمی بصیرت کے ذریعے معاشرت میں فتنہ و فساد کے اسباب کو سمجھتا ہے اور ان کے سدِّباب کے لیے عملی اقدامات کرتا ہے۔ یوں علم و تحقیق پر مبنی قیادت فکری بیداری، رواداری اور اعتدالِ فکر کی بنیاد قائم کرتی ہے اور معاشرے کو پائیدار اصلاح کی راہ پر گامزن کرتی ہے۔

امام طبری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"إنَّما يُصلِحُ اللهُ بهذا العِلمِ أُمَّةً إذا قامَ بهِ قادتُها العُلَماءُ"[2]

اللہ کسی امت کی اصلاح اسی وقت کرتا ہے جب اس کے قائدین علم کے حامل ہوں۔

---

[1] الرازی، التفسیر الکبیر، ج ۲، ص ۱۵۵

[2] الطبری، تفسیر الطبری، ج ۱، ص ۲۹

یہ قول واضح طور پر یہ بتاتا ہے کہ علم و تحقیق پر مبنی قیادت ہی امت کی فکری اصلاح کی کلید ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی فلاح و اصلاح اسی وقت فرماتا ہے جب اس کے قائدین علم، بصیرت اور تقویٰ سے آراستہ ہوں۔ ایسے رہنما قوم کو عدل، فہم اور درست سمت کی طرف لے جاتے ہیں، جبکہ قیادت اگر جہالت یا ذاتی مفادات کی قید میں ہو تو انتشار، ناانصافی اور گمراہی کا ماحول پیدا ہوتا ہے۔ علم ہی وہ روشنی ہے جو قائدین کو درست فیصلے کرنے اور عوام کی صحیح رہنمائی کی اہلیت عطا کرتی ہے، اور اسی وجہ سے قرآن میں علم والے رہنماؤں کو امت کی حقیقی فلاح و اصلاح کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔

دینی و عصری نصاب کا امتزاج

اسلام نے علم کو محض دینی یا دنیوی دائرہ میں محدود نہیں کیا بلکہ دونوں کو باہم مربوط کر کے ایک متوازن فکری نظام قائم کیا۔ قرآنِ مجید بارہا عقل، تدبر اور تفکر کی دعوت دیتا ہے، جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسلام فکری وسعت اور علمی توازن کا دین ہے۔ جب نصاب میں دینی تعلیمات کے ساتھ عصری علوم کو شامل کیا جائے تو فرد نہ صرف عبادات اور اخلاق میں مضبوط ہوتا ہے بلکہ سائنسی و معاشرتی شعور بھی حاصل کرتا ہے۔ یہی امتزاج فکری اصلاح اور اعتدالِ فکر کی حقیقی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

یکطرفہ تعلیم، چاہے وہ صرف دینی ہو یا محض مادّی، ذہنی جمود اور انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے، جبکہ متوازن نصاب امت کو فکری وسعت، عملی حکمت اور بصیرت عطا کرتا ہے۔ علم کے اس جامع تصور سے انسان اپنی عقل کو وحی کی روشنی میں استعمال کرتا ہے، جس سے فکری بگاڑ کی راہیں بند ہوتی ہیں۔ یہی دینی و عصری نصاب کا امتزاج انتہا پسندی کے خاتمے اور معاشرتی توازن کی ضمانت بنتا ہے۔

اسی حوالے سے امام غزالی رحمہ اللہ (ت ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں:

"لَا يُسْتَغْنَى فِي الدِّينِ عَنِ الْعَقْلِ، كَمَا لَا يُسْتَغْنَى فِي الدُّنْيَا عَنِ الدِّينِ، فَهُمَا كَالتَّوْأَمَيْنِ، إِذَا فُقِدَ أَحَدُهُمَا اخْتَلَّ الْآخَرُ."[1]

دین میں عقل (یعنی فکری و سائنسی شعور) کی حاجت ناگزیر ہے، جیسے دنیا میں دین کی۔ یہ دونوں جڑواں ہیں، اگر ایک ختم ہو جائے تو دوسرا کمزور پڑ جاتا ہے۔

---

[1] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج۱، ص ۳۵

اسلام کے نزدیک حقیقی علم وہ ہے جو معرفتِ خالق اور فہمِ مخلوق دونوں کو جمع کرے۔ اس توازن کے بغیر نہ معاشرتی اصلاح ممکن ہے، نہ فکری اعتدال۔ لہٰذا دینی و عصری نصاب کا امتزاج ہی وہ بنیاد ہے جس کے ذریعے امت کو فکری انتہا پسندی سے نکال کر اعتدال، رواداری اور توازن کی راہ پر گامزن کیا جا سکتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایک آگے فرماتے ہیں:

"العِلْمُ إِذَا لَمْ يُزَيَّنْ بِالْعَقْلِ كَانَ سَبَبًا لِلفِتْنَةِ، وَإِذَا اقْتَرَنَ بِهِ نَوَّرَ الْقَلْبَ وَقَوَّمَ السُّلُوكَ".[1]

جب علم عقل و بصیرت سے خالی ہو تو وہ فتنہ اور افراط و تفریط کا باعث بنتا ہے، لیکن جب یہ عقل و فہم کے ساتھ مل جائے تو دل کو منور کرتا ہے اور کردار کو درست کرتا ہے۔

امام غزالی کے نزدیک علم اور عقل کا امتزاج ہی فکری توازن کی بنیاد ہے، جو انتہا پسندی کے خاتمے کا مؤثر ذریعہ ہے۔ جب علم عقل و بصیرت سے محروم ہو تو وہ انسان کو حقیقت سے دور کر دیتا ہے اور گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، کیونکہ بغیر فہم و تدبر کے علم نہ عمل پیدا کرتا ہے نہ توازن۔ ایسا علم اکثر فتنہ، انتہا پسندی اور افراط و تفریط کے لیے راہیں ہموار کرتا ہے۔

لیکن جب علم عقل، فہم اور بصیرت کے ساتھ مربوط ہو جائے تو یہ دل و دماغ کو منور کرتا ہے اور کردار میں اعتدال، اخلاقی بلندی اور نیکی پیدا کرتا ہے۔ ایسا علم انسان کو صحیح سوچ، درست فیصلے اور متوازن رویہ سکھاتا ہے، اور اسے جذباتی شدت، تعصب اور سخت رویوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ درحقیقت علم اور عقل کا یہ امتزاج ہی انسان کو صالح، باشعور اور معاشرتی و اخلاقی توازن والا بناتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ (ت ۷۲۸ھ) بیان کرتے ہیں:

"العِلْمُ النَّافِعُ مَا كَانَ فِيهِ تَعْرِيفٌ بِاللَّهِ وَبِمَخْلُوقَاتِهِ، فَهُوَ يَجْمَعُ بَيْنَ الْعَقْلِ وَالشَّرْعِ."[2]

نافع علم وہ ہے جو اللہ کی پہچان اور اس کی مخلوقات کے علم دونوں کو شامل کرے، یہی علم عقل و شریعت کے امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔

فکری اصلاح صرف ایک نظری تبدیلی نہیں بلکہ ایک جاری و ساری عملی عمل ہے جس میں اخلاق، علم اور تعلیم کا مسلسل امتزاج شامل ہے۔ اس عمل کے ذریعے معاشرے میں اعتدال، رواداری اور عدل کے اصول

---

[1] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۳۵

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۱۰، ص ٦٦

مضبوط کیے جا سکتے ہیں۔ ائمہ کرام کے اقوال، قرآن و سنت کی ہدایات، اور سلف صالحین کے منہجِ اعتدال سے واضح ہوتا ہے کہ انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے سب سے مؤثر طریقہ فکری اصلاح ہے۔

جب فرد اور معاشرے کے افکار میں توازن پیدا ہوتا ہے تو رویے خود بخود معتدل اور متوازن ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ راہ ہے جو امتِ مسلمہ کو نہ صرف امن اور اتحاد کی طرف لے جاتی ہے بلکہ فکری استحکام اور معاشرتی ترقی کی بنیاد بھی فراہم کرتی ہے۔ فکری اصلاح دراصل ایک مکمل نظام ہے جو انسان کو علمی بصیرت، اخلاقی پختگی اور عملی اعتدال کے ساتھ مضبوط بناتا ہے۔

الشاطبی رحمہ اللہ (ت ۷۹۰ھ) بیان کرتے ہیں:

"الشَّرِيعَةُ وَضَعَتِ الْعِلْمَ لِتَقْوِيمِ الْعَقْلِ وَتَهْذِيبِ السُّلُوكِ، فَإِذَا انْفَصَلَ أَحَدُهُمَا عَنِ الآخَرِ ظَهَرَ الغُلُوُّ وَالانْحِرَافُ". [1]

شریعت نے علم کو اس لیے وضع کیا ہے کہ عقل کو درست کرے اور کردار کو سنوارے، پس جب ان دونوں میں جدائی آجاتی ہے تو غلو اور انحراف جنم لیتا ہے۔

شریعت نے علم کو اس مقصد کے لیے مقرر کیا ہے کہ وہ انسان کی عقل کو صحیح سمت میں استعمال کرے اور اس کے کردار کو نکھارے۔ جب علم اور عقل میں ہم آہنگی قائم رہتی ہے تو انسان اعتدال، انصاف اور تقویٰ کے راستے پر گامزن ہوتا ہے۔

لیکن اگر علم کردار سے الگ ہو جائے یا عقل سے تعلق ختم کر لے تو انسان غلو، انتہا پسندی اور گمراہی کا شکار ہو جاتا ہے۔ شریعت علم کو صرف نظری معلومات تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اسے عمل، اخلاق اور معاشرتی رویوں سے مربوط کرتی ہے۔ یہی توازن انسان کو نہ صرف اعتدال پسند بناتا ہے بلکہ ایک صالح اور متوازن معاشرے کا فعال رکن بھی تیار کرتا ہے۔

ابن خلدون رحمہ اللہ (ت ۸۰۸ھ) لکھتے ہیں:

"فَالتَّعْلِيمُ فِي جَمِيعِ الْعُلُومِ يَحْتَاجُ إِلَى مَلَكَةٍ مُشْتَرَكَةٍ بَيْنَ الْعَقْلِيِّ وَالشَّرْعِيِّ، وَهِيَ الْإِدْرَاكُ الصَّحِيحُ وَالنَّظَرُ السَّلِيمُ."[2]

---

[1] الموافقات، ج ۲، ص ۴۸

[2] ابن خلدون، المقدمہ، ص ۵۳۲

تمام علوم کی تعلیم کے لیے ایک ایسی جامع صلاحیت درکار ہے جو عقلی (عصری) اور شرعی (دینی) دونوں پہلوؤں کا امتزاج ہو، یعنی درست فہم اور متوازن نظر۔

شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ (ت ۱۱۷۶ھ) لکھتے ہیں:

"إِنَّ الشَّرِيعَةَ تَدْعُو إِلَى اسْتِعْمَالِ الْعَقْلِ فِي مَعْرِفَةِ الْكَوْنِ، كَمَا تَدْعُو إِلَى مَعْرِفَةِ الرَّبِّ فِي الْقَلْبِ."[1]

شریعت انسان کو کائنات کے فہم میں عقل کے استعمال کی دعوت دیتی ہے، جیسے کہ وہ دل میں معرفتِ الٰہی کی دعوت دیتی ہے۔

امام محمد عبدہ رحمہ اللہ (ت ۱۳۲۳ھ)

"لَا يَتِمُّ إِصْلَاحُ الْأُمَّةِ إِلَّا بِعِلْمٍ يَجْمَعُ بَيْنَ الدِّينِ وَالدُّنْيَا، فَيُرَبِّي الْعَقْلَ كَمَا يُزَكِّي النَّفْسَ."[2]

امت کی اصلاح تبھی ممکن ہے جب ایسا علم اختیار کیا جائے جو دین و دنیا دونوں کو جمع کرے، جو عقل کو تربیت دے اور نفس کو پاکیزہ بنائے۔

اسلامی مفکرین نے اس بات پر زور دیا ہے کہ نافع علم وہ ہے جو انسان کو خالق اور مخلوق دونوں کا فہم عطا کرے، کیونکہ اسی توازن سے انتہاپسندی کے اثرات ختم ہوتے ہیں۔ جب تعلیمی ادارے، مدارس اور جامعات اپنے نصاب میں اس ہم آہنگی کو بنیاد بنائیں تو ایک ایسا باشعور طبقہ تیار ہوتا ہے جو اختلافات کے باوجود توازن برقرار رکھتا ہے۔ یہی طبقہ معاشرے میں فکری امن، برداشت اور رواداری کا پیغام پھیلاتا ہے۔ یوں علم پر مبنی فکری اصلاح، دینی و عصری علوم کے امتزاج کے ذریعے، انتہاپسندی کے فکری اور عملی اسباب کو جڑ سے ختم کرنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہوتی ہے۔

ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی فکر میں دینی و عصری علوم کا امتزاج فکری اعتدال، فہمِ قرآن، اور امت کی اصلاح کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اگر علم کے یہ دونوں پہلو متوازن ہوں تو انسان میں وہ بصیرت پیدا ہوتی ہے جو انتہاپسندی، جمود اور تنگ نظری کے خاتمے کا سبب بنتی ہے۔

---

[1] شاہ ولی اللہ دہلوی، حجۃ اللہ البالغۃ، ج۱، ص ۴۵

[2] محمد عبدہ، الأعمال الکاملۃ، دار الشروق للنشر والتوزیع ج۲، ص ۱۱۵

فکری اصلاح اور اعتدالِ فکر کی عملی بنیادیں

عملی طور پر اس کا تقاضا یہ ہے کہ فرد، معاشرہ اور ریاست تینوں سطحوں پر تعلیم، تربیت اور نظامِ عدل کے ذریعے فکری توازن قائم کریں۔ مدارس و جامعات میں تدبرِ قرآن اور اخلاقی تربیت کو فروغ دیا جائے، علما و مشائخ اصلاح و رواداری کے بیانیے کو عام کریں، اور حکومت ایسی پالیسیاں تشکیل دے جو انتہا پسندی کے نظری اسباب کا خاتمہ کریں۔ یوں قرآن و سنت کی روشنی میں فکری اصلاح محض نظری نہیں بلکہ ایک زندہ اور عملی نظام کے طور پر سامنے آتی ہے۔

1-ریاست اور حکومت کا کردار

قرآنی و نبوی تعلیمات کی روشنی میں ریاست اور حکومت کا کردار فکری اصلاح اور اعتدالِ فکر کے فروغ میں بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام نے حکومت کو محض سیاسی نظم و نسق کا نظام نہیں بلکہ دین کے مقاصد، عدل، امن، تعلیم اور تزکیہ کے قیام کا ضامن قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾[1]

یعنی صالح حکومت وہ ہے جو معروف کو رائج کرے اور منکر کو روکے۔ نبی اکرم ﷺ نے بھی حکمرانوں کو رعایا کی فکری و اخلاقی اصلاح کی ذمہ داری سونپی، فرمایا: ((الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[2]

اس روشنی میں حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ قومی نصاب، تعلیمی اداروں اور میڈیا کے ذریعے اعتدال، رواداری اور مکالمے کے اقدار کو فروغ دے، اور مذہب کے نام پر نفرت یا تکفیر کے رجحانات کی روک تھام کے لیے واضح اور مؤثر پالیسیاں وضع کرے۔ مزید یہ کہ ریاست کو ایسے فکری و تحقیقی مراکز قائم کرنے چاہئیں جہاں علماء، ماہرین تعلیم اور مفکرین مل کر معاشرتی انتہاپسندی کے نظری اسباب کا مطالعہ کریں اور ان کے سدِّباب کے لیے علمی و عملی حکمتِ عملیاں تجویز کریں۔ اس طرح ریاست ایک معتدل فکری سمت فراہم کر کے قرآن و سنت کے اس اصول کو عملی جامہ پہنا سکتی ہے کہ عدل و اصلاح حکومت کا اعلیٰ مقصد ہیں۔

علما و مشائخ اصلاح و رواداری

علما و مشائخ اسلامی معاشرے میں فکری اصلاح اور رواداری کے علمبردار رہے ہیں۔ انہوں نے معاشرتی، اخلاقی اور دینی اصلاح کے ذریعے لوگوں کو اعتدال اور توازن کی تعلیم دی۔ ان کی تعلیمات میں سخت گیری اور انتہا

---

(1) سورۃ الحج:۴۱

(2) صحیح بخاری، حدیث:۲۵۵۴

پسندی کی جگہ مفاہمت، صبر اور برداشت کو ترجیح دی جاتی تھی۔ مشائخ نے اپنی تقریروں، درس و تدریس اور فتویٰ جات کے ذریعے لوگوں کو اسلامی اخلاق اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اصلاح کا راستہ دکھایا۔

یہ علماء اپنی عملی زندگی میں بھی اس بات کا مظاہرہ کرتے تھے کہ اختلافِ رائے فتنہ نہیں بلکہ تعلیمی اور فکری ترقی کا ذریعہ ہے۔ انہوں نے نفرت، تکفیر اور بغاوت کے رجحانات کے خلاف صبر و تحمل اور حسنِ سلوک کی تعلیم دی۔ ان کی تربیت میں نوجوانوں کو دین کے صحیح مفہوم، اخلاقی اقدار اور معاشرتی ذمہ داریوں کا شعور دیا جاتا تھا۔

علما و مشائخ کی اصلاحی کوششیں نہ صرف دینی بلکہ سماجی ہم آہنگی کے لیے بھی اہم تھیں۔ انہوں نے فرقہ وارانہ کشیدگی، سیاسی اختلافات اور معاشرتی خلفشار کو کم کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ ان کی تعلیمات کا بنیادی مقصد اعتدال، رواداری اور اخلاقی بصیرت پیدا کرنا تھا تاکہ مسلمان معاشرہ انتہا پسندی اور غلو سے محفوظ رہے۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[1]، جو علما و مشائخ کے طرز عمل کی عکاسی کرتا ہے کہ اصلاح اور رواداری میں حکمت، نصیحت بھلی اور نرم گفتاری اہم ہے۔ ان کی تعلیمات میں سخت گیری اور انتہا پسندی کے بجائے مفاہمت، صبر اور برداشت پر زور دیا جاتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ کی سنت کے مطابق، وہ اپنے اعمال اور تعلیمات میں بہترین نمونہ پیش کرتے تھے: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[2]۔ مشائخ نے اپنی تقریروں، درس و تدریس، اور فتویٰ جات کے ذریعے لوگوں کو اسلامی اخلاق اور شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے اصلاح کا راستہ دکھایا۔ علما و مشائخ اسلامی معاشرے میں فکری اصلاح اور رواداری کے علمبردار رہے ہیں۔ انہوں نے معاشرتی، اخلاقی اور دینی اصلاح کے ذریعے لوگوں کو اعتدال اور توازن کی تعلیم دی۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: ((من دلّ على خير فله مثل أجر فاعله))[3]۔ جو شخص کسی بھلے کام کی طرف رہنمائی کرے، اس کے لیے اس عمل کرنے والے کے برابر اجر ہے۔

یہ حدیث واضح کرتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں اس بات کی ترغیب دی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اچھے عمل کی طرف رہنمائی کرے تو اس رہنمائی کرنے والے کو بھی اتنا ہی اجر ملے گا جتنا عمل کرنے والے کو ملے گا۔ یہ اصول اسلامی معاشرت میں تعاون، ہمدردی اور ایک دوسرے کی مدد کی اہمیت کو اجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح، علما و

---

[1] سورۃ النحل: ۱۲۵

[2] سورۃ الأحزاب: ۲۱

[3] صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۸۹۳

مشائخ نے اپنی زندگی میں لوگوں کو فکری اور اخلاقی اصلاح کی راہ دکھائی اور اس رہنمائی کے ذریعے اجر و ثواب کے مستحق بنے۔ انہوں نے نوجوانوں کو دین کے صحیح مفہوم، اخلاقی اقدار اور معاشرتی ذمہ داریوں کا شعور دیا تاکہ فرقہ وارانہ کشیدگی، سیاسی اختلافات اور سماجی خلفشار کو کم کیا جا سکے۔

یہ شخصیات صرف علم کے خزانہ نہیں بلکہ عملی نمونہ بھی تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے ہر پہلو میں اصلاح، رواداری اور اعتدال کا پیغام عام کیا، اور ان کا اثر آج بھی معاشرتی و دینی تربیت میں محسوس کیا جا رہا ہے۔ ان کے اصول نوجوانوں اور طلبہ کے لیے رہنمائی کا ایک روشن ذریعہ ہیں۔

مدارس و جامعات میں تدبرِ قرآن اور اخلاقی تربیت

مدارس و جامعات میں تدبرِ قرآن اور اخلاقی تربیت کا فروغ اسلامی تعلیمات کے عملی نفاذ کا ایک بنیادی جزو ہے۔ اس کا مقصد طلبہ کو نہ صرف علمی بلکہ اخلاقی اور روحانی طور پر بھی مضبوط بنانا ہے۔ تدبرِ قرآن کے ذریعے طلبہ آیات کے مفہوم، سیاق و سباق اور عملی تعلیمات کو سمجھ سکتے ہیں، جو ان کی روزمرہ زندگی میں کردار سازی کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔

عملی طور پر سب سے پہلے نصاب میں قرآنی مضامین اور اخلاقی اصول شامل کرنا ضروری ہے۔ کلاس روم میں مباحثے، سوال و جواب اور عملی مثالوں کے ذریعے طلبہ کی فہم کو تقویت دی جا سکتی ہے۔ تدبر کے لیے طلبہ کو قرآن کے موضوعات، تاریخ نزول اور فقہی احکام کے ساتھ جوڑ کر سکھایا جائے تاکہ وہ نظریہ اور عملی زندگی میں تعلق قائم کر سکیں۔

اخلاقی تربیت کے لیے روزانہ یا ہفتہ وار اخلاقی نشستیں اور رہنمائی پروگرام منعقد کیے جا سکتے ہیں، جس میں صبر، عدل، رواداری اور تحمل جیسی خصوصیات پر زور دیا جائے۔ استاد اور مشیر طلبہ کی شخصیت سازی میں رہنمائی کریں اور انہیں اسلامی معاشرتی اقدار کی روشنی میں فیصلے کرنے کا طریقہ سکھائیں۔ مزید یہ کہ طلبہ کو سیرت النبی ﷺ اور صحابہ کرام کی زندگیوں سے عملی مثالیں دکھا کر اخلاقی سبق سکھایا جا سکتا ہے۔

گروپ ورک، کمیونٹی سروس، ورکشاپس، سیمینارز اور آن لائن کورسز کے ذریعے بھی تدبر و اخلاقی تربیت کو فروغ دیا جا سکتا ہے تاکہ طلبہ جدید دور کی پیچیدگیوں میں بھی اخلاقی اور دینی رہنمائی سے مستفید ہوں۔ آخر میں، تدبر اور اخلاقی تربیت کا مستقل جائزہ لے کر اس کے اثرات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے تاکہ نصاب اور پروگرام مسلسل بہتر بنتے رہیں۔

اس طرح، مدارس و جامعات نہ صرف علمی میدان میں بلکہ فکری اور اخلاقی سطح پر بھی نوجوانوں کو انتہا پسندی کے اثرات سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ تدبرِ قرآن اور اخلاقی تربیت انہیں نہ صرف دینی تعلیمات کی گہری سمجھ عطا کرتی ہے بلکہ روزمرہ زندگی میں اعتدال، انصاف اور رواداری کے عملی مظاہر بھی سکھاتی ہے۔

فصل دوم

اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا اسلامی منہج

فصل دوم

اخلاقی تربیت اور کردار سازی کا اسلامی منہج

سیرتِ نبوی ﷺ فکری و عملی توازن، حلم، عفو اور رواداری کا بہترین عملی نمونہ پیش کرتی ہے جو انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ظلم و ستم کے باوجود ہمیشہ نرمی، درگزر اور حلم کا مظاہرہ فرمایا، یہاں تک کہ دشمن بھی آپ کے اخلاق سے متاثر ہو کر دوست بن گئے۔ مکہ کے ظلم، طائف کی اذیتوں اور غزوات کی سختیوں کے باوجود آپ ﷺ نے انتقام کے بجائے عدل، انصاف اور احسان کو ترجیح دی۔ خصوصاً فتحِ مکہ کے موقع پر آپ ﷺ کا عام معافی کا اعلان انسانی تاریخ میں اعتدال اور اعلیٰ اخلاق کی مثال ہے، جس نے دشمنی کو اخوت میں بدل دیا۔ یہ تعلیم ظاہر کرتی ہے کہ اخلاقِ حسنہ فکری اور عملی توازن پیدا کرتے ہیں اور امت کو سکھاتے ہیں کہ غصہ، نفرت اور انتقام کے بجائے صبر، عفو اور حلم اختیار کیا جائے۔

نبی ﷺ نے مخالفین کے ساتھ انصاف اور اعتدال کا برتاؤ کیا، جس سے معاشرے میں عدل و امن کی بنیاد مضبوط ہوئی۔ یہی اخلاقی توازن انتہا پسندی کے جذبات کو کم کرتا اور فکری نرمی کو فروغ دیتا ہے۔ سیرتِ نبوی ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ اخلاق ہی فکری اصلاح اور معاشرتی امن کی ضمانت ہیں۔ شدت پسندی کا علاج محض وعظ و نصیحت سے ممکن نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی کردار کے ذریعے ممکن ہے۔ جب امت سیرتِ نبوی کے اس اعتدال کو اپنائے تو معاشرہ ظلم، تعصب اور تکفیر سے پاک ہو سکتا ہے۔ یوں سیرتِ نبوی کا اخلاقی نظام انتہا پسندی کے تمام اسباب کے علاج کے طور پر سامنے آتا ہے۔

اخلاقِ حسنہ اور ان کی انتہا پسندی کے انسداد میں اہمیت

اسلام کا پورا نظامِ حیات اخلاقِ حسنہ پر استوار ہے۔ قرآنِ حکیم نے رسولِ اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد اخلاق کی تکمیل قرار دیا، کیونکہ یہی اخلاقی تربیت انسان کو اعتدال، تحمل اور رواداری سکھاتی ہے۔ انتہا پسندی دراصل اخلاقی بگاڑ کا نتیجہ ہے، جہاں غصہ، تعصب، عدم برداشت اور غرور غالب آ جاتے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ ان تمام منفی جذبات کا علاج فراہم کرتے ہیں۔

صبر، حلم، عفو، عدل، شکر، تواضع اور اخلاص جیسے اوصاف انسان کو توازنِ فکر و عمل عطا کرتے ہیں۔ جب معاشرہ ان اصولوں کو اپناتا ہے تو اختلاف دشمنی میں نہیں بدلتا اور دین کی دعوت نرمی و حکمت کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ اخلاقی تربیت انسان کو غلو، تکفیر اور تشدد سے روکتی ہے کیونکہ یہ دوسروں کے حقوق اور احساسات کا

لحاظ کرنا سکھاتی ہے۔ قرآن نے بارہا حلم، عفو اور عدل کو امن و سلامتی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ نبی ﷺ کی سیرت نے واضح کر دیا کہ فکری و عملی انتہا پسندی کا علاج صرف قوت سے نہیں بلکہ اخلاق سے ممکن ہے۔

جب افراد، علما اور ادارے اخلاقی اقدار کو تعلیم و دعوت کا حصہ بنائیں تو معاشرہ توازن اور سکون کی طرف لوٹتا ہے۔ یوں اخلاقِ حسنہ نہ صرف فرد کی اصلاح کرتے ہیں بلکہ امت کو فکری و عملی انتہا پسندی سے نجات دلانے کی بنیاد بھی فراہم کرتے ہیں۔ اخلاق ہی وہ قوت ہے جو انسان کے غلو، تعصب اور تشدد کو ضبط میں رکھتی ہے۔

امام الغزالی رحمہ اللہ (ت ۵۰۵ھ) بیان کرتے ہیں کہ اخلاقِ حسنہ انتہا پسندی کے انسداد میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں:

"مَنْ سَاسَ نَفْسَهُ بِالْأَخْلَاقِ الْحَسَنَةِ سَلِمَ مِنَ الْغُلُوِّ وَالْجَفَاءِ، فَإِنَّ سُوءَ الْخُلُقِ أَصْلُ كُلِّ فِتْنَةٍ."[(1)]-

جس نے اپنی نفس کو اچھے اخلاق سے سنوارا، وہ غلو اور سختی سے محفوظ رہا، کیونکہ بد اخلاقی ہر فتنہ و فساد کی جڑ ہے۔

یہ قول واضح کرتا ہے کہ اخلاقی تربیت انسان کے اندرونی توازن کی بنیاد ہے، جو انتہا پسندی کے خاتمے کا پہلا اور سب سے اہم زینہ ہے۔ اسلام میں اخلاقِ حسنہ جیسے صبر، حلم، عدل، رحمت اور حسنِ سلوک کو فکری و عملی اعتدال کی اصل بنیاد قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہ اوصاف انسان کو غلو، تعصب اور انتہا پسندی سے محفوظ رکھتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت نے یہ واضح کر دیا کہ معاشرتی امن اور فکری توازن اخلاقی تربیت اور حسنِ سیرت کے بغیر ممکن نہیں۔ لہٰذا انتہا پسندی کے انسداد کا حقیقی ذریعہ اخلاق کی اصلاح، حسنِ سیرت کی پیروی اور دلوں میں رحمت و عدل کی روح قائم کرنا ہے۔

جب دلوں سے رحمت اور عدل کی روح غائب ہو جاتی ہے تو معاشرہ ظلم، تعصب، نفرت اور انتہا پسندی کا شکار ہو جاتا ہے۔ عدل انسان کو انصاف، توازن اور حق گوئی کی راہ دکھاتا ہے، جبکہ رحمت دلوں میں نرمی، برداشت اور اخوت پیدا کرتی ہے۔ جب یہ دونوں اوصاف ختم ہو جائیں تو طاقتور کمزور پر ظلم کرتا ہے، معاشرت میں نفرتیں اور انتشار پیدا ہوتے ہیں، اور انسانیت خطرے میں آجاتی ہے۔ رحمت اور عدل وہ مضبوط بنیاد ہیں جن پر ایک صالح، پُرامن اور متوازن معاشرہ قائم ہوتا ہے، اور انہی کے ذریعے انسانیت کو حقیقی فلاح، بقا اور امن نصیب ہوتا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (ت ۷۲۸ھ) بیان کرتے ہیں:

"إِذَا خَلَتِ الْقُلُوبُ مِنَ الرَّحْمَةِ وَالْعَدْلِ ظَهَرَ الْبَغْيُ وَالتَّطَرُّفُ، وَالرَّحْمَةُ وَالْعَدْلُ أَصْلُ كُلِّ إِصْلَاحٍ."[(2)]-

---

(1) إحیاء علوم الدین، ج۳، ص۵۸

جب دلوں سے رحمت اور عدل ختم ہو جاتے ہیں تو ظلم اور انتہا پسندی پیدا ہوتی ہے، اور رحمت و عدل ہر اصلاح کی بنیاد ہیں۔

یہ بیان واضح کرتا ہے کہ اعتدال اور اصلاح کا سرچشمہ رحم، عدل اور حسنِ اخلاق ہیں۔

یہ بیان واضح کرتا ہے کہ دین دراصل اخلاقی اقدار کا مجموعہ ہے جو انسان کے کردار، رویے اور معاشرتی تعلقات کو سنوارتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دین کا کمال حسنِ اخلاق میں ہے، کیونکہ اچھا اخلاق ایمان کی پختگی اور دین کی حقیقت کی علامت ہے۔ جو شخص نرم گفتار، دیانت دار اور دوسروں کے لیے فائدہ مند ہو، وہ دراصل دین کے اصل مفہوم پر عمل کر رہا ہے۔ یہی سبب ہے کہ دین داری کا حقیقی معیار محض عبادت یا رسم و رواج نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاقی کردار اور دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک ہے۔ اگر انسان اپنے اخلاق میں نیک اور متوازن ہو تو اس کا دین بھی مضبوط، خالص اور اثر پذیر ہوتا ہے، اور یہ اخلاقی معیار فرد اور معاشرہ دونوں کے لیے اصلاح و اعتدال کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ (ت ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

"الدِّينُ كُلُّهُ خُلُقٌ، فَمَنْ زَادَ عَلَيْكَ فِي الْخُلُقِ، زَادَ عَلَيْكَ فِي الدِّينِ."[1]۔

دین سراسر اخلاق ہے، لہٰذا جس کا اخلاق تم سے بہتر ہے، اس کا دین بھی تم سے بہتر ہے۔

یہ قول انتہا پسندی کے مقابل اسلام کے اخلاقی منہج کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ دین کی اصل بنیاد سختی نہیں بلکہ نرمی، حلم اور حسنِ سلوک ہے۔

اچھا اخلاق دین کی روح اور امت کے اتحاد کی بنیاد ہے، کیونکہ یہ باہمی احترام، انصاف اور اعتدال کو فروغ دیتا ہے۔ جب افراد حسنِ اخلاق سے مزین ہوتے ہیں تو معاشرہ امن، محبت اور توازن کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ لیکن جب لوگ اچھے اخلاق سے محروم ہو جائیں تو خود غرضی، تنازع اور انتہا پسندی جنم لیتی ہے۔ ایسے معاشرے میں نہ دین کی روح باقی رہتی ہے اور نہ باہمی اعتماد۔ لہٰذا اخلاق ہی وہ قوت ہے جو امت کو اعتدال، اتفاق اور اصلاح کی راہ پر قائم رکھتی ہے۔ امام شاطبی رحمہ اللہ (ت ۷۹۰ھ) کے نزدیک اخلاقِ حسنہ فکری و معاشرتی توازن کے ضامن ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"الْخُلُقُ الْحَسَنُ يُقِيمُ الدِّينَ وَيُحَافِظُ عَلَى الْوَسَطِيَّةِ، فَإِذَا فَقَدَهُ النَّاسُ ظَهَرَ التَّنَازُعُ وَالْغُلُوُّ."[2]۔

---

[2] مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۱۰۹

[1] ابن القیم، مدارج السالکین، ج ۲، ص ۲۹۴

[2] الشاطبی، الموافقات، ج ۲، ص ۱۲۵

اچھا اخلاق دین کو قائم رکھتا ہے اور امت کو اعتدال پر برقرار رکھتا ہے، لیکن جب لوگ اس سے محروم ہو جاتے ہیں تو تنازع اور غلو پھیل جاتا ہے۔

انتہا پسندی کا خاتمہ اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں، کیونکہ یہی انسان کے نفس کو پاکیزگی عطا کرتی ہے۔ اخلاقی تربیت انسان میں صبر، برداشت اور رواداری پیدا کرتی ہے۔ جب انسان کا باطن سنور جائے تو اس کے رویے میں اعتدال آ جاتا ہے۔ یہی تربیت معاشرے میں امن، عدل اور ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہے۔ یوں اخلاقی اصلاح انتہا پسندی کے خاتمے کا سب سے مؤثر ذریعہ بنتی ہے۔ اس حوالے سے امام محمد عبدہ ؒ (ت ۱۳۲۳ھ) بیان کرتے ہیں:

"لَا يُمْكِنُ دَفْعُ التَّطَرُّفِ إِلَّا بِتَرْبِيَةٍ أَخْلَاقِيَّةٍ تُزَكِّي النَّفْسَ وَتُعَلِّمُ التَّسَامُحَ."[1]۔

انتہا پسندی کو صرف اخلاقی تربیت کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے، جو نفس کو پاکیزہ بنائے اور انسان کو برداشت و رواداری سکھائے۔

یہ قول تمہیدی طور پر واضح کرتا ہے کہ اخلاق ہی وہ عملی بنیاد ہیں جس پر فکری اصلاح اور اعتدال قائم رہتا ہے۔

اخلاقِ حسنہ انسانی معاشرے کی جان اور فکری ترقی کی بنیاد ہیں۔ جب معاشرے میں عدل، حلم، عفو اور رحم جیسے اوصاف پروان چڑھتے ہیں تو لوگوں کے درمیان اعتماد، محبت اور باہمی احترام مضبوط ہوتا ہے۔ انتہا پسندی دراصل اخلاقی زوال اور روحانی سختی کی وجہ سے جنم لیتی ہے، جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان میں برداشت اور نرمی ختم ہو جائے۔ اسلام نے انسان کو اخلاقی توازن اور جذباتی ضبط سکھایا ہے تاکہ اختلاف کو دشمنی اور تنقید کو نفرت میں نہ بدلے۔ اگر اخلاقی تربیت کو تعلیمی، سماجی اور مذہبی اداروں میں مرکزی حیثیت دی جائے تو فکری اور معاشرتی سطح پر انتہا پسندی کا خاتمہ ممکن ہے۔ متوازن معاشرہ وہ ہے جس کے لوگ باہمی احترام، رواداری اور انصاف کو اپنی زندگی کا اصول بنائیں۔ اخلاقی پاکیزگی صرف فرد کی بہتری نہیں بلکہ معاشرتی استحکام کا سبب بھی ہے۔ جب انسان دوسروں کے لیے وہی چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے، تو نفرت اور تصادم خود بخود کم ہو جاتے ہیں۔ فکری اصلاح اسی وقت مستحکم ہوتی ہے جب اس کی بنیاد اخلاقی کردار پر رکھی جائے۔ اسلامی تہذیب کی اصل طاقت اخلاق اور کردار کی پاکیزگی میں ہے، اور اگر معاشرہ اس بنیاد پر استوار ہو جائے تو تشدد اور انتہا

[1] محمد عبدہ، الأعمال الکاملہ، ج ۳، ص ۸۷

پسندی کی کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ یہی اخلاقی اور روحانی اساس امت کو اتحاد، امن اور اعتدال کی راہ پر گامزن کر سکتی ہے۔

ان تمام باتوں سے واضح ہوتا ہے کہ اخلاقِ حسنہ نہ صرف دین کی بنیاد ہیں بلکہ انتہا پسندی کے فکری، نفسیاتی اور معاشرتی اسباب کے علاج کا مؤثر ذریعہ بھی ہیں۔ صبر، حلم، عفو، عدل اور رحم کے اصول جب فرد اور معاشرے میں مضبوط ہوں تو تشدد، غلو اور تکفیر کی فضا خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

عدل، رواداری، حلم، عفو اور احسان کی تعلیمات

عدل، رواداری، حلم، عفو اور احسان انسان کے فکری اور عملی توازن کی بنیاد ہیں اور معاشرتی ہم آہنگی قائم رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ جب انسان اپنے اعمال میں عدل اختیار کرتا ہے تو وہ خود غرضی اور تعصب سے بچتا ہے اور معاشرے میں انصاف قائم ہوتا ہے۔ رواداری اختلاف رائے اور مختلف سوچ کے احترام کی تربیت دیتی ہے، جو انتہا پسندی کے ماحول کو کم کرتی ہے۔ حلم اور صبر انسان کو جذبات پر قابو پانے کی طاقت دیتے ہیں، جس سے غصہ اور اشتعال انگیزی کم ہو جاتی ہے۔ عفو اور درگزر لوگوں کو پرامن حل کے راستے اپنانے کی ترغیب دیتے ہیں اور اختلافات کو تصادم میں بدلنے سے روکتے ہیں۔ احسان فرد کو نیک اعمال کی طرف راغب کرتا ہے اور دوسروں کے حقوق اور احساسات کا احترام سکھاتا ہے، جس سے معاشرت میں ہمدردی اور برداشت بڑھتی ہے۔ یہ اخلاقی اصول فکری اصلاح کے بنیادی ستون ہیں کیونکہ متوازن اور نرم دل انسان انتہا پسندی کی طرف نہیں جاتا۔ جب معاشرے میں یہ صفات مضبوط ہوں تو افراد باہمی احترام، محبت اور تعاون کے جذبے کے تحت ایک دوسرے کے ساتھ تعلق قائم رکھتے ہیں۔ انتہا پسندی عموماً جذباتی اور فکری توازن کی کمی سے پیدا ہوتی ہے، اور یہ اصول اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔ تعلیم، تربیت اور عملی زندگی میں ان اوصاف کو اپنانا معاشرتی اصلاح اور امن کی ضمانت ہے۔ یہی اخلاقی اور فکری تربیت افراط و تفریط، غصہ اور تعصب سے بچاتی ہے اور پورے معاشرے کو انتہا پسندی سے محفوظ رکھتی ہے۔

عدل، رواداری، حلم، عفو اور احسان کی تعلیمات انتہا پسندی کی روک تھام کے لیے کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ جو شخص ہر معاملے میں عدل اور رحم کے اصولوں پر قائم رہتا ہے، وہ ہمیشہ توازن اور انصاف کی راہ پر چلتا ہے۔ عدل اسے ظلم اور ناانصافی سے بچاتا ہے، اور رحم اسے سخت دلی اور انتقام سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ دونوں صفات مل کر انسان کو اعتدال، بردباری اور تقویٰ عطا کرتی ہیں۔ جب دل میں انصاف اور نرمی ہو تو غلو، تعصب اور فتنہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اسی لیے عدل و رحم پر قائم رہنا ہی سلامتی، امن اور دینی اعتدال کا ذریعہ ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ (ت ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں:

"مَنْ تَمَسَّكَ بِالْعَدْلِ وَالرَّحْمَةِ فِي كُلِّ أَمْرِهِ نَجَا مِنَ الْغُلُوِّ وَالْفِتْنَةِ."[1]۔

جو ہر معاملے میں عدل اور رحم پر قائم رہے، وہ غلو اور فتنہ سے محفوظ رہتا ہے۔

رحمت عدل اور احسان وہ تین بنیادی اصول ہیں جن پر کسی بھی صالح معاشرے کی تعمیر ہوتی ہے۔ رحمت انسان کے دل میں نرمی اور ہمدردی پیدا کرتی ہے، عدل اسے انصاف اور توازن سکھاتا ہے، اور احسان انسان کو نیکی میں کمال تک پہنچاتا ہے۔ جب یہ اوصاف امت میں قائم رہیں تو ظلم، نفرت اور انتہا پسندی خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ انہی کے ذریعے فرد اور معاشرہ امن، ایمان اور بھائی چارے کی فضا میں پروان چڑھتا ہے۔ درحقیقت یہی اوصاف امت کو ہر شر اور فساد سے محفوظ رکھتے ہیں۔۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (ت ۷۲۸ھ) لکھتے ہیں:

"الرَّحْمَةُ وَالْعَدْلُ وَالإِحْسَانُ أَصْلُ كُلِّ إِصْلَاحٍ وَسَبِيلٌ لِلدَّفْعِ عَنِ الْأُمَّةِ كُلِّ شَرٍّ."[2]۔

رحمت، عدل اور احسان ہر اصلاح کی بنیاد ہیں اور امت کو ہر شر سے بچانے کا ذریعہ ہیں۔

رحمت، عدل اور احسان ہر اصلاح کی بنیاد ہیں اور امت کو ہر شر سے بچانے کا ذریعہ ہیں۔

صبر، حلم اور عفو وہ اعلیٰ اخلاقی اوصاف ہیں جو انسان کو امن، برداشت اور استقامت کی راہ پر قائم رکھتے ہیں۔ صبر مشکلات میں ثابت قدمی سکھاتا ہے، حلم غصے کو قابو میں رکھتا ہے، اور عفو دوسروں کی لغزشوں کو معاف کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ جو شخص ان صفات سے محروم ہو، وہ جلد اشتعال میں آکر انتہا پسندی اور غلو کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی اوصاف دلوں میں نرمی اور معاشرے میں سکون پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے صبر، حلم اور عفو ہی امن و استقامت کی اصل بنیاد ہیں۔ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ (ت ۷۵۱ھ) بیان کرتے ہیں:

"الصَّبْرُ وَالْحِلْمُ وَالْعَفْوُ سَبِيلٌ لِلسَّلَامِ وَالاسْتِقَامَةِ، وَمَنْ جَهِلَهَا قَادَهُ الْغُلُوُّ وَالتَّطَرُّفُ."[3]۔

صبر، حلم اور عفو امن اور استقامت کا راستہ ہیں، اور جو ان سے ناواقف ہے وہ غلو اور انتہا پسندی کی طرف جاتا ہے۔

اچھا اخلاق، عفو اور رحمت انسان کے کردار کو سنوارتے ہیں اور معاشرے میں توازن و ہم آہنگی پیدا کرتے ہیں۔

---

[1] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج۳، ص۵۹

[2] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۲۸، ص۱۱۰

[3] ابن القیم، مدارج السالکین، ج۲، ص۲۹۸

جب افراد ایک دوسرے کے ساتھ نرمی اور درگزر کا برتاؤ کرتے ہیں تو دلوں میں الفت اور باہمی اعتماد بڑھتا ہے۔ یہی اوصاف فکری اور عملی اعتدال کو قائم رکھتے ہیں، کیونکہ یہ انتقام، تعصب اور غصے کی جگہ برداشت اور انصاف کو فروغ دیتے ہیں۔ جب اخلاق، عفو اور رحمت غالب ہوں تو غلو اور انتہا پسندی خود بخود مٹ جاتی ہیں۔ یہی اوصاف ایک پُرامن اور معتدل معاشرے کی بنیاد بنتے ہیں۔ امام الشاطبی ؒ (ت ۷۹۰ھ) کہتے ہیں:

"الْخُلُقُ الْحَسَنُ وَالْعَفْوُ وَالرَّحْمَةُ يُحَافِظُونَ عَلَى الْوَسَطِيَّةِ وَيَزِيلُونَ أَسَاسَ التَّطَرُّفِ وَالْغُلُوِّ."[1]-

اچھا اخلاق، عفو اور رحمت فکری و عملی اعتدال کو برقرار رکھتے ہیں اور غلو و انتہا پسندی کی بنیاد کو ختم کرتے ہیں۔

انتہا پسندی اور غلو کو ختم کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ اخلاقی تربیت ہے، جو انسان کے نفس کو پاکیزہ اور متوازن بناتی ہے۔ جب انسان کی تربیت صبر، حلم اور عفو پر مبنی ہو تو وہ اشتعال، نفرت اور انتقام سے محفوظ رہتا ہے۔ اخلاقی تربیت دلوں میں نرمی، برداشت اور عدل کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ یہی تربیت فرد کو خود احتسابی سکھاتی ہے اور اسے دوسروں کے لیے رحمت بناتی ہے۔ اس طرح اخلاقی تربیت ہی وہ بنیاد ہے جو معاشرے کو اعتدال، امن اور اصلاح کی راہ پر قائم رکھتی ہے۔ امام محمد عبدہ ؒ (ت ۱۳۲۳ھ) بیان کرتے ہیں:

"لَا يُمْكِنُ دَفْعُ التَّطَرُّفِ وَالْغُلُوِّ إِلَّا بِتَرْبِيَةٍ أَخْلَاقِيَّةٍ تُزَكِّي النَّفْسَ وَتُعَلِّمُ الصَّبْرَ وَالْحِلْمَ وَالْعَفْوَ.[2]-

انتہا پسندی اور غلو کو صرف اخلاقی تربیت کے ذریعے روکا جا سکتا ہے، جو نفس کو پاکیزہ بنائے اور صبر، حلم اور عفو سکھائے۔

ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ عدل، رواداری، حلم، عفو اور احسان صرف اخلاقی فضائل نہیں بلکہ فکری، نفسیاتی اور معاشرتی اعتدال کے اصول ہیں۔

یہ اوصاف افراد میں برداشت پیدا کرتے ہیں، معاشرتی تعلقات کو مضبوط کرتے ہیں اور انتہا پسندی، تشدد اور تعصب کے تمام اسباب کو ختم کرنے کا مؤثر ذریعہ بنتے ہیں۔

---

[1] الشاطبی، الموافقات، ج۲، ص۱۲۷

[2] محمد عبدہ، الأعمال الکاملہ، ج۳، ص۹۰

شدت، عداوت اور تکفیر سے اجتناب کے اخلاقی اصول

شدت، عداوت اور تکفیر سے اجتناب اسلام میں انسانی رویوں کو متوازن اور معاشرتی تعلقات کو محفوظ رکھنے کی بنیاد ہیں۔ یہ اصول انسان کو جذبات کے بہاؤ میں بہنے سے روکتے ہیں اور اختلاف رائے کو دشمنی میں بدلنے سے باز رکھتے ہیں۔ انتہا پسندی عموماً اس وقت پیدا ہوتی ہے جب لوگ اپنے نظریات یا عقائد کے تحفظ کے لیے جارحیت، غصہ یا تعصب اختیار کرتے ہیں۔ شدت اور تکفیر سے دور رہنے کا اخلاقی رویہ انسان میں تحمل، حلم اور برداشت پیدا کرتا ہے، جو فکری اور عملی اصلاح کی راہ ہموار کرتا ہے۔ عداوت سے اجتناب معاشرتی امن اور بھائی چارے کو فروغ دیتا ہے، کیونکہ یہ اختلافات کو تصادم میں بدلنے سے روکتا ہے۔ جب افراد اختلافات کے باوجود احترام، نرمی اور رواداری اپناتے ہیں تو انتہا پسندی کی فضا خود بخود کمزور پڑ جاتی ہے۔ امام الغزالی رحمہ اللہ (ت ۵۰۵ھ) وضاحت کرتے ہیں:

"مَنْ تَجَنَّبَ الشِّدَّةَ وَالْغَضَبَ وَعَمِلَ بِالرَّحْمَةِ وَالْحِلْمِ فَقَدْ أَمِنَ نَفْسَهُ وَمُجْتَمَعَهُ مِنَ الْفِتَنِ."[1]-

جو شدت، غصہ اور جارحیت سے بچتا ہے اور رحم و حلم اختیار کرتا ہے، اس نے نہ صرف اپنی نفس بلکہ معاشرہ کو فتنہ سے محفوظ رکھا۔

یہ اصول نہ صرف فرد کی اصلاح کا ذریعہ ہیں بلکہ پورے معاشرے میں فکری توازن اور اخلاقی استحکام پیدا کرتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات نے بارہا تاکید کی ہے کہ دین کی حقیقی حفاظت سختی یا تشدد سے نہیں بلکہ اخلاقی توازن اور حسنِ سلوک سے ممکن ہے۔ تحمل اور صبر کے ذریعے انسان کے دل میں رحمت اور انصاف کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں۔

اس سے نہ صرف انتہا پسندی روکتی ہے بلکہ معاشرت میں محبت، تعاون اور ہم آہنگی کو فروغ ملتا ہے۔ اخلاقی تربیت کے یہ اصول افراد کو غلو، تعصب اور تکفیر کی طرف جانے سے باز رکھتے ہیں۔ یہی رویہ فکری اور عملی اصلاح کی بنیاد بنتا ہے۔

جب یہ صفات معاشرت میں راسخ ہوں تو انتہا پسندی کی تمام صورتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ یوں شدت، عداوت اور تکفیر سے اجتناب کے اخلاقی اصول نہ صرف فرد کی اصلاح کے لیے ضروری ہیں بلکہ پورے معاشرے کو فکری اور عملی انتہا پسندی سے محفوظ رکھنے کا مؤثر ذریعہ بھی ہیں۔۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (ت ۷۲۸ھ) بیان کرتے ہیں:

---

[1] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج۳، ص ۶۲

"إِذَا نَفَى الْقَلْبُ الشِّدَّةَ وَالتَّطَرُّفَ وَاعْتَمَدَ عَلَى الرَّحْمَةِ وَالْحِلْمِ فَقَدْ وَجَدَ سَبِيلَ الْإِصْلَاحِ وَالدَّفْعِ عَنِ الشَّرِّ."[1]۔

جب دل شدت اور انتہا پسندی سے خالی ہو اور رحم و حلم پر قائم رہے، تو وہ اصلاح اور شر سے بچاؤ کا راستہ پا لیتا ہے۔

عفو اور عداوت سے اجتناب انسان کے دل میں نرمی، وسعتِ ظرف اور امن پسندی پیدا کرتے ہیں۔ جو شخص دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنا جانتا ہے، وہ کینہ، نفرت اور انتقام سے بچ جاتا ہے۔ یہی رویہ معاشرے میں محبت، رواداری اور استقامت کو فروغ دیتا ہے۔ لیکن جو عفو سے ناواقف ہو، وہ جلد غصے اور دشمنی کے زیرِ اثر آکر غلو اور انتہا پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لیے عفو اور دشمنی سے پرہیز ہی امن، اعتدال اور باہمی ہم آہنگی کی اصل بنیاد ہیں۔ ابن القیم الجوزیہ رحمہ اللہ (ت ۷۵۱ھ) لکھتے ہیں:

"الْعَفْوُ وَتَجَنُّبُ الْعَدَاوَةِ أَسَاسٌ لِلسَّلَامِ وَالِاسْتِقَامَةِ، وَمَنْ جَهِلَهُ انْغَمَسَ فِي الْغُلُوِّ وَالتَّطَرُّفِ."[2]۔

عفو اور عداوت سے اجتناب امن اور استقامت کی بنیاد ہیں، اور جو ان سے ناواقف ہے وہ غلو اور انتہا پسندی میں مبتلا ہوتا ہے۔

عداوت، تکفیر اور غلو سے اجتناب امتِ مسلمہ کے لیے فکری اور عملی اعتدال کا بنیادی زینہ ہے۔ جب مسلمان ایک دوسرے کے خلاف دشمنی، نفرت یا کفر کے فتوے دینے سے گریز کرتے ہیں تو نہ صرف باہمی اعتماد اور بھائی چارے کی فضا قائم ہوتی ہے بلکہ امت میں اتحاد، ہم آہنگی اور مشترکہ ذمہ داری کا جذبہ بھی فروغ پاتا ہے۔ غلو اور انتہا پسندی انسان کو انصاف، تحمل اور اعتدال سے دور کر دیتی ہے، جبکہ دینِ اسلام کی تعلیمات میں ہمیشہ درمیانی راہ، نرمی اور فہمِ درست کو ترجیح دی گئی ہے۔ اعتدال اپنانے والے افراد اپنے رویے، افکار اور فیصلوں میں توازن پیدا کرتے ہیں، جس سے عملی زندگی میں امن، برداشت، تعاون اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کے مظاہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اس طرح امتِ مسلمہ ایک مضبوط، متوازن اور مثالی معاشرہ تشکیل دیتی ہے جو نہ صرف فکری طور پر مستحکم ہوتا ہے بلکہ اخلاقی اور عملی طور پر بھی ایک دوسرے کے لیے مشعل راہ بنتا ہے۔ امام الشاطبی رحمہ اللہ (ت ۷۹۰ھ) کا قول ہے:

"تَجَنُّبُ الْعَدَاوَةِ وَالتَّكْفِيرِ وَالْغُلُوِّ يَحْمِلُ الْأُمَّةَ عَلَى وَسَطِيَّةِ الْفِكْرِ وَالْعَمَلِ."[3]۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۱۱۲

[2] ابن القیم، مدارج السالکین، ج ۲، ص ۳۰۲

عداوت، تکفیر اور غلو سے اجتناب امت کو فکری اور عملی اعتدال کی طرف لے جاتا ہے۔

انتہا پسندی، شدت اور عداوت کا علاج صرف اخلاقی تربیت کے ذریعے ممکن ہے، کیونکہ اخلاق انسان کے باطن کو سنوارتے ہیں۔ جب انسان صبر، حلم، عفو اور رحمت جیسے اوصاف اختیار کرتا ہے تو اس کے اندر نرمی اور برداشت پیدا ہوتی ہے۔ یہی صفات اسے غصے، نفرت اور انتقام سے دور رکھتی ہیں۔ اخلاقی تربیت فرد کے رویے میں توازن پیدا کرتی ہے اور اسے دوسروں کے حقوق کا احترام سکھاتی ہے۔ نتیجتاً معاشرہ امن، اعتدال اور باہمی محبت کا گہوارہ بن جاتا ہے۔ امام محمد عبدہ رحمہ اللہ (ت ۱۳۲۳ھ) بیان کرتے ہیں:

"لَا يُمْكِنُ دَفْعُ التَّطَرُّفِ وَالشِّدَّةِ وَالْعَدَاوَةِ إِلَّا بِتَرْبِيَةٍ أَخْلَاقِيَّةٍ تُعَلِّمُ الصَّبْرَ وَالْحِلْمَ وَتَحْتَوِي الْعَفْوَ وَالرَّحْمَةَ."[1]۔

انتہا پسندی، شدت اور عداوت کو صرف اخلاقی تربیت کے ذریعے روکا جا سکتا ہے، جو صبر، حلم، عفو اور رحمت سکھائے۔

ان اقوال سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شدت، عداوت اور تکفیر سے اجتناب انسانی فکری اور عملی توازن کی بنیاد ہیں۔ یہ اصول انسان کو جذبات کے بہاؤ میں بہنے سے روکنے کے ساتھ اختلافات کو دشمنی میں تبدیل ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔ انتہا پسندی اس وقت جنم لیتی ہے جب لوگ اپنے نظریات یا عقائد کے تحفظ کے لیے غصہ، تعصب اور جارحیت اختیار کرتے ہیں، جبکہ اخلاقی رویہ، جس میں صبر، حلم، عفو اور رحم شامل ہیں، انسان کو فکری اصلاح اور عملی اعتدال کی طرف مائل کرتا ہے۔ عداوت سے اجتناب سماجی تعلقات میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور اختلافات کو پر امن انداز میں حل کرنے کی ترغیب دیتا ہے، جبکہ تکفیر سے دوری افراد کو برداشت اور رواداری سکھاتی ہے، جو معاشرت میں تشدد اور غلو کے امکانات کو کم کرتی ہے۔ جب یہ اصول فرد اور معاشرہ میں راسخ ہوں تو انتہا پسندی کی فضا خود بخود کمزور ہو جاتی ہے۔ اخلاقی تربیت انسان کے دل میں انصاف اور نرمی کے جذبات پیدا کرتی ہے، جس سے معاشرتی تعلقات مضبوط اور مستحکم رہتے ہیں۔ اس طرح شدت، عداوت اور تکفیر سے اجتناب نہ صرف فرد کے فکری اور عملی توازن کے لیے ضروری ہے بلکہ پورے معاشرے میں انتہا پسندی، غلو اور تشدد کے اسباب کو ختم کرنے کا مؤثر ذریعہ بھی ہے۔ یہ اصول اختلافات کو پر امن اور مثبت انداز میں حل کرنے، تحمل و رواداری کو فروغ دینے اور معاشرتی سکون و فکری اعتدال قائم رکھنے کے لیے لازمی ہیں۔

---

[3] الشاطبی، الموافقات، ج ۲، ص ۱۳۰

[1] محمد عبدہ، الأعمال الکاملہ، ج ۳، ص ۹۲

فصل سوم
تربیتی و تعلیمی حکمتِ عملی

فصل سوم

تربیتی و تعلیمی حکمتِ عملی

تعلیم و تربیت میں فکری توازن کا کردار

تعلیم و تربیت انسانی فکر، اخلاق اور کردار کی تشکیل میں بنیادی ستون کی حیثیت رکھتی ہیں، اور یہی فکری توازن پیدا کرنے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے۔ جب تعلیم کا مقصد صرف معلومات کا حصول نہیں بلکہ طلبہ کے شعور، اخلاقی اقدار اور عملی صلاحیتوں کی نشوونما ہو تو انتہا پسندی کی جڑیں خود بخود کمزور ہو جاتی ہیں۔ متوازن تعلیم وہ ہے جو دینی و عصری علوم کے درمیان ہم آہنگی قائم کرے، عقل و نقل، علم و عمل، اور نظر و تجربہ کے درمیان توازن پیدا کرے، تاکہ طلبہ فہم، برداشت، مکالمے اور تعاون کی صلاحیت حاصل کریں۔

تربیت اس فکری توازن کو عملی شکل دیتی ہے، کیونکہ صرف علم کفایت نہیں کرتا جب تک اخلاقی نظم، روحانی تزکیہ اور عملی بصیرت کے اصول اس کے ساتھ شامل نہ ہوں۔ ایسے تربیتی نظام کے ذریعے طلبہ میں حلم، عدل، صبر، اور رواداری کی عادت پیدا ہوتی ہے، جو شدت پسندی، تعصب اور غیر ضروری اختلافات کو کم کرنے کا سبب بنتی ہے۔ تعلیم و تربیت کے یہ اصول فکری انتہا پسندی کے نفسیاتی، عملی اور نظری اسباب کو ختم کرتے ہیں اور معاشرے میں پرامن، معتدل اور باشعور فضا قائم کرتے ہیں۔

اسی طریقہ کار سے وہ قیادت بھی جنم لیتی ہے جو اصلاح، امن اور اجتماعی بہبود کا پیغام دیتی ہے، نہ کہ نفرت اور انتشار کا۔ یوں تعلیم و تربیت نہ صرف فرد کی فکری اور اخلاقی نشوونما کا ذریعہ ہیں بلکہ پورے معاشرے میں فکری توازن اور انتہا پسندی کے خاتمے کی مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ یہ علمی، اخلاقی اور عملی امتزاج امت میں پرامن، معتدل اور باشعور معاشرت کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے۔ ائمہ کے اقوال کی روشنی میں جائزہ لیتے ہیں:

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"إنما يُصلحُ آخرَ هذه الأمة ما أصلحَ أوّلَها: علمٌ نافعٌ وعملٌ صالحٌ."[1]

---

[1] الشاطبی، الاعتصام، ج۱، ص۴۹

امام مالک رحمہ اللہ کے مطابق امت کی اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب تعلیم نافع ہو اور عمل صالح۔ نافع علم وہ ہے جو انسان میں تحمل، عدل، اور خیر خواہی پیدا کرے۔ یہی وہ تعلیم و تربیت ہے جو معاشرے کو انتہا پسندی سے محفوظ رکھتی ہے اور فکری توازن کو فروغ دیتی ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ کے نزدیک علم اور عمل کا توازن ہی فکری اعتدال کی بنیاد ہے۔ جب تعلیم محض نظری ہو اور عمل و اخلاق سے خالی ہو تو وہ انسان میں غرور، سختی اور تکفیر کا رجحان پیدا کرتی ہے، جو انتہا پسندی کا سبب بنتا ہے۔

امام غزالی رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"العلمُ بلا عملٍ جنونٌ، والعملُ بلا علمٍ لا يكونُ."[1]

علم بغیر عمل کے جنون ہے، اور عمل بغیر علم کے ممکن نہیں۔

یہ حقیقت واضح کرتی ہے کہ علم اور عمل ایک دوسرے کے لازمی جزو ہیں، اور ان کے بغیر فکری و عملی توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی شخص علم تو حاصل کرے مگر اس پر عمل نہ کرے تو اس کا علم محض زبانی دعویٰ بن کر رہ جاتا ہے اور حقیقی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح، جو شخص بغیر علم کے محض جذبے یا احساسات کی بنیاد پر عمل کرتا ہے، وہ آسانی سے بھٹک سکتا ہے اور راہِ حق سے دور ہو سکتا ہے، کیونکہ علم ہی عمل کو درست سمت اور حکمت فراہم کرتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک علم کے بغیر مذہبی جذبہ بھی گمراہی کا سبب بنتا ہے، کیونکہ بغیر علم کے عمل غیر متوازن اور غیر مؤثر ہو جاتا ہے۔ انسان کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب اس کا علم اس کے عمل کی بنیاد بنے، اور دونوں میں مکمل توازن اور ہم آہنگی موجود ہو۔ اس طرح علم و عمل کا امتزاج نہ صرف فرد کو فکری و اخلاقی اعتدال عطا کرتا ہے بلکہ امت میں بھی صحیح رہنمائی، عدل اور اصلاح کا ذریعہ بنتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نزدیک علم کے بغیر مذہبی جذبہ گمراہی کا باعث بنتا ہے، آپ لکھتے ہیں:

"من عبدَ الله بعلمٍ كان من أهل الهدى، ومن عبدَه بغير علمٍ كان من أهلِ الضلال."[2]

جس نے علم کے ساتھ اللہ کی عبادت کی، وہ ہدایت یافتہ لوگوں میں سے ہے، اور جس نے بغیر علم کے عبادت کی، وہ گمراہوں میں سے ہے۔

---

[1] إحياء علوم الدين، ج ۱، ص ۵۴

[2] مجموع الفتاوی، ج ۱۱، ص ۶۲۶

اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ عبادت صرف اخلاص سے نہیں بلکہ علم کی روشنی میں درست طریقے سے ہونی چاہیے۔ علم انسان کو یہ سمجھ بخشتا ہے کہ اللہ کی عبادت کس طرح کی جائے اور کون سے اعمال مقبول ہیں۔ جو شخص علم کے بغیر عبادت کرتا ہے، وہ نادانی میں غلط راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے سچی ہدایت اسی کے نصیب میں ہے جو علم اور عمل دونوں کو یکجا کر کے عبادت کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس سے انتہا پسند گروہ جنم لیتے ہیں، کیونکہ ان کے جذبات تو مذہبی ہوتے ہیں مگر ان کی بنیاد علم، حکمت اور فہمِ دین پر نہیں ہوتی۔

ابن القیم رحمہ اللہ واضح کرتے ہیں کہ اصلاح علم و عمل کے امتزاج میں ہے۔ جب علم صحیح بنیادوں پر ہو اور اس کے مطابق تربیت دی جائے تو انسان کے اندر توازن اور بصیرت پیدا ہوتی ہے، جو اسے غلو اور شدت سے محفوظ رکھتی ہے، آپ لکھتے ہیں:

"صلاحُ العبدِ في أن يتعلّمَ الحقَّ ويعملَ به، وفسادُه في الجهلِ به أو تركِ العملِ به."[1]

بندے کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ حق کو سیکھے اور اس پر عمل کرے، اور اس کی تباہی اس میں ہے کہ وہ حق سے جاہل رہے یا اس پر عمل نہ کرے۔

یہ قول انسان کی اصلاح اور بگاڑ کا اصل معیار بیان کرتا ہے۔ انسان کی کامیابی اس وقت ممکن ہے جب وہ علمِ حق حاصل کرے اور اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھالے۔ جو شخص حق سے غافل ہو یا جان کر بھی اس پر عمل نہ کرے، وہ گمراہی اور بربادی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حقیقی نجات اسی کے لیے ہے جو علم کے ذریعے حق کو پہچانے اور اپنے عمل سے اسے ظاہر کرے۔

امام شاطبی رحمہ اللہ تعلیم میں مقصدی تربیت کی اہمیت پر زور دیتے ہیں۔ اگر تعلیم محض معلوماتی ہو اور اس کا مقصد تزکیہ و اخلاقی تربیت نہ ہو تو وہ فکری بگاڑ اور انتہا پسندی کو جنم دیتی ہے، کیونکہ ایسے افراد علم کو اصلاح کے بجائے نفرت کے فروغ میں استعمال کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"المتعلمُ إذا لم يُرَبَّ على مقاصدِ العلمِ صارَ علمُه سببَ فسادٍ لا إصلاحٍ."[2]

جب طالبِ علم کو علم کے مقاصد پر تربیت نہ دی جائے تو اس کا علم اصلاح کے بجائے فساد کا سبب بن جاتا ہے۔

---

[1] مدارج السالکین، ج ۱، ص ۸۱

[2] الشاطبی، الموافقات، ج ۱، ص ۷۰

یہ اقوال اور تشریح واضح طور پر اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ علم اور اخلاق و روحانی تربیت کا امتزاج ہی فکری توازن اور اعتدال پیدا کرتا ہے۔ علم کا مقصد محض معلومات جمع کرنا نہیں بلکہ انسان کے کردار کو سنوارنا، عدل، رحم اور خیر کو فروغ دینا ہے۔ اگر علم عمل اور اخلاق سے خالی ہو تو وہ اصلاح کے بجائے فساد اور غلو پیدا کرتا ہے، جبکہ حقیقی تعلیم انسان کو فہمِ دین، برداشت، عدل و رحمت کے اصول سکھاتی ہے۔ اسی امتزاج کے ذریعے نوجوان نسل میں فکری بصیرت، اخلاقی پختگی اور توازن پیدا ہوتا ہے جو انتہا پسندی کے تمام فکری و نفسیاتی اسباب کو ختم کر دیتا ہے۔

اساتذہ اس نظام میں بنیادی ستون ہیں۔ وہ طلبہ کے ذہن و فکر کی تشکیل کرتے ہیں اور اگر علم کے ساتھ کردار، رواداری اور اعتدال کا نمونہ پیش کریں تو نسلوں میں فکری توازن اور برداشت پروان چڑھتی ہے۔ اساتذہ مکالمے، احترام اختلاف اور اخلاقی تربیت کے ذریعے فکری انتہا پسندی کا سدِّباب کر سکتے ہیں۔ ان کا معتدل رویہ طلبہ کو علمی تحقیق، دلیل اور عدل کی راہ دکھاتا ہے، اور یہ انہیں محض معلومات نہیں بلکہ شعور، بصیرت اور اخلاقی قوت عطا کرتا ہے۔

اساتذہ مدارس و جامعات کو ایک "معتدل فکری ماڈل" فراہم کریں، جو طلبہ میں امن، خدمت اور اجتماعی بھلائی کا جذبہ پیدا کرے۔ جب تعلیم و تربیت کے مراکز علم کو اخلاق اور عمل کے ساتھ جوڑ دیں، تو معاشرہ فکری زہر سے پاک اور بصیرت و اعتدال سے مالامال ہو سکتا ہے۔ یوں اساتذہ اور تعلیمی ادارے صرف علمی مراکز نہیں بلکہ معاشرتی امن، فکری استحکام اور انتہا پسندی کے خاتمے کے قلعے بن جاتے ہیں، ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"إنَّ هذا العِلْمَ دينٌ، فانظروا عمَّن تأخذونَ دينَكم. ."[1]

یقیناً یہ علم دین ہے، پس دیکھو تم اپنا دین کس سے حاصل کرتے ہو۔

دراصل علم کے مأخذ میں احتیاط کی تعلیم دیتا ہے۔ آپ نے خبردار فرمایا کہ اہلِ باطل اور اہلِ خواہش سے علم حاصل کرنا خطرناک ہے، کیونکہ وہ دین کو اپنی رائے اور خواہش کے تابع کر دیتے ہیں۔ ایسے افراد کا علم امت میں انتشار، فکری انحراف اور انتہا پسندی کو جنم دیتا ہے۔ امام ابنِ سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک علم وہی معتبر ہے جو قرآن و سنت اور اہلِ حق کی روایت سے ماخوذ ہو۔ اس اصول کی پابندی ہی فکری اعتدال اور دینی بصیرت کا

---

[1] الخطیب البغدادی، الجامع لأخلاق الراوی وآداب السامع، ج ۲، ص ۱۷۳

ضامن ہے۔ اور اہلِ باطل و اہلِ خواہش سے علم لینے کے خطرات بیان ہوئے، جو فکری انحراف اور انتہا پسندی کو جنم دیتے ہیں۔

اسی طرح امام مالک نے انتباہ کیا کہ علم ایسے افراد سے نہ لیا جائے جو خود فکری انحراف میں مبتلا ہوں۔ یہی اصول آج مدارس و جامعات پر بھی لاگو ہوتا ہے۔ اگر اساتذہ خود اعتدال، تحمل، اور صداقت کے حامل ہوں تو وہ ایسی نسل تیار کرتے ہیں جو شدت پسندی سے محفوظ رہتی ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"لا يُؤخذُ العلمُ عن أربعةٍ: سفيهٍ يُعلنُ السَّفهَ، وصاحبِ هوىً يدعو إليه، ومن يُكذبُ في حديثِ الناسِ، ورجلٍ لا يعرفُ ما يقول."(1)

علم چار قسم کے لوگوں سے حاصل نہیں کیا جاتا: ۱- ایسے بے وقوف سے جو علانیہ اپنی حماقت ظاہر کرتا ہو، ۲- ایسے خواہش پرست سے جو اپنے باطل نظریے کی دعوت دیتا ہو، ۳- ایسے شخص سے جو لوگوں کی باتوں میں جھوٹ بولتا ہو، ۴- ایسے آدمی سے جو یہ نہیں جانتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے اس قول میں علم کے مأخذ میں احتیاط کا اصول بیان ہوا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ علم چار قسم کے لوگوں سے نہیں لیا جانا چاہیے: فاسق و بے عمل شخص، اہلِ خواہش جو اپنی رائے کی طرف بلائے، جھوٹا راوی، اور نادان عالم جو علم کی حقیقت سے ناواقف ہو۔ ایسے افراد علم کو بگاڑ دیتے ہیں اور دین میں تحریف و افراط کا باعث بنتے ہیں۔ ان سے علم لینا فکری گمراہی اور انتہا پسندی کو جنم دیتا ہے۔ صحیح علم ہمیشہ اہلِ تقویٰ، صدق اور اعتدال رکھنے والے علما سے حاصل کرنا چاہیے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ صحیح علم انسان کی روزمرہ روحانی و فکری غذا ہے، جس کے بغیر وہ راہِ اعتدال سے ہٹ جاتا ہے، لکھتے ہیں:

النَّاسُ أحوجُ إلى العلمِ منهم إلى الطعامِ والشرابِ، لأنَّ الرجلَ يحتاجُ إلى الطعامِ والشرابِ في اليومِ مرَّةً أو مرَّتين، وحاجتُه إلى العلمِ بعددِ أنفاسِه. "(2)

---

(1) ابن عبد البر، جامع بیان العلم، ج۲، ص ۱۲۲

(2) ابن الجوزی، عبد الرحمن بن علی، مناقب الإمام احمد، المحقق: عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، دار ھجر: ۱۴۰۹، ص: ۱۸۴؛ ابن قیم، مفتاح دار السعادۃ، ج۱، ص: ۶۹

لوگ علم کے اس قدر محتاج ہیں کہ ان کی حاجت علم کی طرف کھانے پینے سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ انسان کو کھانے پینے کی ضرورت دن میں ایک یا دو بار ہوتی ہے، مگر علم کی ضرورت ہر سانس کے ساتھ ہے۔

یہ قول امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے اس فکری اصول کی وضاحت کرتا ہے کہ علم انسانی زندگی میں روحانی اور عملی بقا کے لیے کھانے کی طرح بنیادی ضرورت ہے۔ جیسے جسم کو خوراک کی ضرورت ہوتی ہے، ویسے ہی روح، عقل اور عمل کو ہدایت و فکری رہنمائی کے لیے علم کی ضرورت ہے۔ علم صرف معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ انسان کے فکر، کردار اور اخلاق کی رہنمائی کرنے والا روشن سرچشمہ ہے۔ علم کے بغیر انسان راہِ حق سے بھٹک جاتا ہے اور جہالت انتہا پسندی، تعصب اور گمراہی کو جنم دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں علم کی بہت اہمیت ہے اور اسے انسان کی زندگی اور معاشرت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔

اسی تناظر میں بچے کی تربیت بھی علم و ہدایت کی روشنی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ بچہ والدین کے لیے امانت ہے، اور اس کے دل کی پاکیزگی ایک چمکتے ہوئے گوہر کی مانند ہے۔ اگر والدین اس کی پرورش میں نیکی، عبادت اور اخلاق کی تعلیم دیں، تو وہ ایک صالح، مفید اور متوازن شخصیت کا حامل انسان بنتا ہے۔ لیکن اگر والدین تربیت میں لاپرواہی برتیں یا برے ماحول میں چھوڑ دیں تو بچہ گمراہی اور بدبختی کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔ یوں بچے کی صحیح تربیت محض فرد کی اصلاح نہیں بلکہ مستقبل کے معاشرے کی فکری اور اخلاقی بنیاد ہے۔ والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایمان، کردار اور علم سے آراستہ کریں تاکہ وہ نہ صرف صالح انسان بنیں بلکہ معاشرت میں اعتدال، اخلاق اور فکری بصیرت کے فروغ کا ذریعہ بھی بنیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ وضاحت کرتے ہیں:

"الصبيُّ أمانةٌ عندَ والديه، وقلبُه الطاهرُ جوهرةٌ نفيسةٌ، فإن عُوِّدَ الخيرَ نشأ عليه، وإن أُهمِلَ شقيَ وهلك."(1)

بچہ اپنے والدین کے پاس ایک امانت ہے، اس کا پاکیزہ دل ایک قیمتی جوہر کی مانند ہے۔ اگر اسے نیکی کا عادی بنایا جائے تو وہ نیکی ہی پر پروان چڑھے گا، اور اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو وہ بدبخت اور ہلاک ہو جائے گا۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ تعلیم کی ابتدا ہی سے تربیتِ اخلاق اور روحِ خیر پر زور دینا لازم ہے۔ گویا تربیت کی بنیاد کم عمری سے ڈالی جانی چاہیے۔ اگر اساتذہ اور مدارس طلبہ کو خیر، حلم، اور

---

(1) الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج۳، ص ۷۲

عدل کا عادی بنا دیں تو وہ فکری توازن کے حامل بنیں گے۔ لیکن اگر تربیت کو نظر انداز کیا جائے تو یہی ذہن شدت پسندی اور نفرت کا شکار ہو سکتے ہیں۔

علم انسان کی روح کی غذا ہے، جس کی ضرورت جسمانی خوراک سے بھی زیادہ اہم ہے۔ کھانا اور پینا صرف جسم کو زندہ رکھتے ہیں، مگر علم انسان کے دل و دماغ کو روشن کرتا ہے اور اسے صحیح راہ دکھاتا ہے۔ جسم کی بھوک دن میں چند بار محسوس ہوتی ہے، لیکن علم کی ضرورت ہر لمحہ اور ہر فیصلے میں پیش آتی ہے۔ بغیر علم کے انسان اندھیرے میں بھٹکتا ہے، چاہے اس کے پاس دنیا کی تمام نعمتیں کیوں نہ ہوں۔ اس لیے علم زندگی کی سب سے بڑی ضرورت اور کامیابی کی اصل بنیاد ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"الناسُ أحوجُ إلى العلمِ من حاجتِهم إلى الطعامِ والشرابِ، لأن الطعامَ والشرابَ يُحتاجُ إليه في اليومِ مرّةً أو مرتين، والعلمُ يُحتاجُ إليه في كلِّ نفسٍ."[1]

لوگوں کو علم کی ضرورت کھانے اور پینے سے بھی زیادہ ہے، کیونکہ کھانے اور پینے کی ضرورت دن میں ایک یا دو بار پیش آتی ہے، جبکہ علم کی ضرورت ہر سانس کے ساتھ پیش آتی ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ تعلیم کو روحانی و فکری غذا قرار دیتے ہیں۔ اگر مدارس و جامعات علمِ نافع اور بصیرتِ دینی کو عام کریں تو یہ انسان کو جہالت و غلو سے بچاتے ہیں۔ یہی تعلیم، اگر اعتدال کے ساتھ دی جائے، تو شدت پسندی کے ہر فکری زہر کا تریاق بن جاتی ہے۔

حقیقی علم یہ ہے کہ انسان اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کو سمجھے اور ان پر عمل کرے۔ علم کا مقصد صرف بحث و مباحثہ یا اختلافات میں الجھنا نہیں بلکہ عمل اور اطاعت ہے۔ جو شخص علم حاصل کر کے اسے اپنی زندگی میں نافذ کرتا ہے، وہی عالمِ باعمل کہلاتا ہے۔ بحث و جدل دلوں میں سختی اور تفرقہ پیدا کرتے ہیں، جبکہ علم پر عمل انسان کو تقویٰ اور ہدایت کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ اس لیے سچا علم وہی ہے جو کردار میں نرمی، عمل میں اخلاص اور دل میں ایمان پیدا کرے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"العلمُ قالَ اللهُ وقالَ الرسولُ صلی اللہ علیہ وسلم ، وليسَ العلمُ بكثرةِ الجدلِ والخلافِ."[2]

علم یہ ہے کہ (انسان) "اللہ نے فرمایا" اور "رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" پر عمل کرے، علم یہ نہیں کہ کثرتِ بحث و اختلاف میں پڑا رہے۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۱۰، ص ۳۰۸

[2] ابن القیم، اعلام الموقعین، ج ۱، ص ۵۱

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک حقیقی علم وہ ہے جو قرآن و سنت کی روشنی میں ہو، نہ کہ مناظرانہ اور متعصب طرزِ فکر پر مبنی۔ آپ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ علم اگر وحیِ الٰہی اور سنتِ نبوی سے جدا ہو جائے تو محض مناظرانہ عقل بن کر رہ جاتا ہے، جو دلوں کو جوڑنے کے بجائے تقسیم کرتا ہے۔ اسی طرح جب اساتذہ تعلیم کو شرعی مقاصد کے تابع رکھتے ہیں تو وہ نسلوں میں توازن، حلم، عدل اور رواداری کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ یوں علم تفرقے کے بجائے وحدتِ امت، اور تشدد کے بجائے رحمت کا وسیلہ بن جاتا ہے، جو انتہا پسندی کے خاتمے کا اصل ضامن ہے۔

اگر اساتذہ شاگردوں کی تربیت شرعی مقاصد کے مطابق نہ کریں تو علم اپنی اصل روح کھو بیٹھتا ہے۔ علم کا مقصد انسان کو ہدایت، عدل اور اخوت کی راہ پر لانا ہے، لیکن جب تربیت میں اخلاص اور دینی رہنمائی نہ ہو تو علم غرور، تفرقہ اور انتشار کا سبب بن جاتا ہے۔ ایسے شاگرد علم کو نفع کے بجائے مفاد کے لیے استعمال کرنے لگتے ہیں۔ اس لیے اساتذہ پر لازم ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ اخلاق و کردار کی تربیت بھی کریں۔ یہی تربیت علم کو روشنی اور امت کو اتحاد کی نعمت عطا کرتی ہے۔ امام الشاطبی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"المعلمينَ إذا لم يُربّوا المتعلمينَ على المقاصدِ الشرعيةِ ضلَّ علمُهم عن الهُدى، وأصبح سببَ فُرقةٍ لا وحدة."[1]

اگر معلمین (اساتذہ) شاگردوں کی تربیت شرعی مقاصد کے مطابق نہ کریں تو ان کا علم ہدایت سے بھٹک جاتا ہے اور اتحاد کے بجائے تفرقہ کا سبب بن جاتا ہے۔

امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق، اساتذہ کی ذمہ داری صرف علم منتقل کرنا نہیں بلکہ مقاصدِ شریعت کے مطابق فکری و اخلاقی تربیت کرنا ہے۔ جب تعلیم مقاصدِ شریعت سے منسلک ہو تو وہ اتحاد و اعتدال پیدا کرتی ہے، ورنہ افتراق اور شدت پسندی جنم لیتی ہے۔ اساتذہ کرام کسی بھی معاشرے کی فکری سمت طے کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اگر تعلیم و تربیت کا مرکز صرف معلومات کی منتقلی بن جائے اور مقاصدِ شریعت، اخلاقی تزکیہ اور فکری اعتدال کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہی علم انتہا پسندی، تفرقہ اور تکفیر کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ ان اقوال سے واضح ہوتا ہے کہ ائمہ کرام نے تعلیم و تربیت کو فکری اصلاح اور اعتدالِ فکر کا مرکز قرار دیا۔ جب اساتذہ علم کو اخلاق، حلم اور مقاصدِ شریعت کے ساتھ جوڑ کر پڑھائیں تو طلبہ میں فکری توازن پیدا ہوتا ہے اور انتہا پسندی کا خاتمہ ممکن ہوتا ہے۔

---

[1] الشاطبی، الموافقات، ج۱، ص۷۶

تعلیمی اداروں کا تربیتی کردار

انتہا پسندی کے خاتمے میں تعلیمی اداروں کا تربیتی کردار نہایت بنیادی اور فیصلہ کن ہے۔ یہ ادارے محض علم سکھانے کے مراکز نہیں بلکہ کردار سازی، فکری تربیت اور اخلاقی رہنمائی کے مراکز ہیں۔ اگر نصابِ تعلیم میں رواداری، برداشت، تنقیدی فکر اور مکالمے کی ثقافت کو فروغ دیا جائے تو طلبہ میں توازن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ تعلیمی اداروں کا ماحول ایسا ہونا چاہیے جہاں اختلاف کو دشمنی نہیں بلکہ فکری تنوع سمجھا جائے۔ اساتذہ اور انتظامیہ کو چاہیے کہ وہ طلبہ میں خدمتِ خلق، تعاون اور احترامِ انسانیت کے جذبات پیدا کریں۔ مدرسہ، اسکول، اور یونیورسٹی اگر علمی آزادی کے ساتھ فکری رہنمائی فراہم کریں تو نوجوانوں کے ذہن میں شدت پسندی کی جڑیں نہیں پکڑ تیں۔ نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ غیر نصابی تربیتی سرگرمیاں جیسے مباحثے، فکری سیمینارز، اور سماجی خدمت کے پروگرام طلبہ کو مثبت اظہارِ خیال کا موقع دیتے ہیں۔ ان اداروں میں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اخلاقی اصول، عدل، اور باہمی احترام کا درس دیا جائے تو فکری توازن اور ذہنی استحکام پیدا ہوتا ہے۔ تعلیمی ادارے نوجوانوں کو یہ شعور دیں کہ دین میں اعتدال، حکمت اور انصاف کی راہ ہی حقیقی کامیابی ہے۔ اسی تربیت کے ذریعے نسلِ نو میں امن، رواداری اور ذمہ داری کا احساس بیدار ہوتا ہے۔ یوں تعلیمی ادارے معاشرے کو انتہا پسندی کی فکری آفت سے محفوظ رکھنے میں سب سے مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں۔ مدارس و جامعات اگر علمِ نافع، تحقیق، اور رواداری کی فضا قائم کریں تو یہی نظام انتہا پسندی کے خاتمے کا سب سے مضبوط اسلامی ہتھیار بن جاتا ہے۔

نصابِ تعلیم میں فکری و اخلاقی اصلاحات

نصابِ تعلیم کسی بھی قوم کے فکری و اخلاقی رجحانات کو تشکیل دینے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر نصاب میں رواداری، تنقیدی سوچ اور مکالمے کی روح شامل ہو تو یہ طلبہ کو فکری تنگ نظری، تعصب اور انتہا پسندی سے محفوظ رکھتا ہے۔ رواداری انسان کو اختلافِ رائے برداشت کرنے، دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور انسانی وقار کے احترام کا شعور دیتی ہے۔ تنقیدی سوچ عقل و فہم کو جمود سے نکالتی ہے، اندھی تقلید کی بجائے دلیل اور تحقیق کی راہ دکھاتی ہے۔ مکالمہ باہمی احترام، برداشت اور حقیقت تک رسائی کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب طلبہ کو سیکھنے کے اس انداز سے گزارا جائے جہاں سوال کرنا، اختلاف ظاہر کرنا اور سننا سب تعلیم کا حصہ بن جائے، وہاں نفرت اور شدت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تاریخِ اسلامی میں یہی اوصاف اہلِ علم، فقہاء اور مفسرین کے درمیان علمی تنوع اور فکری وسعت کی بنیاد بنے۔ اگر نصابِ تعلیم میں یہ اصول شامل کیے جائیں تو طلبہ مذہب، معاشرہ اور انسانیت کے توازن کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ یوں تعلیم محض پیشہ ورانہ نہیں بلکہ اخلاقی و

فکری تربیت کا ذریعہ بنتی ہے، جو تشدد، تکفیر اور تعصب کی فضا کو ختم کر کے ایک معتدل، پر امن اور باہمی احترام پر مبنی معاشرہ تشکیل دیتی ہے۔

ائمہ و اہلِ علم کے اقوال پیش کیے جا رہے ہیں جو تعلیم، فہم، رواداری اور علمی تنوع کی بنیاد پر انتہا پسندی کے خاتمے کی راہ دکھاتے ہیں۔ ہر قول کے ساتھ مختصر وضاحت بھی درج ہے کہ وہ کس طرح نصابِ تعلیم میں رواداری، تنقیدی سوچ اور مکالمے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے۔

نصابِ تعلیم میں فکری و اخلاقی اصلاحات

نصابِ تعلیم کسی بھی قوم کے فکری و اخلاقی رجحانات کو تشکیل دینے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر نصاب میں رواداری، تنقیدی سوچ اور مکالمے کی روح شامل ہو تو یہ طلبہ کو فکری تنگ نظری، تعصب اور انتہا پسندی سے محفوظ رکھتا ہے۔ رواداری انسان کو اختلافِ رائے برداشت کرنے، دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے اور انسانی وقار کے احترام کا شعور دیتی ہے۔ تنقیدی سوچ عقل و فہم کو جمود سے نکالتی ہے، اندھی تقلید کی بجائے دلیل اور تحقیق کی راہ دکھاتی ہے۔ مکالمہ باہمی احترام، برداشت اور حقیقت تک رسائی کا بہترین ذریعہ ہے۔ جب طلبہ کو سیکھنے کے اس انداز سے گزارا جائے جہاں سوال کرنا، اختلاف ظاہر کرنا اور سننا سب تعلیم کا حصہ بن جائے، وہاں نفرت اور شدت کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ تاریخِ اسلامی میں یہی اوصاف اہلِ علم، فقہاء اور مفسرین کے درمیان علمی تنوع اور فکری وسعت کی بنیاد بنے۔ اگر نصابِ تعلیم میں یہ اصول شامل کیے جائیں تو طلبہ مذہب، معاشرہ اور انسانیت کے توازن کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ یوں تعلیم محض پیشہ ورانہ نہیں بلکہ اخلاقی و فکری تربیت کا ذریعہ بنتی ہے، جو تشدد، تکفیر اور تعصب کی فضا کو ختم کر کے ایک معتدل، پر امن اور باہمی احترام پر مبنی معاشرہ تشکیل دیتی ہے۔

ائمہ و اہلِ علم کے اقوال پیش کیے جا رہے ہیں جو تعلیم، فہم، رواداری اور علمی تنوع کی بنیاد پر انتہا پسندی کے خاتمے کی راہ دکھاتے ہیں۔ ہر قول کے ساتھ مختصر وضاحت بھی درج ہے کہ وہ کس طرح نصابِ تعلیم میں رواداری، تنقیدی سوچ اور مکالمے کی اہمیت کو واضح کرتا ہے، امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اپنی آراء کو قطعی و غیر متبدل حقائق نہیں سمجھتے تھے بلکہ انہیں ظنی و اجتہادی کوشش تصور کرتے تھے آپ کا قول ہے:

"هذا رأيي وهذا أحسن ما رأينا، فمن جاءنا بأحسنَ منه قبلناه" (1)

(1) خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ج۱۳، ص۳۶۸

یہ میری رائے ہے اور یہ ہمیں سب سے بہتر معلوم ہوئی، لیکن اگر کوئی بہتر بات لائے تو ہم اسے قبول کریں گے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول علمی مکالمے کی بنیاد ہے۔ اگر نصاب میں یہ رویہ پیدا ہو جائے تو نوجوان اپنی رائے پر اصرار کے بجائے دلیل اور سچائی کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ میری رائے وحی نہیں ہے، اگر کسی کے پاس زیادہ مضبوط دلیل ہو تو میں رجوع کروں گا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ امام کے نزدیک علم ایک کھلا میدان ہے، جہاں بحث و مکالمہ کے ذریعے حق واضح ہوتا ہے۔

اگر اساتذہ خود توازن، حلم اور فکری اعتدال کے حامل ہوں تو وہ طلبہ میں شدت پسندی کے بجائے بصیرت اور تحمل پیدا کرتے ہیں۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"إنَّ هذا العلمَ دينٌ، فانظروا عمّن تأخذون دينكم "[1]

یہ علم دراصل دین ہے، لہٰذا دیکھو تم اپنا دین کس سے حاصل کر رہے ہو۔

یہ قول اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ علمِ دین کوئی عام علم نہیں بلکہ ایمان و عمل کی بنیاد ہے۔ جب علم دراصل دین ہے تو اسے ایسے شخص سے حاصل کرنا ضروری ہے جو خود دیندار، باعمل اور معتبر ہو۔ اگر علم ایسے افراد سے لیا جائے جو خود گمراہی یا بد عملی میں مبتلا ہوں تو دین کی سمجھ بھی بگڑ جاتی ہے۔ اس لیے طالبِ علم پر لازم ہے کہ وہ اپنے استاد کے عقیدہ، کردار اور علم کی صحت پر نظر رکھے۔ صحیح عالم سے حاصل کیا گیا علم ہی انسان کو ہدایت، بصیرت اور تقویٰ عطا کرتا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ وضاحت کرتے ہیں:

"رأيي صوابٌ يحتملُ الخطأ، ورأي غيري خطأٌ يحتملُ الصوابَ."[2]

میری رائے درست ہے لیکن اس میں غلطی کا امکان موجود ہے، اور دوسرے کی رائے غلط ہو سکتی ہے مگر درست ہونے کا بھی امکان رکھتی ہے۔

امام شافعیؒ کا یہ قول فکری رواداری کی بنیاد ہے اور اختلاف کے احترام کی اعلیٰ مثال پیش کرتا ہے، جو نصابِ تعلیم میں مکالمے اور برداشت کی روح پیدا کرتا ہے۔ جب تعلیم میں اس سوچ کو شامل کیا جائے تو طلبہ میں اختلافِ رائے کو برداشت کرنے، دوسروں کی بات سننے اور حقیقت تک پہنچنے کا شعور پیدا ہوتا ہے۔ امام شافعیؒ کا یہ

[1] مقدمہ صحیح مسلم، رقم ۲۶

[2] البیہقی، مناقب الشافعی، ج ۱، ص ۴۶۹، ابن مفلح، الآداب الشرعیہ، ج ۱، ص ۱۸۶

طرزِ فکر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ علم کی بلندی، دل کی وسعت اور زبان کی نرمی کے ساتھ ہی ممکن ہے۔ اگر نصابِ تعلیم میں اختلافِ رائے کو اسی جذبے سے سکھایا جائے تو طلبہ میں تعصب، تکفیر اور انتہا پسندی کے بجائے برداشت، احترام اور علمی وسعت پیدا ہوگی۔ یہی رواداری فکری ہم آہنگی، باہمی اعتماد اور سماجی استحکام کی بنیاد بنتی ہے، جو ایک پُرامن معاشرے کے قیام کے لیے ناگزیر ہے۔

علم کا حقیقی مقصد محض معلومات کا ذخیرہ جمع کرنا یا بحث و مباحثہ میں مہارت حاصل کرنا نہیں، بلکہ انسان کے باطن کو سنوارنا اور اس کے نفس کی اصلاح کرنا ہے۔ نافع علم وہ ہے جو انسان کے کردار، عمل اور اخلاق میں مثبت تبدیلی پیدا کرے۔ جب علم انسان کو عاجزی، تقویٰ اور خیر کی راہ دکھاتا ہے تو وہ اس کے لیے نجات اور ہدایت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ علم کی اصل روح یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ایمان، فکر میں بصیرت، اور عمل میں اخلاص پیدا کرے۔ یہی علم انسان کو غرور، تعصب اور نفرت سے بچا کر حلم، عدل اور رحمت کے راستے پر گامزن کرتا ہے۔ اسی لیے علم کو عبادت کہا گیا ہے، کیونکہ اس کا مقصد صرف ذہنی ترقی نہیں بلکہ روحانی پاکیزگی اور اخلاقی اصلاح ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"ليسَ المقصودُ من العلمِ مجرّدَ الحفظِ والمجادلةِ، بل تهذيبُ النفسِ وتزكيتُها بالمعارفِ النافعةِ."[1]

علم کا مقصد صرف یاد کر لینا یا بحث و مباحثہ کرنا نہیں، بلکہ نفس کی تہذیب اور اس کی اصلاح نافع علم کے ذریعے کرنا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق تعلیم کا مقصد صرف علمی بحث نہیں بلکہ کردار کی اصلاح اور نفس کی تہذیب ہے۔ جب نصاب میں یہ روح شامل ہو تو علمی اختلاف رواداری میں ڈھل جاتا ہے، شدت پسندی نہیں پیدا کرتا۔

آپ مزید بیان کرتے ہیں:

"العلم بلا عمل جنون، والعمل بلا علم لا يكون "[2]

علم اگر عمل کے بغیر ہو تو وہ جنون ہے، اور عمل اگر علم کے بغیر ہو تو وہ وجود ہی نہیں رکھتا۔ امام غزالی کے نزدیک حقیقی علم وہی ہے جو اخلاق، کردار اور عدل پیدا کرے۔ ایسا نصاب جو صرف معلومات دے مگر تربیت نہ کرے، انتہا پسندی کو جنم دیتا ہے۔

---

[1] إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۵۴

[2] الغزالی، إحیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۵۷

جب نصابِ تعلیم میں عدل، انصاف اور توازن کی تربیت شامل کی جاتی ہے تو یہ طلبہ کے ذہنوں اور کردار میں اعتدال پیدا کرتی ہے۔ ایسی تعلیم انسان کو حق گوئی، مساوات اور احترامِ انسانیت کا سبق دیتی ہے۔ جب نئی نسل ان اصولوں پر پروان چڑھتی ہے تو معاشرے سے شدت، تعصب اور ظلم خود بخود مٹنے لگتے ہیں۔

انصاف پر مبنی تعلیم افراد کو ایک دوسرے کا حق پہچاننے اور برداشت کا رویہ اپنانے کی ترغیب دیتی ہے۔ یوں نصابِ تعلیم امن، اتحاد اور اجتماعی فلاح کی مضبوط بنیاد بن جاتا ہے، کیونکہ جب لوگ باہمی احترام، عدل اور انصاف کی تعلیم حاصل کرتے ہیں تو سماجی ہم آہنگی، بھائی چارہ اور فکری اعتدال قائم رہتا ہے۔ یہ تعلیم نہ صرف فرد کی اصلاح کا ذریعہ ہے بلکہ پورے معاشرے کو انتہا پسندی، ظلم اور تعصب سے محفوظ رکھنے کا سب سے مؤثر ہتھیار بھی بنتی ہے۔۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

"العدل نظام كل شيء، فمن خرج عن العدل فقد خرج عن الشريعة " [1]

عدل ہر چیز کا نظام ہے، اور جو عدل سے نکل گیا وہ شریعت سے باہر ہو گیا۔

جب نصابِ تعلیم میں عدل، انصاف اور توازن کی تربیت شامل ہو تو وہ شدت، تعصب اور ظلم کی بنیادوں کو ختم کرتا ہے۔

اسی طرح جب کوئی شخص علم کے بغیر بات کرتا ہے تو اس کی گفتگو میں جہالت، غلط فہمی اور گمراہی پیدا ہو جاتی ہے، جو معاشرے میں فساد اور اشتعال کا سبب بنتی ہے۔ علم انسان کو سمجھ، تحمل اور انصاف سکھاتا ہے، جس سے وہ دوسروں کے حقوق، جذبات اور احساسات کا خیال رکھتا ہے۔

بغیر علم کے گفتگو نہ صرف اختلافات کو بڑھاتی ہے بلکہ تعصب، نفرت اور دشمنی کے بیج بوتی ہے، جبکہ علم پر مبنی باتیں دلوں کو جوڑتی ہیں اور افہام و تفہیم کو فروغ دیتی ہیں۔ علم انسانوں کے درمیان رحمت، ہدایت اور یکجہتی کا ذریعہ بنتا ہے اور اسے امن، بھلائی اور اجتماعی فلاح کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے، کیونکہ یہی علم معاشرتی سکون، فکری اعتدال اور اخلاقی استحکام کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"من تكلّم في الناسِ بلا علمٍ كان ما يفسدُ أكثرَ مما يُصلحُ، وإنَّ العلمَ رحمةٌ بين الخلقِ."[2]

علم کے بغیر بات کرنا فساد کا باعث بنتا ہے، جبکہ علم انسانوں کے درمیان رحمت ہے۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۱۴۶

[2] ایضاً، ج ۱۳، ص ۲۴۷

نصاب میں علمی مکالمے اور درست تنقیدی سوچ کی تربیت اسی رحمت کو عام کر کے انتہا پسندی کے اسباب ختم کرتی ہے۔

جو شخص حقیقی علم کا طالب ہے، اسے پہلے علم کے آداب سیکھنا ضروری ہیں، کیونکہ یہی آداب علم کی اصل روح اور بنیادی قوت ہیں۔ علم کے آداب میں عاجزی، استاد کا احترام، صبر، تحمل اور خلوص شامل ہیں، جو طالبِ علم کو درست سمت میں رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

بغیر آداب کے حاصل کیا گیا علم غرور، تکبر یا غلط فہمی کا سبب بن سکتا ہے، جبکہ آداب کی پیروی سے علم انسان کے دل و دماغ میں سکون، بصیرت اور عمل کی قوت پیدا کرتا ہے۔ یوں علم نہ صرف معلومات کا ذخیرہ بلکہ کردار، اخلاق اور روح کی روشنی بھی بن جاتا ہے، جو انسان کو نہ صرف علمی بلکہ عملی اور اخلاقی طور پر بھی نکھارتا ہے۔ اس حوالے سے امام ابن القیم رحمہ اللہ کا قول ہے:

"من أراد العلم الحقيقي فليتأدب أولاً بآداب العلم، فإنها روح العلم "[1]

جو شخص حقیقی علم کا خواہش مند ہے، وہ پہلے علم کے آداب سیکھے، کیونکہ یہی علم کی روح ہیں۔ نصابِ تعلیم میں اگر آدابِ علم یعنی برداشت، احترام اور حسنِ نیت شامل ہوں، تو طلبہ کے دلوں سے تکفیر اور نفرت کا مادہ ختم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح عدل علم اور دین کی بنیاد ہے، کیونکہ اس کے بغیر علم اور عبادت اپنے اصل مقصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ عدل انسان کے دل کو درست سمت میں ڈالتا ہے اور اس کے افعال میں توازن پیدا کرتا ہے، جس سے نفسانی خواہشات، لالچ اور خودغرضی کمزور پڑ جاتے ہیں۔ جب دل اور دماغ میں انصاف اور توازن راسخ ہو جاتے ہیں تو انسان حق و باطل، نیکی و برائی میں فرق کر سکتا ہے اور اپنے اعمال میں اعتدال قائم رکھتا ہے۔ عدل نہ صرف فرد کے کردار کو مضبوط اور مستحکم بناتا ہے بلکہ معاشرت میں امن، بھائی چارہ اور اجتماعی ہم آہنگی بھی پیدا کرتا ہے۔ اس کے ذریعے ہر شخص دوسروں کے حقوق کا احترام سیکھتا ہے اور جھوٹ، ظلم یا استحصال سے بچتا ہے۔ یوں عدل علم کی حقیقی قدر کو سمجھنے، دین کی تعلیمات پر عمل کرنے اور معاشرے میں فکری و عملی اعتدال قائم رکھنے کا سب سے مؤثر ذریعہ بنتا ہے۔ یہی وہ اصول ہے جو فرد و معاشرہ دونوں کو درست راہ پر گامزن کرتا ہے اور انتہا پسندی، تعصب اور ظلم کے ہر بیج کو جڑ سے ختم کرتا ہے۔ امام ابن القیم رحمہ اللہ بیان کرتے ہیں:

---

[1] ابن القیم، مفتاح دار السعادۃ، ج ۱، ص ۸۴

"العدلُ أساسُ العلمِ والدينِ، وبهِ تصلحُ القلوبُ وتزولُ الأهواءُ."[1]

عدل علم اور دین کی بنیاد ہے، اسی کے ذریعے دل درست ہوتے ہیں اور نفسانی خواہشات ختم ہو جاتی ہیں۔

علم و دین کی بنیاد عدل ہے، اور عدل کے بغیر علم گمراہی کا باعث بن سکتا ہے۔ نصاب میں عدل اور اعتدال کی تعلیم ہی طلبہ کو فکری افراط و تفریط سے محفوظ رکھتی ہے۔

شریعت کا بنیادی مقصد انسان کو اپنی نفسانی خواہشات کے تحت زندگی گزارنے سے روکنا اور اسے اللہ کے احکام کے مطابق باشعور اور بااختیار بنانا ہے۔ یہ انسان کو محض خوف یا مجبوری کی بنیاد پر نہیں بلکہ عقل، شعور اور اختیار کے ساتھ اللہ کا بندہ بننے کی تربیت دیتی ہے، تاکہ اس کا عمل دل سے نکل کر زندگی کا حصہ بن جائے۔

جب انسان شریعت کے اصولوں کے مطابق زندگی گزارتا ہے تو وہ اپنے اعمال میں رضامندی، اختیار اور احتساب کو شامل کرتا ہے، جس سے عبادت، اخلاق اور اطاعت نہ صرف رسمی بلکہ حقیقی معنوں میں عمل کا حصہ بن جاتی ہیں۔ اس طرح انسان اپنے نفس پر قابو پاتا ہے، خود کو فکری و عملی توازن کی راہ پر قائم رکھتا ہے اور اللہ کی رضا اور حقیقی تقویٰ حاصل کرتا ہے۔ یہی شریعت کا مقصد ہے کہ انسان کو نیکی، عدل اور اخلاق کی راہ پر رہنمائی فراہم کرے اور اسے غفلت، انتہا پسندی اور نفسانی خواہشات کی غلامی سے آزاد کرے۔ اس حوالے سے امام الشاطبی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

"المقصدُ من الشريعةِ إخراجُ المكلّفِ عن داعيةِ هواهُ حتى يكونَ عبدًا للهِ اختيارًا كما هو عبدٌ للهِ اضطرارًا."[2]

شریعت کا مقصد یہ ہے کہ مکلف (ذمہ دار انسان) کو اس کی نفسانی خواہشات کے تابع ہونے سے نکالا جائے، تاکہ وہ اللہ کا بندہ اپنی مرضی اور اختیار سے بن جائے، جیسے وہ مجبوری کے عالم میں اللہ کا بندہ ہے۔

شریعت کا مقصد انسان کو خواہش پرستی سے نکال کر فکری توازن عطا کرنا ہے۔ یہی اصول اگر تعلیم و تربیت میں شامل ہوں تو غلو اور شدت کی بنیاد خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔

امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے علم کی دو قسمیں بیان کی ہیں: زبان کا علم اور دل کا علم۔ زبان کا علم انسان کو بات کرنے، سمجھانے اور دوسروں کے لیے دلیل پیش کرنے کی صلاحیت دیتا ہے، اور اس کے ذریعے اللہ نے

---

[1] ابن القیم، مدارج السالکین، ج۱، ص۸۷

[2] الشاطبی، الموافقات، ج۲، ص۳۰۲

انسان پر حجت قائم کی ہے۔ دل کا علم وہ ہے جو انسان کے باطن کو سنوارے، اسے نیکی کی طرف راغب کرے اور اعمال میں اصلاح پیدا کرے۔ صرف زبان کا علم بغیر دل کی بصیرت کے بے فائدہ اور کبھی کبھی نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ حقیقی نفع دل کے علم سے حاصل ہوتا ہے، کیونکہ یہ انسان کو ہدایت، تقویٰ اور عمل صالح کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ آپ کا قول ہے:

"العلمُ علمانِ: علمُ اللسانِ فذاك حجّةُ الله على ابنِ آدم، وعلمُ القلبِ فذاك النافعُ."[(1)]

علم دو قسم کا ہے: زبان کا علم، جو انسان پر اللہ کی حجت ہے، اور دل کا علم، جو حقیقی طور پر نفع دینے والا ہے۔

حقیقی علم وہ ہے جو دل کو نرم کرے اور کردار میں تبدیلی لائے۔ نصاب میں اخلاقی تعلیم شامل ہو تو یہ نرم دلی شدت پسندی کی نفی کرتی ہے۔

نصابِ تعلیم میں رواداری، تنقیدی سوچ اور مکالمے کی اہمیت دراصل اسلامی فکری نظام کی بنیاد ہیں، کیونکہ اسلام نے علم کو اختلاف اور انتشار کا ذریعہ نہیں بلکہ اتحاد و فلاح کے لیے راستہ قرار دیا ہے۔ جب نصاب طلبہ میں فکر، تدبر، اور اخلاقی شعور پیدا کرتا ہے تو وہ علم کو محض معلومات کے حصول یا جھگڑے کے لیے نہیں بلکہ اصلاحِ ذات اور خدمتِ خلق کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ نصاب میں اخلاق، عدل، اور شریعت کی سمجھ شامل ہو تو طلبہ میں وہ شعور پیدا ہوتا ہے جو غلو، تعصب اور شدت پسندی کو کمزور کرتا ہے۔ علم اگر حکمت، مکالمے اور تدبر کے ساتھ جڑا ہو تو دلوں کو نرمی اور ذہنوں کو روشنی ملتی ہے، جبکہ عدل اور بصیرت سے خالی علم فتنہ، فساد اور جھگڑے کا سبب بن سکتا ہے۔ اس لیے اختلافِ رائے کے آداب، دلیل کی اہمیت، اور برداشت کی تربیت نصاب میں لازمی ہیں، تاکہ نوجوان تعصب اور تنگ نظری سے محفوظ رہیں۔

امام شافعی کا اصول کہ "میری رائے درست ہے مگر خطا کا احتمال رکھتی ہے" نصاب میں علمی مکالمے اور رواداری کی وہ بنیاد فراہم کرتا ہے جو معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دیتی ہے۔ جب نصاب صرف معلومات دینے تک محدود نہ رہے بلکہ کردار سازی، اخلاقی تربیت اور فکری اعتدال بھی شامل کرے تو یہ طلبہ کو نہ صرف علم کے ساتھ بلکہ عمل اور اخلاق کے لحاظ سے بھی متوازن بناتا ہے۔ نصاب میں عدل، رواداری، حلم اور اخلاق کی تعلیم شامل کرنے سے معاشرہ اختلافات کو فساد کی بجائے رحمت کے طور پر دیکھتا ہے۔ نتیجتاً ایسا تعلیمی نظام نوجوانوں کو

[(1)] ابن عبد البر، جامع بیان العلم، ج ا، ص ۸۵

جنونیت اور شدت پسندی سے محفوظ رکھتا ہے اور انہیں فکری اعتدال، مکالمے اور انسانی وحدت کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

نصابِ تعلیم میں فکری و اخلاقی اصلاحات انتہا پسندی کے خاتمے اور معاشرتی توازن قائم رکھنے کے لیے نہایت اہم ہیں۔ تعلیم صرف معلومات کی منتقلی نہیں بلکہ کردار، سوچ اور رویے کی تربیت بھی فراہم کرتی ہے۔ نصاب میں برداشت، مکالمہ، تنقیدی سوچ اور انسانی وقار جیسے اصول شامل ہونے سے طلبہ میں فکری وسعت اور اخلاقی توازن پیدا ہوتا ہے۔ ائمہ کرام نے ہمیشہ علم کو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کے ساتھ جوڑ کر پیش کیا، تاکہ تعلیم نہ صرف علمی بلکہ عملی اور اخلاقی بھی ہو۔

یہ تصور واضح کرتا ہے کہ نصاب میں علمی تربیت کے ساتھ عملی اور اخلاقی تربیت کا امتزاج لازمی ہے۔ نصاب کو عدل، توازن اور فہمِ شریعت پر مبنی ہونا چاہیے، تاکہ طلبہ اختلافِ رائے کا ادب، دلیل کی بنیاد پر سوچ اور اخلاقی فضائل سیکھیں اور شدت پسندی سے محفوظ رہیں۔ تعلیمی اداروں کو نصاب کو صرف پیشہ ورانہ مہارت تک محدود نہ رکھنے بلکہ اخلاقی بصیرت کا بھی سرچشمہ بنانا چاہیے، تاکہ نسلِ نو میں علم اور کردار دونوں کی روشنی پروان چڑھے۔ اسی اصلاح شدہ نصاب کے ذریعے فکری انحراف کو اعتدال میں بدلا جا سکتا ہے اور انتہا پسندی کے سدّباب کا مؤثر ذریعہ قائم ہوتا ہے۔۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

" العلمُ بلا عملٍ جنونٌ، والعملُ بلا علمٍ لا يكونُ."[1]

بغیر عمل کے علم دیوانگی ہے، اور بغیر علم کے عمل ممکن ہی نہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول میں تعلیم و تربیت کا بنیادی مقصد واضح کیا گیا ہے۔ ان کے نزدیک علم اس وقت حقیقی فائدہ مند ہوتا ہے جب وہ انسان کے کردار، عمل اور اخلاق میں مثبت تبدیلی لائے۔ اگر علم انسان کو اصلاح، عدل اور خیر کی طرف نہ لے جائے تو یہ محض دعوے یا معلومات تک محدود رہ جاتا ہے، اور اگر عمل علم کے بغیر ہو تو وہ گمراہی اور فساد کا سبب بن سکتا ہے۔ اس اصول کے مطابق تعلیمی اداروں اور نصابِ تعلیم میں صرف معلومات کی منتقلی کافی نہیں، بلکہ اخلاقی، عملی اور فکری تربیت کو بھی مرکزی حیثیت دی جانی چاہیے، تاکہ علم انسان کو اعتدال، توازن اور عمل صالح کی راہ دکھا سکے۔ یہی نقطہ نظر تعلیم کو انتہا پسندی سے بچانے اور معاشرے میں فکری و عملی اعتدال قائم رکھنے کا اصل ذریعہ بناتا ہے۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے علم اور عدل کے باہمی تعلق کو نہایت جامع انداز میں بیان فرمایا ہے۔

---

[1] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج۱، ص۵۵

"العلمُ لا يتمُّ إلا بالعدلِ، والعدلُ لا يتمُّ إلا بالعلمِ، فالعلمُ والعدلُ قرينانِ، وضدُّهما الجهلُ والظلمُ" [1]

علم عدل کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، اور عدل علم کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا؛ لہٰذا علم اور عدل دونوں لازم و ملزوم ہیں، جبکہ ان کی ضد جہالت اور ظلم ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول سے واضح ہوتا ہے کہ علم کی تکمیل اور افادیت صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ عدل، انصاف اور توازن کے اصولوں پر مبنی ہو۔ ایسا علم جو حق پسندی، اعتدال اور انصاف سے خالی ہو، انسان کو نہ صرف گمراہی بلکہ انتہا پسندی کی جانب بھی لے جا سکتا ہے۔ اسی طرح عدل بھی اس وقت حقیقی اثر رکھتا ہے جب وہ علم کی روشنی میں ہو، ورنہ جہالت اور نفسانی خواہشات ظلم اور تعصب کو فروغ دیتی ہیں۔ ان کی رہنمائی تعلیمی اداروں کے لیے یہ ہے کہ علم کی تدریس محض معلوماتی نہ ہو بلکہ اس میں عدل، فکری توازن اور اخلاقی بصیرت کو شامل کیا جائے، تاکہ علم معاشرت میں امن، برداشت اور اعتدال کا سبب بنے، نہ کہ انتہا پسندی کا۔

منتظمین مدارس کو چاہیے کہ نصاب میں ایسے مضامین شامل کریں جو فہمِ قرآن، سیرتِ نبوی اور عصری علوم کے امتزاج کو فروغ دیں، تاکہ دینی تعلیم عملی بصیرت اور فکری تنوع کے ساتھ جڑی رہے۔ انتہا پسندانہ سوچ کے خاتمے کے لیے نصاب میں رواداری، برداشت، مکالمہ، اور خدمتِ انسانیت کے اصول لازمی طور پر شامل کیے جائیں۔ جامعات کو بھی چاہیے کہ وہ تحقیق، تنقیدی سوچ اور علمی آزادی کو نصاب میں شامل کریں تاکہ طلبہ صرف تقلیدی نہیں بلکہ تجزیاتی اور فکری شعور کے حامل بنی

جب نصابِ تعلیم میں رواداری، عدل، اخلاقی تربیت اور علمی مکالمے کو بنیاد بنایا جائے تو فکری جمود، غلو اور شدت پسندی خود بخود کمزور پڑ جاتے ہیں۔ اس طرح تعلیم نہ صرف فرد کی شخصیت سازی بلکہ معاشرتی ہم آہنگی اور فکری اعتدال کا سب سے مضبوط ذریعہ بنتی ہے، اور علمی مکالمے کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ یہ حقیقت واضح ہے کہ تعلیم جب علم، عدل، اخلاق اور رواداری پر مبنی ہو تو یہ ذہنوں کو متوازن اور تنقیدی بناتی ہے، دلوں میں رحم و شفقت پیدا کرتی ہے، اختلاف کو برداشت سکھاتی ہے، اور یوں انتہا پسندی کے فکری و نفسیاتی اسباب کو جڑ سے ختم کرتی ہے۔

---

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۱۱، ص۹۷

فصل چہارم
اسلامی معاشرتی نظام اور عملی اقدامات

فصل چہارم

اسلامی معاشرتی نظام اور عملی اقدامات

یہ بیان اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ ریاست، علما اور سماج کا باہمی کردار ایک متوازن، پرامن اور مستحکم معاشرے کی تشکیل کے لیے بنیادی ستون ہے۔ ریاست جب عدل، مساوات اور قانون کی عملداری قائم کرتی ہے تو معاشرتی استحکام پیدا ہوتا ہے، جبکہ علما دین کی صحیح تعبیر، اخلاقی رہنمائی اور فکری اعتدال کے ذریعے عوام کو روشن ضمیر اور متوازن سوچ عطا کرتے ہیں۔ سماج اس مثلث کا تیسرا ستون ہے جو ریاستی نظم اور دینی رہنمائی کو عملی صورت دیتا ہے اور اخلاقی اقدار کو روزمرہ زندگی میں نافذ کرتا ہے۔ جیسا کہ کہا گیا، "دین بنیاد ہے اور حکومت اس کی محافظ، بنیاد کے بغیر عمارت گر جاتی ہے اور محافظ کے بغیر وہ ضائع ہو جاتی ہے۔" اس قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست اور مذہبی قیادت ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتے؛ علما جب اصلاحِ فکر اور امت کی اعتدال کی ذمہ داری سنبھالتے ہیں تو وہ انتہا پسندی کے خلاف ایک مضبوط فکری ڈھال بن جاتے ہیں، اور سماج جب ان کے ساتھ تعاون کرتا ہے تو اجتماعی شعور، اخلاقی قوت اور معاشرتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس باہمی توازن کے بغیر نہ ریاست کی قوت برقرار رہ سکتی ہے اور نہ دین کی حقیقی سچائی نمایاں ہو سکتی ہے۔ لہٰذا انتہا پسندی کے خاتمے اور پائیدار امن کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ ریاست منصفانہ اور معتدل پالیسیاں بنائے، علما اعتدال اور رواداری پر مبنی تعلیمات عام کریں، اور سماج مثبت اخلاقی اقدار کو فروغ دے۔ یہی ہم آہنگی امت کی اصلاح، فکری توازن اور اجتماعی سکون کی ضمانت ہے

معلوم ہوا کہ ریاست (حکومت)، علماء (دینی قیادت) اور عوام (سماج) مل کر دین و معاشرے کے نظام کو اعتدال، اصلاح اور امن کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ ذیل میں ائمہ کے اقوال درج کیے جارہے ہیں جو اس موضوع کی فکری بنیاد فراہم کرتے ہیں:

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (ت ۷۲۸ھ) اس امر کی وضاحت کرتے ہیں:

"الدينُ والملكُ توأمانِ، فالدينُ أصلٌ والملكُ حارسٌ، فما لا أصلَ له فمهدومٌ، وما لا حارسَ له فضائعٌ."[1]

[1] ابن تیمیہ، مجموع الفتاوی، ج۲۸، ص۳۹۱

دین اور حکومت جڑواں ہیں؛ دین بنیاد ہے اور حکومت اس کی محافظ، جس کی بنیاد نہ ہو وہ منہدم ہو جاتا ہے، اور جس کا محافظ نہ ہو وہ ضائع ہو جاتا ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے واضح فرمایا کہ ریاست اور دین کا تعلق باہمی تعاون و توازن کا ہے۔ ریاست عدل و نظام قائم رکھتی ہے، جبکہ علما دین کی صحیح تعبیر سے اس نظام کی فکری و اخلاقی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔

امام ماوردی رحمہ اللہ کے نزدیک ریاست اور دین الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے کے تکملہ ہیں۔ جب ریاست دینی بنیاد پر عدل و اصلاح قائم کرے اور علما اس میں رہنمائی فراہم کریں تو معاشرہ امن و اعتدال کی راہ پر گامزن ہوتا ہے۔ امام ماوردی رحمہ اللہ (ت ۴۵۰ھ) لکھتے ہیں:

"الإمامةُ موضوعةٌ لخلافةِ النبوةِ في حراسةِ الدينِ وسياسةِ الدنيا."[1]

امامت (ریاست) نبوت کی خلافت ہے، جس کا مقصد دین کی حفاظت اور دنیا کے نظم و نسق کو سنبھالنا ہے۔

امامت یعنی ریاست دراصل نبوت کی خلافت کا تسلسل ہے، جس کا بنیادی مقصد دین کی حفاظت اور معاشرے میں نظم و نسق قائم رکھنا ہے۔ امام یا حکمران کی ذمہ داری ہے کہ وہ عدل، انصاف اور شریعت کے مطابق عوام کی رہنمائی کرے تاکہ نہ صرف دینی اصولوں کی پاسداری ہو بلکہ معاشرتی، اخلاقی اور اقتصادی نظام بھی مستحکم رہے۔ امامت صرف اقتدار کے لیے نہیں بلکہ انسانیت کی بھلائی، معاشرت میں امن و سکون اور فلاح عامہ کے لیے ہے۔ اس کے ذریعے ریاست دین اور دنیا دونوں میں توازن پیدا کرتی ہے اور عوام کی رہنمائی کے لیے عملی اور فکری راہ فراہم کرتی ہے۔

دین کسی بھی معاشرے کی بنیاد ہے کیونکہ اسی پر اخلاق، عدل، قانون اور معاشرتی نظام قائم ہوتا ہے۔ حکومت اس بنیاد کی محافظ ہے جو دین کے اصولوں کے نفاذ اور عمل درآمد کو یقینی بناتی ہے۔ اگر بنیاد یعنی دین موجود نہ ہو تو معاشرتی عمارت کمزور ہو کر گر جاتی ہے، اور اگر محافظ یعنی حکومت نہ ہو تو دین اپنی اصل روح اور اثرات کھو دیتا ہے۔ اس لیے دین اور حکومت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، تاکہ معاشرہ مضبوط، مستحکم اور منظم رہے۔ یہ باہمی تعلق معاشرتی اصلاح، فکری توازن اور قومی اتحاد کی ضمانت فراہم کرتا ہے، اور انتہاپسندی و خلفشار کے امکانات کو کم کرتا ہے۔ اس حوالے سے امام غزالی رحمہ اللہ (ت ۵۰۵ھ) لکھتے ہیں:

"الدينُ أساسٌ، والسلطانُ حارسٌ، وما لا أساسَ له فمهدومٌ، وما لا حارسَ له فضائعٌ."[2]

---

[1] الماوردی، الأحکام السلطانیہ، ص ۵

دین بنیاد ہے اور حکومت اس کی محافظ؛ بنیاد کے بغیر عمارت گر جاتی ہے، اور محافظ کے بغیر وہ ضائع ہو جاتی ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ریاست اور دین کے تعلق کو باہمی انحصار کے رشتے کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک علما دین کی فکری حفاظت کرتے ہیں اور ریاست اس کے عملی نفاذ کی ضمانت ہوتی ہے، تاکہ معاشرہ دین و دنیا دونوں میں توازن کے ساتھ چل سکے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کے مطابق، عدل کرنے والی حکومت قائم رہتی ہے چاہے اس کے حکمران کافر ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ عدل کی بنیاد پر معاشرت میں امن، انصاف اور توازن قائم ہوتا ہے اور لوگ محفوظ و مطمئن رہتے ہیں۔

اس کے برعکس، ظالم اور ناانصافی کرنے والی حکومت، چاہے اس کے حکمران مسلمان ہوں، طویل عرصے تک قائم نہیں رہتی کیونکہ اس میں فساد، خوف اور استبداد پھیل جاتے ہیں۔ عدل حکومت کی بقاء کی شرط ہے اور ظلم اس کے زوال کا سبب بنتا ہے۔ اس طرح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت عدل اور انصاف کی حمایت کرتی ہے، اور فکری و عملی اصلاح کے لیے ریاست کی ذمہ داری اور اس کی قیام کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ (ت ۷۵۱ھ) بیان کرتے ہیں:

"إنَّ اللهَ يُقيمُ الدولةَ العادلةَ وإن كانت كافرةً، ولا يُقيمُ الظالمةَ وإن كانت مسلمةً."[1]

اللہ تعالیٰ عادل حکومت کو قائم رکھتا ہے اگرچہ وہ کافر ہو، اور ظالم حکومت کو نہیں رکھتا اگرچہ وہ مسلمان ہو۔

امام ابن القیم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ریاست کی بقا کا دار و مدار عدل پر ہے، اور علما کا کردار یہ ہے کہ وہ ریاست کو عدل، اصلاح اور اخلاق کی سمت رہنمائی دیں۔ یہی اصول معاشرتی سلامتی اور استحکام کی بنیاد ہے۔

اسلام ایک ہمہ گیر نظام ہے جو زندگی کے ہر پہلو کو اپنی روشنی میں ڈھالتا ہے۔ یہ نظام صرف عبادات یا اخلاق تک محدود نہیں بلکہ ریاست، قانون، معاشرت اور قومیت کے اصول بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلام فرد کی تربیت کے ساتھ ساتھ اجتماعی نظم و نسق اور معاشرتی قوت کا انتظام بھی کرتا ہے۔ اس کے ذریعے انسان نہ صرف ذاتی تقویٰ اور اخلاقی بلندی حاصل کرتا ہے بلکہ معاشرت میں عدل، اتحاد اور امن قائم رہتا ہے۔

---

[2] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج ۱، ص ۹۳

[1] ابن القیم، الطرق الحکمیہ فی السیاسہ الشرعیہ، ص ۱۰

یوں اسلام ایک مکمل رہنمائی کا نظام ہے جو ہر زمانے اور ہر شعبے کے لیے جامع حل پیش کرتا ہے، اور ریاست و علما کے تعاون سے معاشرے کو فکری، اخلاقی اور عملی استحکام فراہم کرتا ہے۔ امام حسن البناؒ (ت ۱۹۴۹ء) بیان کرتے ہیں:

"الإسلامُ نظامٌ شاملٌ يتناولُ مظاهرَ الحياةِ جميعًا، فهو دولةٌ ووطنٌ، وحكومةٌ وأمةٌ، وأخلاقٌ وقوةٌ."[1]

اسلام ایک ہمہ گیر نظام ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے؛ یہ ریاست بھی ہے، قوم بھی، اخلاق بھی، اور قوت بھی۔

یہ قول جدید دور میں ریاست، علما، اور سماج کے باہمی کردار کو واضح کرتا ہے کہ سب کو مل کر اسلام کے جامع نظام کو عدل، امن، اور اصلاح کی بنیاد پر قائم کرنا چاہیے۔ ائمہ کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست دین کی محافظ اور نظامِ عدل کی ضامن ہے، علما فکری و اخلاقی رہنمائی کے ذریعے عوام کو اعتدال پر قائم رکھتے ہیں، اور سماج ان دونوں کے اثر سے ایک صالح اور متوازن معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ یہی باہمی توازن انتہا پسندی کے خاتمے اور پائیدار امن کے قیام کی اصل بنیاد ہے۔

اسلامی نظامِ فکر میں ریاست، علما اور سماج تین بنیادی ستون ہیں جن کے باہمی تعاون اور توازن سے ایک عادل، معتدل اور صالح معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ ریاست نبوت کی خلافت ہے جو دین کی حفاظت اور دنیا کے نظم کی ضامن ہے، دین بنیاد ہے اور حکومت محافظ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست و دین کا رشتہ باہمی تکمیل کا حامل ہے، جس میں علما فکری و اخلاقی سمت متعین کرتے ہیں جبکہ ریاست عدل و نظم کو برقرار رکھتی ہے۔ دین و سلطنت جڑواں بھائی ہیں، اور ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں۔ اس باہمی تعلق میں سماج کا کردار اطاعت، تعاون اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعے نمایاں ہوتا ہے۔

لہٰذا علما کی ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کو عدل، شریعت اور اخلاقی اصولوں کی طرف رہنمائی فراہم کریں، جبکہ ریاست ان اصولوں کو نافذ کر کے عوام کے لیے امن اور استحکام کو یقینی بنائے۔ جب یہ تین عناصر یعنی ریاست، علما اور سماج، ہم آہنگی اور اعتدال کے ساتھ عمل کرتے ہیں تو معاشرے میں انتہا پسندی، ظلم اور فکری انحراف کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ یہی اسلامی نظامِ عدل و اصلاح کی حقیقی تعبیر ہے۔

---

[1] حسن البنا، رسائل الإمام حسن البنا، المکتبۃ التوفیقیۃ، ۱۹۸۴ص ۱۱۰

دعوت، اصلاحِ معاشرہ اور بین المذاہب مکالمے کی اہمیت

اسلام میں دعوت، اصلاحِ معاشرہ اور بین المذاہب مکالمہ ایک متوازن، پر امن اور عادلانہ معاشرے کی تشکیل میں بنیادی ذرائع ہیں۔ دعوت کا مقصد انسان کو خیر، انصاف اور ہدایت کی طرف بلانا ہے، نہ کہ تصادم یا نفرت کو فروغ دینا۔ معاشرتی اصلاح اس وقت ممکن ہوتی ہے جب افراد کے دلوں میں ایمان، اخلاق اور اخوت کے جذبات پروان چڑھیں۔ اسلام نے انسانیت کی بھلائی اور فلاح کو مرکزی حیثیت دی ہے، اس لیے معاشرے میں عدل، احترامِ انسانیت اور باہمی تعاون کو فروغ دینا ضروری ہے۔

بین المذاہب مکالمہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو مختلف عقائد رکھنے والے افراد کے درمیان سمجھ بوجھ، رواداری اور تحمل پیدا کرتا ہے۔ جب مختلف مذاہب و طبقات کے لوگ باہمی گفت و شنید کے ذریعے ایک دوسرے کے نظریات کو سمجھنے لگتے ہیں تو غلط فہمیاں کم اور احترام بڑھتا ہے۔ یہ طرزِ عمل انتہا پسندی، نفرت اور تشدد کے رجحانات کے خاتمے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ دعوت اور مکالمے کا مقصد کسی پر اپنی برتری جتانا نہیں بلکہ انسانوں کے درمیان خیر، امن اور عدل کے پیغام کو عام کرنا ہے۔ معاشرتی اصلاح اسی وقت ممکن ہے جب مکالمہ، رواداری اور نرمی کو اپنایا جائے، کیونکہ یہی اصول ایک پر امن اور مہذب سماج کی بنیاد رکھتے ہیں۔

دعوت، اصلاحِ معاشرہ اور بین المذاہب مکالمے کی اہمیت کے بارے میں ائمہ کرام کی فکر کا یہ حصہ نہایت اہم ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق دعوت کا اصل مقصد لوگوں کو سچائی اور ہدایت کی طرف بلانا ہے، نہ کہ انہیں مجبور یا ذلیل کرنا۔ مؤمن حکمت، نرم نصیحت اور خوش گفتاری کے ذریعے دوسروں کے دلوں تک پیغام پہنچاتا ہے۔ سختی، زبردستی یا تشدد سے اثر پیدا نہیں ہوتا بلکہ نفرت اور اختلاف بڑھتا ہے۔ نرمی اور حلم سے کی گئی دعوت دلوں میں قبولیت اور فکری توازن پیدا کرتی ہے۔ اس اصول کے مطابق معاشرتی اصلاح اور انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے رحمت اور اخلاق پر مبنی دعوت ناگزیر ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں:

"المؤمن يدعو إلى الله بالحكمة والموعظة الحسنة، لا بالغلظة ولا بالعنف، فإن المقصود هداية الخلق لا إذلالهم."[1]

مؤمن اللہ کی طرف حکمت اور نرم نصیحت کے ساتھ بلاتا ہے، سختی یا تشدد کے ساتھ نہیں، کیونکہ مقصد لوگوں کو ہدایت دینا ہے نہ کہ انہیں ذلیل کرنا۔

---

[1] مجموع الفتاوی، ج ۲۸، ص ۱۳۷

یہ قول اسلام کے دعوتی اسلوب میں نرمی، حلم اور اخلاقِ حسنہ کی اہمیت کو واضح کرتا ہے، جو مکالمے اور معاشرتی اصلاح کی بنیاد ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معاشرتی اصلاح کے لیے علم اور عدل دونوں لازمی اور آپس میں ملزوم ہیں۔ علم اگر صرف معلومات کے حصول تک محدود رہے اور اس پر عمل نہ ہو تو اس کا اثر محدود یا بعض اوقات نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ علم کی اصل افادیت تب ہی ظاہر ہوتی ہے جب وہ انسان کے کردار اور معاشرتی رویّوں میں مثبت تبدیلی لے آئے۔

اسی طرح عدل کے بغیر علم معاشرت میں انصاف، توازن اور اجتماعی ہم آہنگی قائم نہیں کر سکتا۔ علم اور عدل کے امتزاج سے اخلاقی اور فکری استحکام پیدا ہوتا ہے، اور یہ افراد کو صحیح فیصلے کرنے، حق و باطل کی تمیز کرنے اور معاشرت میں امن و انصاف قائم رکھنے کی صلاحیت دیتا ہے۔ اس لیے افراد اور معاشرہ اسی وقت درست سمت میں ترقی کر سکتا ہے جب علم عدل کے ساتھ عملی زندگی میں نافذ ہو، تاکہ علم نہ صرف معلومات بلکہ کردار، عمل اور اجتماعی فلاح کا ذریعہ بن جائے۔ آپ لکھتے ہیں:

"الناس لا يُصلحهم إلا العِلمُ والعدل، والعلمُ لا يُثمر إلا إذا اقترن بالعمل."[1]

لوگوں کی اصلاح علم اور عدل کے بغیر ممکن نہیں، اور علم اُس وقت مفید ہوتا ہے جب عمل کے ساتھ ہو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معاشرتی اصلاح کا منبع علم و عدل ہے، جو دعوت و مکالمے کے ذریعے ہی عام ہوتا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک معاشرتی اصلاح کی اصل بنیاد تزکیۂ نفس اور باطن کی اصلاح ہے۔ ان کے مطابق جب فرد کا دل و دماغ درست ہو جائے اور اس کے کردار میں نرمی، عدل اور اخلاقی توازن ہو تو پورا معاشرہ خود بخود بہتر اور متوازن ہو جاتا ہے۔

اسی اصول کے تحت دعوت کا مقصد لوگوں کو باہمی احترام، رواداری اور محبت کی طرف مائل کرنا ہے۔ جب افراد حق پر متحد ہوں تو یکجہتی اور اجتماعی فلاح پیدا ہوتی ہے، اور انتہا پسندی کے امکانات خود بخود کم ہو جاتے ہیں۔ اس طرح امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دعوت ایک مؤثر ذریعہ ہے جو معاشرت میں امن، اعتدال اور اصلاح کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔

---

[1] الغزالی، احیاء علوم الدین، ج۱، ص ۳۲

آپ لکھتے ہیں:

"من أعظم مقاصد الدعوة إزالةُ الشحناء بين الأمم، وجمعُ الكلمة على الحق."[1]

دعوت کا سب سے بڑا مقصد امتوں کے درمیان دشمنی کو ختم کرنا اور انہیں حق پر متحد کرنا ہے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کے مطابق دعوت کا بنیادی مقصد صرف افراد کو ہدایت دینا نہیں بلکہ امتوں اور معاشرتی طبقات کے درمیان دشمنی، انتشار اور غلط فہمیوں کو ختم کرنا بھی ہے۔ دعوت کا اصل جوہر وحدت، محبت اور مکالمے کے ذریعے فکری و سماجی توازن قائم کرنا ہے۔

"دعوت الی اللہ" کا مقصد لوگوں کے دلوں میں ایمان، محبت اور نیکی کی روشنی پیدا کرنا ہے۔ اگر یہ دعوت جھگڑوں، مناظروں یا زبانی جنگ پر مبنی ہو تو دلوں تک اثر نہیں پہنچتا اور فکری اختلافات بڑھ سکتے ہیں۔ داعی کی ذمہ داری ہے کہ وہ رحمت، شفقت اور حسنِ اخلاق کے ساتھ لوگوں کو ہدایت کی طرف بلائے، تاکہ معاشرت میں امن، برداشت اور اعتدال قائم رہے۔ اس طرح رحمت پر مبنی دعوت نہ صرف لوگوں کو سچائی کی طرف لاتی ہے بلکہ انتہا پسندی اور تعصب کے اثرات کو بھی کم کرتی ہے۔ اس حوالے سے امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں:

"الدعوة إلى الله مبناها على الرحمة بالخلق، لا على الخصومة والجدال."[2]

دعوت الی اللہ کی بنیاد مخلوق پر رحمت ہے، نہ کہ جھگڑے اور مناظرے پر۔

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک داعی کا اسلوب رحمت و شفقت پر مبنی ہونا چاہیے تاکہ دلوں میں اثر پیدا ہو اور معاشرتی اصلاح ممکن ہو۔

امت کی اصلاح ایک اجتماعی ذمہ داری ہے جس میں عالم، حاکم اور عوام سب کا کردار لازمی ہے۔ عالم دین فکری رہنمائی اور اخلاقی تعلیم فراہم کرتا ہے تاکہ افراد درست سمت میں سوچ اور عمل کریں۔ حاکم عدل، قانون اور نظم قائم رکھتا ہے تاکہ معاشرتی ڈھانچہ مضبوط اور محفوظ رہے۔ عوام اس نظام کو اپنانے اور تعاون کرنے کے ذریعے اصلاح میں شریک ہوتے ہیں، جس سے معاشرہ فعال اور متوازن رہتا ہے۔

جب یہ تینوں عناصر مل کر حق کی نصرت اور دعوت کو فروغ دیتے ہیں تو معاشرہ امن، اعتدال اور اجتماعی فلاح کی جانب بڑھتا ہے۔ اس باہمی تعاون کے بغیر اصلاحِ امت نامکمل رہتی ہے اور اس کے اثرات محدود یا غیر مؤثر ہو جاتے ہیں۔

---

[1] الرازی، التفسیر الکبیر، ج۲۰، ص۱۳۰

[2] ابن قیم، مدارج السالکین، ج۱، ص۸۷

امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"صلاحُ الأمة لا يتمُّ إلا بالتعاون بين العالم والحاكم والعامّة في نصرة الحقّ والدعوة إليه."[1]

امت کی اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عالم، حاکم اور عوام باہمی تعاون سے حق کی نصرت اور اس کی دعوت نہ دیں۔

یہ قول اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ دعوت اور اصلاحِ معاشرہ اجتماعی ذمے داری ہے، جس میں تمام طبقات کا کردار لازمی ہونا چاہیے۔

ائمہ اکرام کے اقوال کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے دعوت، اصلاحِ معاشرہ اور بین المذاہب مکالمہ نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ دعوت کا مقصد لوگوں کو حکمت، نصیحت اور حسنِ اخلاق کے ساتھ ہدایت کی طرف بلانا ہے تاکہ دلوں میں اعتدال، رواداری اور فکری توازن قائم ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق معاشرتی اصلاح تب ممکن ہے جب فرد کی تزکیۂ نفس اور اخلاقی تربیت ہو، کیونکہ جب فرد درست ہوتا ہے تو معاشرہ خود بخود شدت پسندی، تعصب اور ظلم سے محفوظ رہتا ہے۔

بین المذاہب مکالمہ سماج میں تحمل، باہمی احترام اور سمجھ بوجھ پیدا کرتا ہے، جو اختلافات اور نفرت کے بیج کو ختم کرنے میں مددگار ہے۔ دعوت اور مکالمے کا مقصد کسی پر اپنی رائے مسلط کرنا نہیں بلکہ انسانیت کے درمیان خیر، عدل اور فلاح کے اصول عام کرنا ہے۔ علماء کی رہنمائی، ریاست کی عدل پر مبنی پالیسیاں اور عوام کا تعاون مل کر انتہا پسندی کے اثرات کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ نصابِ تعلیم، اخلاقی تربیت اور عملی اصلاح کے ذریعے نئی نسل میں تحمل، فہم اور اعتدال پیدا کیا جا سکتا ہے، جو شدت پسند رجحانات، غلط فہمیاں اور اشتعال انگیزی ختم کرنے میں مددگار ہے۔ اسی طرح معاشرتی اصلاح کے ساتھ دعوت و مکالمہ کا امتزاج معاشرے کو فکری اور اخلاقی طور پر مضبوط کرتا ہے۔ نتیجتاً، دعوت، اصلاحِ معاشرہ اور بین المذاہب مکالمہ انتہا پسندی کے خاتمے کی سب سے مؤثر حکمت عملی کے طور پر سامنے آتا ہے، جو امن، بھائی چارہ اور اجتماعی فلاح کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔

عدلِ اجتماعی کا مطلب ہے کہ قوانین، فیصلے اور معاشرتی رویے ہر فرد اور گروہ کے لیے یکساں ہوں، بغض و عناد یا تعصب کے بغیر۔ امنِ عامہ کا قیام اسی عدل کے نفاذ سے ممکن ہے، کیونکہ جب انصاف قائم ہوتا ہے تو ظلم، انتہا پسندی اور فساد کے مواقع کم ہو جاتے ہیں۔ قرآن اور راہی محللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں معاشرتی توازن

---

[1] الماوردی، الأحکام السلطانیۃ، ص۹

اور اختلافات کے حل کے لیے عدل و انصاف کو لازمی قرار دیا گیا ہے، اور حکمرانوں اور عوام دونوں پر عدل و اخلاق کی پابندی پر زور دیا گیا ہے۔

عدل کے بغیر قانون اور معاشرتی قواعد صرف کاغذ کے ٹکڑے رہ جاتے ہیں، اور امن قائم نہیں رہتا۔ اسی لیے اسلامی اصول یہ سکھاتے ہیں کہ عدل کو اجتماعی زندگی کا مرکز بنایا جائے، امن و امان قائم کیا جائے اور ہر فرد کو اپنے حقوق اور ذمہ داریوں کا شعور دیا جائے۔ اس اصول کی روشنی میں معاشرت میں اشتراک، بھائی چارہ اور سماجی فلاح ممکن ہوتی ہے، اور انتہا پسندی اور تشدد کے رجحانات کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اسلام میں عدلِ اجتماعی اور امنِ عامہ کو معاشرتی استحکام اور فلاحِ انسانیت کے بنیادی ستون کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو ایک متوازن، معتدل اور پُرامن معاشرے کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا وَإِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ﴾[1] اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ امانتیں اپنے حق داروں کو واپس دی جائیں اور فیصلہ کرتے وقت عدل کو بنیاد بنایا جائے۔

امن اور فلاح کا فروغ

عدل اور توازن کے بغیر معاشرت میں ظلم، انتہا پسندی اور فساد کے رجحانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ امن و فلاح کے فروغ کے لیے ریاست کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ شفاف قوانین اور عدل پر مبنی پالیسیاں تیار کرے۔ تعلیمی ادارے اور علماء عوام میں اخلاقی تربیت اور شعور پیدا کریں تاکہ لوگ اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ رہیں۔ معاشرتی تعاون، بھائی چارہ اور فکری اعتدال انہی اصولوں کا عملی مظہر ہیں۔ اقتصادی و سماجی توازن قائم رکھنے سے معاشرت میں اختلافات کے اثرات کم ہوتے ہیں، اور عدالتی نظام و انصاف کا نفاذ انتہا پسندی اور تشدد کے رجحانات کو محدود کرتا ہے۔ یوں عدل اور توازن امن، فلاح اور معاشرتی استحکام کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ﴾[2]

اور انصاف کے ساتھ تول قائم کرو اور وزن نہ گھٹاؤ۔

اس آیت کی روشنی میں واضح ہے کہ معاشرتی انصاف اور توازن قائم کرنا ہر فرد اور معاشرے کی فلاح کے لیے لازم ہے۔ "الوزن بالقصط" سے مراد ہر قسم کے معاملات میں انصاف، مساوات اور غیر جانبداری کے

---

(1) سورۃ النساء: ۵۸

(2) سورۃ الرحمن: ۹

ساتھ فیصلے کرنا ہے۔ جب معاشرت میں عدل قائم ہوتا ہے تو ظلم، تشدد اور انتہا پسندی کے رجحانات کم ہو جاتے ہیں اور امن و امان برقرار رہتا ہے۔ "لا تُخسروا المیزان" کا مفہوم یہ ہے کہ معاشرت میں اقتصادی، سماجی اور اخلاقی توازن کو نقصان نہ پہنچایا جائے، تاکہ ہر فرد کو اس کے حقوق حاصل ہوں اور معاشرت میں ہم آہنگی قائم رہے۔

آیت کے مفہوم کے مطابق معاشرتی انصاف، اخلاقی تعلیم، شفاف قوانین اور فلاحی منصوبہ بندی ایک ساتھ امن و فلاح کو فروغ دیتے ہیں۔ نوجوان نسل میں شعوری تربیت، مکالمے کے پروگرامز اور تنقیدی سوچ کے فروغ سے فکری توازن پیدا ہوتا ہے، اور معاشرت میں اختلافات کے اثرات کم ہو جاتے ہیں۔ ریاست اور حکمران عدل قائم کریں اور اس کے نفاذ کی نگرانی کریں، جبکہ تعلیمی ادارے اور علماء عوام میں اخلاقی اور فکری تربیت کے ذریعے شعور پیدا کریں تاکہ ہر فرد اپنے حقوق اور ذمہ داریوں سے آگاہ ہو۔ اقتصادی، سماجی اور سیاسی توازن برقرار رکھنا بھی اس آیت کی ہدایت کے مطابق امن کی ضمانت ہے۔

قرآن کی اس آیت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ معاشرتی امن اور فلاح کا قیام عدل، توازن اور اخلاقی تربیت کے بغیر ممکن نہیں۔ ریاست، علماء اور عوام کا مشترکہ کردار ہی معاشرت میں پائیدار امن اور اجتماعی فلاح کو یقینی بناتا ہے اور انتہا پسندی و ظلم کے امکانات کو کم کرتا ہے۔ مسلمانوں کی حقیقی بھلائی اور فلاح معاشرت میں عدل کے قیام سے وابستہ ہے۔ اگر معاشرت میں ظلم، تعصب یا ناانصافی موجود ہو تو تعلقات خراب ہوتے ہیں اور بھائی چارہ و تعاون متاثر ہوتا ہے۔

قرآن و سنت میں بار بار عدل قائم کرنے اور مظلوم کے حقوق دینے پر زور دیا گیا ہے۔ عدل کی بنیاد پر ہی امن، بھائی چارہ اور مساوات قائم رہتی ہے، اور لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کرتے ہیں۔ جب ہر فرد کو اس کا حق ملے تو حسد، جھگڑا اور انتشار کم ہوتے ہیں۔ معاشرت میں عدل کی غیر موجودگی انسانی اور اخلاقی زوال کا سبب بنتی ہے۔ حقیقی فلاح کا مطلب صرف دنیاوی خوشحالی نہیں بلکہ روحانی، اخلاقی اور سماجی بھلائی بھی ہے۔ عدل کے بغیر معاشرہ مضبوط نہیں رہ سکتا اور نہ ہی کمیونٹی کامیاب ہو سکتی ہے۔ نبی ﷺ نے مسلمانوں کو ہمیشہ عدل قائم کرنے اور ظلم سے بچنے کی تعلیم دی، تاکہ معاشرت میں امن، بھائی چارہ اور فلاح برقرار رہے۔

یوں واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حقیقی بھلائی اور فلاح اسی وقت ممکن ہے جب معاشرت میں عدل قائم ہو اور ہر فرد کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔

نبی ﷺ نے فرمایا:((لا ينال المسلمون برّهم حتى يكون بينهم العدل))[1]۔

مسلمان اپنے نیکی اور بھلائی تک اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان کے درمیان عدل قائم نہ ہو۔ یہ حدیث مسلمانوں میں عدل کی اہمیت کو واضح کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ معاشرتی انصاف کے بغیر حقیقی بھلائی اور فلاح ممکن نہیں۔ ہر فرد کو اس کے حق کے مطابق حقوق دیئے جائیں اور ظلم سے گریز کیا جائے۔ عدل سے بھائی چارہ، امن اور باہمی اعتماد قائم ہوتا ہے، جس سے معاشرہ مضبوط اور ہر طرح کی بدعنوانی سے پاک رہتا ہے۔

معاشرت میں امن و امان اور فلاح کے فروغ کے لیے جہاں معاشرتی انصاف و توازن قائم کرنا ضروری ہے، وہاں ظلم اور فساد سے گریز کرنا بھی لازمی ہے۔ ظلم معاشرت میں عدم توازن اور ناانصافی پیدا کرتا ہے، جو انتہا پسندی اور فساد کے امکانات بڑھاتا ہے۔ فساد کے پھیلاؤ سے سماجی تعلقات متاثر ہوتے ہیں اور فکری و اخلاقی توازن بگڑ جاتا ہے۔

امن قائم رکھنے کے لیے افراد کو اپنے حقوق اور دوسروں کے حقوق کا احترام کرنا چاہیے۔ حکومت اور سماجی ادارے بھی انصاف اور قانون کے نفاذ کے ذریعے ظلم اور فساد کو روکتے ہیں۔ تعلیم اور تربیت کے ذریعے شعوری بیداری پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ لوگ برائی سے بچیں۔ معاشرتی تعاون اور بھائی چارے کو فروغ دینا ظلم اور فساد کے اثرات کو کم کرتا ہے۔ مکالمہ اور رواداری کے اصول اپنانا بھی امن و فلاح میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

نتیجتاً، ظلم اور فساد سے پرہیز معاشرتی استحکام، اخلاقی ترقی اور فلاح کے فروغ کے لیے لازمی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالی نے زمین میں فساد کرنے سے منع فرمایا ہے اور عدل و انصاف قائم رکھنے کو ہر معاشرتی نظام کی بنیاد قرار دیا ہے ، ارشاد باری تعالی ہے: ﴿ وَلَا تَبْغُوا الْفِسْقَ فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ﴾[2] اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد برپا نہ کرو۔

یہ آیت اللہ تعالی کی طرف سے ایک اہم ہدایت ہے جو انسانوں کو زمین میں فساد پھیلانے سے منع کرتی ہے، خصوصاً اس وقت جب اللہ تعالیٰ نے زمین کی اصلاح کر دی ہو۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسانوں کو ظلم، فساد فی الارض، اور اخلاقی برائیوں سے بچنا چاہیے تاکہ اللہ کی رضا حاصل ہو اور زمین میں امن، سکون اور فلاح قائم رہے۔

---

[1] ابن ماجہ، کتاب الادب، حدیث نمبر ۲۷۲۱

[2] سورۃ الأعراف:۵۶

عہد رسالت میں نبی ﷺ نے ظلم و تشدد سے بچنے کی اعلیٰ مثالیں پیش کیں۔ مدینہ منورہ کے قیام کے بعد آپ ﷺ نے سب سے پہلے معاشرتی انصاف اور امن کے قیام پر توجہ دی۔ میثاقِ مدینہ کے ذریعے مسلمانوں، یہودیوں اور دیگر قبائل کے درمیان باہمی حقوق و ذمہ داریوں کا تعین کیا گیا، جس سے معاشرے میں بھائی چارہ، تعاون، مساوات اور امن کی فضا قائم ہوئی اور اختلاف و فساد کے امکانات کم ہو گئے۔

آپ ﷺ نے ہمیشہ عدل، صبر اور حکمت کے ساتھ معاملات کو نمٹایا، چاہے مخالفین کتنے ہی سخت رویہ اختیار کریں۔ آپ ﷺ نے بلاجواز کسی پر ظلم نہیں کیا اور ہر فیصلہ شریعت و اخلاق کی روشنی میں دیا۔ آپ ﷺ کے عدل و انصاف اور پر امن طرزِ عمل نے نہ صرف معاشرت میں استحکام اور امن پیدا کیا بلکہ لوگوں کے دلوں میں محبت، اعتماد اور اطمینان بھی قائم کیا۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

((المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده))[1]۔

مسلمان وہ ہے جس سے دوسرے مسلمان زبان و عمل کے ذریعے محفوظ ہوں۔

اس حدیث میں امن قائم رکھنے اور کسی پر ظلم نہ کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

آپ ﷺ میں عدل و انصاف کی ایک مشہور مثال حضرت عبد اللہ بن جُحش کے کیس سے ملتی ہے۔ ایک واقعے میں حضرت عبد اللہ بن جُحش نے کسی معاملے میں اپنی شکایت پیش کی تو آپ ﷺ نے بغیر کسی تعصب کے قرآن و سنت کے مطابق فیصلہ کیا اور انصاف کیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((لَا يَجْرِي عَلَى الْمُسْلِمِ سِيَانٌ أَنْ يَظْلِمَ أَوْ يُظْلَمَ))[2]۔

مسلمان پر یہ مناسب نہیں کہ وہ ظلم کرے یا اس پر ظلم ہو۔

یہ واقعہ اور حدیث اس بات کی دلیل ہیں کہ آپ ﷺ نے ہر معاملے میں عدل و انصاف کو ترجیح دی اور ذاتی پسند و ناپسند کو بالکل دخل نہیں دیا۔ نبی ﷺ نے بھائی چارہ اور تعاون کو اسلام کی بنیاد قرار دیا اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ محبت، اخوت اور مدد کرنے کی تعلیم دی۔ آپ ﷺ نے عملی زندگی میں یہ سبق دیا کہ ایک مضبوط کمیونٹی اسی وقت قائم رہ سکتی ہے جب اس کے افراد ایک دوسرے کے بھائی اور بہن کے طور پر رویہ اختیار کریں، ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں اور کسی کو نقصان نہ پہنچائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مومن مومن کا بھائی ہے اور اسے نقصان پہنچانے والا نہیں ہو سکتا، یعنی ایک مؤمن کو دوسرے مؤمن کی

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الإیمان، حدیث ۱۰

[2] سنن الترمذی، کتاب الفتن، حدیث نمبر ۱۳۲۴

حفاظت، مدد اور فلاح میں دلچسپی رکھنی چاہیے۔ اس تعلیم سے معاشرت میں نہ صرف ہم آہنگی اور باہمی اعتماد پیدا ہوتا ہے بلکہ افراد میں تعاون، محبت اور اخلاقی ذمہ داری بھی فروغ پاتی ہے۔ بھائی چارہ اور تعاون کی یہ تعلیم معاشرتی ترقی، امن اور اجتماعی فلاح کے لیے بنیادی ستون کے طور پر کام کرتی ہے، کیونکہ جب کمیونٹی کے ہر فرد کو اپنی ذمہ داری اور حق کا شعور ہو تو وہ ایک مضبوط، متوازن اور پُرامن معاشرے کے قیام میں فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔

واقعہ ہجرت مدینہ: نبی ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مؤاخات قائم کیا اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنایا، جس سے مدینہ میں مضبوط کمیونٹی قائم ہوئی۔[1] نبی ﷺ نے مدنی معاشرت میں ہدایت دی کہ ہر فرد کو اپنے بھائی کے حقوق کا خیال رکھنا چاہیے، اور اختلافات کو مکالمے اور صلح سے حل کرنا چاہیے۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

((المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا))[2]۔

مؤمن ایک دوسرے کے لیے مضبوطی اور تعاون کا باعث ہیں۔

یعنی مؤمن ایک دوسرے کے لیے مضبوطی اور تعاون کا باعث ہیں۔ اس حدیث میں معاشرتی تعاون اور بھائی چارہ کی اہمیت بیان کی گئی ہے، جو امن کے فروغ میں مددگار ہے۔

عہدِ رسالت میں امانت داری اور فلاحِ عامہ کی اعلیٰ مثالیں نمایاں ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ہمیشہ عوام کے حقوق کی حفاظت فرمائی اور کسی پر ظلم یا ناانصافی کو برداشت نہیں کیا۔ آپ ﷺ نے ہر منصب اور ذمہ داری میں خیانت سے اجتناب کیا اور فیصلے عدل، انصاف اور شفافیت پر مبنی رکھے تاکہ معاشرے میں اعتماد اور بھائی چارہ قائم رہے۔ فلاحِ عامہ کے لیے آپ ﷺ نے غریب، یتیم اور محتاج کی مدد کو ترجیح دی اور لوگوں کے مسائل کو توجہ سے سنتے ہوئے عملی حل فراہم کیے۔ آپ ﷺ نے تاکید فرمائی کہ ہر فرد کو اس کا حق دیا جائے اور ظلم سے پرہیز کیا جائے۔ معاشرت میں تعاون، بھائی چارہ اور خدمتِ انسانیت کے جذبے کو فروغ دینا آپ ﷺ کے اصولوں کی بنیاد تھا۔ یہ رہنمائی آج بھی مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے، جس پر عمل کر کے ایک مضبوط، پُرامن اور خوشحال معاشرہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

نبی ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۲۳۴

[2] صحیح بخاری، کتاب الاخلاق، حدیث ۲۴۴۴

((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ))[1]

یاد رکھو! تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے، اور ہر ایک سے اس کے زیرِ کفالت لوگوں کے بارے میں باز پرس کی جائے گی۔

اسلامی معاشرت میں عدل اور اخلاق کی بنیاد پر اجتماعی امن قائم کرنا لازمی ہے۔ قرآن و سنت کی روشنی میں عدلِ اجتماعی اور امنِ عامہ کا قیام معاشرتی توازن، انصاف، اخلاقی اصلاح اور بھائی چارے پر منحصر ہے۔ عدل کے بغیر معاشرت میں انتہا پسندی، ظلم اور فساد کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں، اور قوانین محض کاغذی دستاویزات بن کر رہ جاتے ہیں۔ نبوی تعلیمات میں حکمران اور عوام دونوں پر عدل اور اخلاقی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، تاکہ ہر فرد اپنے حقوق اور فرائض سے آگاہ ہو اور معاشرت میں ہم آہنگی قائم رہے۔ سیرتِ طیبہ میں عدل کو معاشرت کا مرکز بنانے اور امن قائم رکھنے کی تاکید کی گئی ہے، کیونکہ یہی اصول انتہا پسندی اور تشدد کے رجحانات کو ختم کرنے میں مؤثر ہیں۔

اسلامی اصولوں کی روشنی میں پالیسی سازی بھی معاشرتی اصلاح کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ ریاست اور حکومتی ادارے اپنی قوانین و پالیسیز میں عدل، مساوات، اخلاقی اصلاح اور فلاحِ عامہ کو بنیاد بنائیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے مطابق علم اور عدل کے امتزاج کے بغیر معاشرتی اصلاح ممکن نہیں، اس لیے حکومتی قوانین اور پالیسیز کو فکری توازن، عدل اور معاشرتی امن کو فروغ دینے کے لیے مرتب کیا جانا چاہیے۔ پالیسیز میں تعلیم، تربیت اور اخلاقی اصولوں کو مرکزی حیثیت دی جائے تاکہ نئی نسل میں رواداری، تحمل اور اعتدال پیدا ہو اور افراد کو فکری و عملی رہنمائی حاصل ہو۔

تعلیمی نصاب میں اصلاح انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے ایک اہم اقدام ہے۔ مدارس، یونیورسٹیز اور اسکولوں میں اخلاقی، فکری اور اعتدال پر مبنی مضامین شامل کیے جائیں، تاکہ طلبہ کی شخصیت متوازن اور فکری لحاظ سے مضبوط ہو۔ ایسے نصاب نہ صرف علم فراہم کریں بلکہ اخلاقی تربیت، صبر، تحمل اور دوسروں کے نظریات کا احترام کرنا بھی سکھائیں۔ نصاب میں عملی سرگرمیاں اور مباحثے شامل ہوں جو نوجوانوں میں تنقیدی سوچ کو فروغ دیں اور انہیں انتہا پسندی یا تعصب سے محفوظ رکھیں۔ علاوہ ازیں، طلبہ کو سماجی ذمہ داری، خدمت خلق اور بھائی چارہ کی تربیت دی جائے تاکہ معاشرت میں امن اور رواداری قائم ہو۔

---

[1] صحیح بخاری،، کتاب الأدب، حدیث ۸۹۳

تربیتی اور مکالماتی پروگرامز نوجوانوں میں فکری اعتدال اور رواداری پیدا کرنے کے لیے نہایت مؤثر ہیں۔ ورکشاپس، سیمینارز اور کمیونٹی سینٹرز میں علماء اور اساتذہ کی نگرانی میں علمی، اخلاقی اور عملی تربیت فراہم کی جائے۔ نوجوانوں کو اختلافات کو پرامن طریقے سے حل کرنا، تحمل، رواداری اور مکالمے کی اہمیت سکھائی جائے۔ بین المذاہب اور بین الثقافتی مکالمے کے لیے کمیونٹی سینٹرز قائم کرنا بھی ضروری ہے تاکہ مختلف نظریات اور ثقافتوں کے افراد باہمی احترام اور افہام و تفہیم کے ذریعے بات چیت کر سکیں۔ تربیتی پروگرامز کے ذریعے عملی تجربات، گروپ ڈسکشنز اور مسئلہ حل کرنے کے سیشنز نوجوانوں کو معاشرت میں مثبت کردار ادا کرنے کے اہل بناتے ہیں۔

شفاف اور عدل پر مبنی قوانین بھی انتہاپسندی اور تشدد کے رجحانات کو کم کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ قوانین واضح اور قابل فہم ہونے چاہئیں تاکہ ہر فرد اپنے حقوق و فرائض سے آگاہ ہو اور قانون کی حدود کا احترام کرے۔ قانون کے نفاذ کے لیے خصوصی نگرانی کے نظام قائم کیا جائے تاکہ کسی بھی خلاف ورزی پر فوری اور مؤثر کارروائی ممکن ہو۔ عدل پر مبنی قوانین معاشرت میں مساوات اور اعتماد پیدا کرتے ہیں اور نوجوانوں میں ذمہ داری اور سماجی شعور اجاگر کرتے ہیں۔ شفافیت اور مساوات کے اصول پر قائم قوانین معاشرت میں نفرت، تعصب اور تشدد کی جڑوں کو ختم کرنے میں مدد دیتے ہیں اور فلاحِ عامہ اور قومی استحکام کو ممکن بناتے ہیں۔

عوامی شعور اور آگاہی کے فروغ کے لیے میڈیا، سوشل میڈیا اور مقامی کمیونٹی پروگرامز کا استعمال ضروری ہے۔ شعوری مہمات کے ذریعے شہریوں کو انتہاپسندی، نفرت انگیزی اور تشدد کے خطرات سے آگاہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ، فکری توازن، رواداری اور مکالمے کی اہمیت پر زور دیا جائے تاکہ لوگ اختلافات کو پرامن طریقے سے حل کرنا سیکھیں۔ تعلیمی اداروں، مساجد اور کمیونٹی سینٹرز میں ورکشاپس اور سیمینارز منعقد کر کے عملی تربیت دی جائے۔ عوامی شعور بڑھانے سے معاشرت میں ہم آہنگی، بھائی چارہ اور اعتماد قائم ہوتا ہے۔

علما اور سماجی اداروں کا تعاون بھی معاشرت میں عدل، امن اور فلاحِ عامہ کے فروغ کے لیے نہایت اہم ہے۔ علماء اور مذہبی ادارے قانون سازی کے نفاذ میں عملی شراکت کر کے قوانین کی روح اور مقاصد عوام تک پہنچا سکتے ہیں۔ سماجی تنظیمیں تربیتی پروگرامز اور آگاہی مہمات کے ذریعے شہریوں میں فکری اور اخلاقی شعور پیدا کرتی ہیں تاکہ لوگ انتہاپسندی، تعصب اور تشدد سے محفوظ رہیں۔ اس تعاون سے کمیونٹی میں بھائی چارہ اور ہم آہنگی مضبوط ہوتی ہے اور نوجوان معاشرت میں مثبت کردار ادا کرنے کے اہل بنتے ہیں۔

نظریاتی اور تحقیقی مراکز قائم کرنا بھی انتہاپسندی کے مسائل کو سمجھنے اور مؤثر حل تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے۔ یہ مراکز انتہاپسندی کی وجوہات، نفسیاتی، سماجی اور سیاسی اثرات پر تحقیق کریں گے اور حاصل شدہ

معلومات کو نصاب، تربیتی پروگرامز اور پالیسی سازی میں شامل کریں گے۔ تحقیق کے ذریعے نوجوانوں میں فکری توازن اور رواداری پیدا کی جاسکتی ہے، اور قوانین، نصاب اور تربیتی ورکشاپس زیادہ مؤثر بنائی جاسکتی ہیں۔

خاندانی و معاشرتی تربیت کا نظام بھی معاشرت میں اخلاقی اقدار اور بھائی چارہ قائم رکھنے کے لیے بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ گھر ابتدائی تربیتی مرکز ہے، جہاں والدین بچوں میں احترام، رواداری اور امن کے اصول سکھائیں۔ مسجدیں اخلاقی اور روحانی تربیت کا اہم ذریعہ ہیں، اور کمیونٹی سینٹرز میں ورکشاپس اور سیمینارز کے ذریعے تحمل، عفو و درگزر اور بھائی چارہ فروغ پاتے ہیں۔ والدین اور اساتذہ کی شراکت سے تعلیم و تربیت میں ہم آہنگی قائم رہتی ہے اور نوجوان معاشرت میں مثبت کردار ادا کرنے کے اہل بنتے ہیں۔

اسلامی معاشرت میں انتہا پسندی کے خاتمے کے لیے تعلیم و تربیت، عدل و انصاف، عوامی شعور، علماء و سماجی اداروں کا تعاون اور تحقیقی بنیاد پر پالیسیاں لازم ہیں۔ نوجوانوں میں اعتدال، صبر، حلم اور تحمل کے اصول راسخ ہوں، اختلافات کا حل مکالمے اور مشورے سے کیا جائے، اور سماجی و روحانی تربیت کے ذریعے معاشرت میں بھائی چارہ، تعاون اور امن قائم کیا جائے۔ اس طرح اسلامی معاشرتی نظام نہ صرف دین کے اصولوں پر قائم رہتا ہے بلکہ عملی طور پر بھی اعتدال، امن اور فلاح کا حامل ہوتا ہے۔

نتائج بحث

نتائج بحث

زیرِ نظر تحقیق کے درج ذیل نتائج ہیں:

١. تحقیق سے معلوم ہوا کہ انتہا پسندی صرف ایک ذہنی رویہ نہیں بلکہ فکری، سماجی اور سیاسی عوامل کا مجموعہ ہے جس نے مختلف ادوار میں مختلف شکلیں اختیار کی ہیں۔

٢. تاریخ میں سیاسی خلفشار، معاشرتی ناانصافی، اور فکری جمود نے انتہا پسندی کے پھیلاؤ میں کلیدی کردار ادا کیا ہے۔

٣. عقائد میں غلو فکری تنگ نظری اور تکفیر جیسے رجحانات کو جنم دیتا ہے۔

۴. انتہا پسندی اکثر مذہبی تعلیمات کی سطحی یا غلط تفہیم، اندھی تقلید، اور جذباتی فکری رجحانات کے نتیجے میں ابھرتی ہے۔

۵. عبادات میں انتہا پسندی: عبادات میں افراط و تفریط کے مظاہر جیسے سخت گیر اصول پسندی یا غیر معقول ترک عبادات، علمی و عملی توازن کی کمی کا نتیجہ ہیں۔

٦. معاملات میں شدت پسندی اور غیر لچکدار رویے معاشرتی تعلقات کو نقصان پہنچاتے ہیں اور جماعتی ہم آہنگی کو کمزور کرتے ہیں۔

٧. معاملات میں عدمِ توازن سماجی ناانصافی، تشدد اور انتشار کا سبب بنتا ہے۔

٨. دینی نصوص کی سیاق و سباق سے ہٹ کر تعبیر انتہا پسندی کو جواز فراہم کرتی ہے۔

٩. سیاسی مفادات نے مذہب کو بطور آلہ استعمال کر کے انتہا پسندی کو تقویت دی ہے۔

١٠. انتہا پسندی کی وجہ سے معاشی ترقی رک جاتی ہے، سرمایہ کاری میں کمی آتی ہے اور سماجی وسائل کا ضیاع ہوتا ہے۔

١١. انتہا پسندی کے نتیجے میں مسلم معاشروں میں فکری انحراف، اخلاقی زوال، اور رواداری کی کمی دیکھی گئی ہے۔

١٢. انتہا پسندانہ رجحانات مسلم معاشروں کی اخلاقی اقدار کو کمزور کرتے ہیں۔

١٣. انتہا پسندی نے مسلم معاشروں کی اخلاقی اقدار اور سماجی ہم آہنگی اور باہمی اعتماد کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔

١۴. اسلامی تعلیمات اعتدال، رواداری، اور فکری توازن کو فروغ دیتی ہیں اور انتہا پسندی کی روک تھام کے لیے واضح رہنمائی فراہم کرتی ہیں۔

١۵. اسلامی تعلیمات میں موجود تصورِ وسطیت انتہا پسندی کے تدارک کے لیے ایک مؤثر فکری بنیاد فراہم کرتا ہے۔

سفارشات

سفارشات

مقالہ ہذا کی چند اہم سفارشات یہ ہیں:

۱. انتہا پسندی کے انسداد کی منصوبہ بندی میں صرف فرد کی تربیت پر نہیں بلکہ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی ڈھانچے کو بھی شامل کرنا ضروری ہے۔

۲. دینی تعلیم اور فقہی نصوص کی contextual تعلیم کو فروغ دیا جائے تاکہ فکری انحراف کم ہو۔

۳. عبادات میں وسطیت اور علمی توازن کو فروغ دینے کے لیے تربیتی پروگرام اور دینی ورکشاپس مرتب کی جائیں۔

۴. سماجی و خاندانی تربیت اور community engagement پروگرامز کے ذریعے معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے۔

۵. بین المذاہب اور بین المسالک مکالمے اور تربیتی کورسز کے ذریعے رواداری بڑھائی جاسکتی ہے۔

۶. پالیسی ساز اداروں اور حکومتی سطح پر قوانین و پروگرامز ترتیب دیے جائیں جو انتہا پسندی کی جڑوں کو نشانہ بنائیں۔

۷. اسکولز، یونیورسٹیز اور community centers میں اخلاقی تربیت، کردار سازی، اور mediation programs متعارف کرائے جائیں۔

۸. اقتصادی منصوبے اور روزگار کے مواقع بڑھا کر انتہا پسندانہ سوچ کے لیے پیدا ہونے والے خالی ذہنی اور معاشرتی خلا کو کم کیا جائے۔

۹. اسلامی تعلیمی نصاب، دینی اور اخلاقی تربیتی پروگرام، اور فکری اصلاحی ورکشاپس کو نصاب اور عملی تربیت میں شامل کیا جائے۔

۱۰. معاشرتی ہم آہنگی کے لیے کمیونٹی سینٹرز اور پروگرامز کے ذریعے فرقہ واریت اور تعصب کی روک تھام کی جائے۔

فہارس

فہرست آیات قرآنیہ

فہرست احادیث نبویہ

فہرست مصادر و مراجع

فہرست آیات

شمار	آیت	سورة	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۱.	وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ	البقرة	۴۲	۲۱۵
۲.	وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا	البقرة	۱۴۳	۳۴،۵۰،۱۲۷،۱۹۸
۳.	وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ	البقرة	۱۷۰	۶۹
۴.	يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ	البقرة	۱۸۵	۱۱۱, ۱۱۶
۵.	قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا	البقرة:	۱۹۰	۶،۱۱۹،۱۴۱
۶.	وقتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين لله	البقرة	193	۱۴۸
۷.	وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا	البقرة	۲۰۴-۲۰۵	۹،۱۱
۸.	وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا	البقرة	۲۷۵	۱۶۸
۹.	فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَنْ خَلْفَهُمْ	البقرة	۲۷۸-۲۷۹	۱۳۹
۱۰.	لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا	البقرة	۲۸۶	۱۶۲
۱۱.	وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا	آل عمران	۱۰۳	۱۹۲
۱۲.	وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِن بَعْدِ مَا	آل عمران	۱۰۵	۶۰, ۱۸۳, ۱۸۸
۱۳.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ	النساء	۱۹	۱۵۶،۱۶۱
۱۴.	إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا	النساء	۵۸	۲۸۳
۱۵.	أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ	النساء	۸۲	۲۲۹
۱۶.	يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ	النساء	۱۳۵	۳۹،۱۵۳
۱۷.	وَبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا	النساء	۱۵۶	۶۴
۱۸.	وَقَوْلِهِمْ إِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيحَ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُولَ	النساء	۱۵۷	۶۶
۱۹.	يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا	النساء	۱۷۱	۵،۱۸،۴۰،۶۷،۹۷، ۲۲۸

شمار	آیت	سورة	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۲۰.	وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ	المائدة	۴۴	۱۴۸،۷۶
۲۱.	كُلَّمَا اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاهَا اللّٰهُ وَيَسْعَوْنَ	المائدة	۶۴	۱۳۹
۲۲.	لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ	المائدة	۷۲	۹۶
۲۳.	قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ	المائدة	۷۷	۱۸۴،۹۵،۱۹
۲۴.	وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ	الانعام	۱۵۲	۱۶۸
۲۵.	إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَسْتَ مِنْهُمْ	الانعام	۱۵۹	۱۹۰, ۶۲
۲۶.	إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ	الاعراف	۳۱	۸
۲۷.	قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ	الاعراف	۳۲	۱۲۲
۲۸.	قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا	الاعراف	۳۳	۷
۲۹.	وَلَا تَبْغُوا الْفِسْقَ فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا	الاعراف	۵۶	۲۸۵
۳۰.	وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ لَهُمْ	الاعراف	۱۷۹	۱۷۹
۳۱.	يايُهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ	الانفال	۵۷	۱۳۹
۳۲.	بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ	التوبة	۱	۱۴۷
۳۳.	وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارٰى	التوبة	۳۰	۹۶،۱۹
۳۴.	اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ	التوبة	۳۱	۱۰۱
۳۵.	انفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ	التوبة	۴۱	۱۴۰
۳۶.	إِنَّمَا ٱلصَّدَقَٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَٱلْمَسَٰكِينِ وَٱلْعَٰمِلِينَ	التوبة	۶۰	۱۱۵
۳۷.	وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ	التوبة	۷۱	۱۶۳
۳۸.	وَالَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ اِلَّا جُهْدَهُمْ	التوبة	79	۱۳۷
۳۹.	إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ	الرعد	۳	۲۲۹
۴۰.	إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ...	النحل	۹۰	۵۷،۳۶،۱۹
۴۱.	وَادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ	النحل	۱۲۵	۲۴۲

شمار	آیت	سورة	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۴۲.	وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ	الإسراء	۲۶	۱۵۲،۱۶۱
۴۳.	وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا	الإسراء	۲۹	۱۶۶
۴۴.	قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ	الکهف	۱۱۰	۱۰۰
۴۵.	وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا. لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا إِدًّا	مریم	۸۸	۱۰۰
۴۶.	وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ	الانبیاء	۱۰۷	۲۳۲
۴۷.	أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقْتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا	الحج	۳۹	۱۴۵
۴۸.	الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ	الحج	۴۱	۲۴۱
۴۹.	وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ	الحج	۷۸	۱۱۵
۵۰.	أَفَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَٰهَهُ هَوَاهُ	الفرقان	۴۳	۱۰۲،۱۸۰
۵۱.	فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا	الفرقان	۵۲	۱۴۰،۱۴۶
۵۲.	وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ	الفرقان	۶۷	۳۷،۱۶۷
۵۳.	وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ	العنکبوت	۸	۱۴۶
۵۴.	وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ	العنکبوت	۶۹	۱۴۰،۱۴۷
۵۵.	مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ	الروم	۳۲	۶۱
۵۶.	وَاِنْ جَاهَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ	لقمان	۱۵	۱۴۶،۱۵۹
۵۷.	وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ...	لقمان	۱۹	۳۶
۵۸.	وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ	لقمان	۲۱	۱۵۳
۵۹.	لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	الاحزاب	۲۱	۲۴۳
۶۰.	وَاَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ	فاطر	۴۲	۱۳۷
۶۱.	قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا	الزمر	۹	۱۸۰،۲۳۵
۶۲.	وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ	الشوریٰ	۳۸	۲۱۴
۶۳.	بَلْ قَالُوا إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ	الزخرف	۲۳	۷۰

شمار	آیت	سورة	آیت نمبر	صفحہ نمبر
۶۴.	إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ	الحجرات	۱۳	۷۷
۶۵.	وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ	الرحمن	9	۲۸۳
۶۶.	وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ	الحدید	۲۷	۱۹،۹۸،۱۲۲
۶۷.	إِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاءُ حَمَلْنَاكُمْ فِي الْجَارِيَةِ	الحاقة	۱۱	۷
۶۸.	وَّ اَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا	الجن	۱۸	۹۷
۶۹.	إِنَّ فِرْعَوْنَ طَغَىٰ	النازعات	۱۷	۷
۷۰.	إِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ	التکویر	۸	۷۲
۷۱.	وَيْلٌ لِلْمُطَفِّفِينَ. الَّذِينَ إِذَا اكْتَالُوا عَلَى النَّاسِ	المطففین	۱-۳	۱۶۷
۷۲.	كَلَّا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى	العلق	۶	۸
۷۳.	قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ	الاخلاص	۱	۹۳
۷۴.	وَ لَمْ يَكُنْ لَّه كُفُوًا اَحَدٌ	الاخلاص	۳	۹۳،۱۰۰

فہرست احادیث

نمبر شمار	متن	مصدر	صفحہ نمبر
۱.	ارْمُوا بِمِثْلِ حَصَى الْخَذْفِ	سنن النسائی	۱۱۷
۲.	استوصوا بالنساء خيرًا	سنن ابن ماجہ	۱۵۷
۳.	الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْؤُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ	صحیح بخاری	۲۴۱
۴.	إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ	صحیح بخاری	۲۳۳
۵.	إن الله لا يجمع امتي اوقال:امة محمد	سنن الترمذی	۱۹۲
۶.	إِن تَكُونُوا هُنَا أَوْ هُنَاكَ، فَمَن أَرَادَ أَن يُفَرِّقَ	مسند احمد	۱۹۲
۷.	إِنَّ لِرَبِّكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِأَهْلِكَ	صحیح بخاری	۱۱۰
۸.	إِنَّ لِنَفْسِكَ عَلَيْكَ حَقًّا، وَلِأَهْلِكَ عَلَيْكَ حَقًّا	صحیح بخاری	۱۶۲
۹.	إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ	صحیح بخاری	۱۱۵
۱۰.	إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ	سنن النسائی	۲۲۸
۱۱.	إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ	سنن ابن ماجہ	۱۱۷
۱۲.	إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ	سنن ابن ماجہ	۱۹۸
۱۳.	جاهدوا المشركين بأموالكم وأنفسكم وألسنتكم	سنن ابو داوٗد	۱۴۱
۱۴.	جَاءَ ثَلَاثَةُ رَهْطٍ إِلَى بُيُوتِ أَزْوَاجِ النَّبِيِّ ﷺ يَسْأَلُونَ	صحیح بخاری	۱۰۸
۱۵.	الْحَلِفُ مُنَفِّقَةٌ لِلسِّلْعَةِ، مُمْحِقَةٌ لِلْبَرَكَةِ	صحیح بخاری	۱۶۹
۱۶.	خَيْرُ الصَّدَقَةِ مَا كَانَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ	صحیح بخاری	۱۶۷
۱۷.	خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي	سنن ابن ماجہ	۱۵۵
۱۸.	الرَّجُلُ يُقَاتِلُ حَمِيَّةً، وَيُقَاتِلُ شَجَاعَةً، وَيُقَاتِلُ رِيَاءً،	صحیح بخاری	۱۴۴
۱۹.	الرفقُ ما كانَ في شيءٍ إلَّا زانَهُ، وما نُزِعَ من	صحیح مسلم	۲۰۶
۲۰.	سَمِعْتُ رَجُلًا يَقْرَأُ آيَةً قَدْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ ﷺ	صحیح بخاری	۱۹۲
۲۱.	سَيَكُونُ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ قَوْمٌ يَعْتَدُونَ فِي الدُّعَاءِ وَالطَّهُورِ	سنن اَبی داود	۱۱۷
۲۲.	صُمْ يَوْمًا وَأَفْطِرْ يَوْمًا، فَذَلِكَ صِيَامُ دَاوُدَ،	صحیح بخاری	۱۱۲

نمبر شمار	متن	مصدر	صفحہ نمبر
۲۳.	فَأَعْطِهَا مَنْ هُوَ أَهْلُهَا	صحیح بخاری	۱۱۶
۲۴.	ففيهما فجاهد	صحیح بخاری	۱۴۱
۲۵.	كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ	صحیح بخاری	۲۸۷
۲۶.	كُنَّا نَغْزُو مَعَ النَّبِيِّ ﷺ لَيْسَ لَنَا نِسَاءٌ، فَقُلْنَا:	صحیح بخاری	۱۵۶
۲۷.	لا طاعةَ لمخلوقٍ في معصيةِ الخالق	مسند احمد	۱۶۰
۲۸.	لَا يَجْرِي عَلَى الْمُسْلِمِ سِيَانٌ أَنْ يَظْلِمَ أَوْ يُظْلَمَ	سنن الترمذی	۲۸۶
۲۹.	لَا يَحْتَكِرُ إِلَّا خَاطِئٌ	صحیح مسلم	۱۶۹
۳۰.	لا ينال المسلمون برّهم حتى يكون بينهم العدل	ابن ماجہ	۲۸۴
۳۱.	لَعَنَ اللَّهُ آكِلَ الرِّبَا، وَمُوكِلَهُ، وَكَاتِبَهُ، وَشَاهِدَيْهِ	صحیح مسلم	۱۶۸
۳۲.	ما ضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم مملوكةً قطُّ	سنن ابن ماجہ	۱۵۸
۳۳	مَا هٰذَا الْحَبْلُ قَالُوا: هٰذَا حَبْلٌ لِزَيْنَبَ. فَإِذَا فَتَرَتْ	صحیح بخاری	۱۰۹
۳۴	المجاهد من جاهد نفسه في طاعة الله	مسند احمد	۱۴۱
۳۵.	المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده	صحیح البخاری	۲۸۶
۳۶.	مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ	صحیح بخاری	۱۷۰
۳۷.	مَنْ أَخَذَ أَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيدُ إِتْلَافَهَا أَتْلَفَهُ اللَّهُ،	صحیح بخاری	۱۷۰
۳۸.	من دلّ على خير فله مثل أجر فاعله	صحیح مسلم	۲۴۳
۳۹.	مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، أَوْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ،	بخاری	۱۶۳
۴۰.	مَنْ غَشَّنَا فَلَيْسَ مِنَّا	صحیح مسلم	۱۶۸
۴۱.	الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ وَيَصْبِرُ عَلَىٰ أَذَاهُمْ،	سنن ابن ماجہ	۱۶۴
۴۲.	المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا	صحیح بخاری	۲۸۷
۴۳	الْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا،	صحیح بخاری	۱۶۴
۴۴	هلك المتنطعون	صحیح مسلم	۱۸۱
۴۵.	يا علي، إنَّ فيك مثلاً من عيسى بن مريم؛ أَحَبَّهُ	مسند أحمد	۲۰۶
۴۶.	يَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا	صحیح بخاری	۲۳۳

مصادر و مراجع

القرآن الکریم

عربی کتب

۷۵. البیهقی، ابو بکر أحمد بن الحسین، المحقق: السید احمد صقر مناقب الشافعی، مکتبۃ دار التراث، القاهره الطبعة: الأولی، ۱۳۹۰ھ

۷۶. ابن ابی الحدید، عز الدین ابی حامد عبد الحمید بن هبه الله، شرح نهج البلاغۃ دار إحیاء الکتب العربیه، طبعه الأولی ۱۳۷۸ھ

۷۷. ابن ابی عاصم، السنۃ، تحقیق محمد ناصر الدین الألبانی، مکتب المعارف، ریاض، ۱۹۹۴ء

۷۸. ابن الأثیر، الکامل فی التاریخ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، طبعه الأولی، ۱۹۸۷م

۷۹. ابن الجوزی، عبد الرحمن بن علی، مناقب الإمام احمد، المحقق: عبد الله بن عبد المحسن الترکی، دار هجر، :۱۴۰۹

۸۰. ابن الجوزی، ابو الفرج عبد الرحمن بن ابی الحسن، صفۃ الصفوۃ، المحقق خالد مصطفی طرطوسی، دار الکتاب العربی، بیروت لبنان

۸۱. ابن القیم، شمسُ الدین محمد بن ابی بکر، مدارج السالکین، المحقق: محمد المعتصم بالله، دار الکتاب العربی بیروت ۱۴۱۶

۸۲. ابن القیم، شمسُ الدین محمد بن ابی بکر بن أیوب بن سعد الزرعی الدمشقی، مفتاح دار السعادۃ، دار عطاءات العلم

۸۳. ابن القیم، شمسُ الدین محمد بن ابی بکر الدمشقی، زاد المعاد فی هدی خیر العباد، ت: الأرناؤوط. مؤسسۃ الرسالۃ

۸۴. ابن القیم، شمسُ الدین محمد بن ابی بکر الدمشقی، إعلام الموقعین عن رب العالمین، دار عطاءات العلم، الریاض

۸۵. ابن القیم، شمسُ الدین محمد بن ابی بکر الدمشقی، الطرق الحکمیه فی السیاسه الشرعیه، مجمع الفقه الإسلامی بجدۃ

۸۶. ابن القیم، شمسُ الدین محمد بن ابی بکر بن أیوب بن سعد الزرعی الدمشقی، الفوائد، مکتبه دار عالم الفوائد، الریاض

۸۷. ابن باز، عبد العزیز بن عبد الله 'مجموع الفتاوی، دار القاسم، الریاض، ۱۹۹۵ء

۸۸. ابن بطال، علی بن خلف، ابو الحسن، شرح صحیح البخاری، الریاض، مکتبۃ الرشد، ۱۴۲۳ھ

۸۹. ابن تیمیۃ، الحرانی، ابو العباس، احمد بن عبد الحلیم 'السیاسۃ الشرعیه فی اصلاح الراعی والرعیۃ، دار الفکر، دمشق

۹۰. ابن تیمیه، الحرانی، ابو العباس، احمد بن عبد الحلیم، مجموع الفتاوی، وزارۃ الشؤون الإسلامیۃ والدعوۃ والإرشاد السعودیۃ

۹۱. ابن تیمیه، الحرانی، ابو العباس، احمد بن عبد الحلیم، اقتضاء الصراط المستقیم لمخالفۃ اصحاب الجحیم، دار عالم الکتب، بیروت، لبنان، ۱۴۱۹ھ

۹۲. ابن حجر، العسقلانی، فتح الباری بشرح البخاری، المکتبه السلفیه مصر ۱۳۸۰

۹۳. ابن خلدون، ابو زید عبد الرحمن بن محمد بن محمد، المقدمه، دار الفکر، بیروت

۹۴. ابن رجب حنبلی، زین الدین ابو الفرج عبد الرحمن بن شهاب الدین البغدادی، جامع العلوم والحکم، مکتبه الإیمان ۱۹۰۰

۹۵. ابن سیده، ابو الحسن علی بن اسماعیل، المحکم والمحیط الأعظم، تحقیق عبد الحمید هنداوی، دار الکتب العلمیه بیروت، ۲۰۰۰

۹۶. ابن عابدین، علامہ محمد امین شامی، رد المحتار علی الدر المختار، مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی وأولادہ بمصر ۱۳۸۶ھ
۹۷. ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، جامع بیان العلم وفضلہ، دار ابن الجوزي
۹۸. ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ الانتقاء فی فضائل الأئمہ الثلاثۃ الفقھاء، دار الکتب العلمیہ، بیروت
۹۹. ابن عبد الحکم، محمد بن عبد اللہ، سیرۃ عمر بن عبد العزیز، المکتبہ العربیہ
۱۰۰. ابن عبد البر، یوسف بن عبد اللہ، التمھید لمافی الموطأ من المعانی، تحقیق: مصطفی بن أحمد العلوي، محمد عبد الکبیر البکري، وزارۃ الأوقاف المغربیۃ، ۱۳۸۷ھ / ۱۹۶۷ء
۱۰۱. ابن عبد البر، الاستیعاب في معرفۃ الأصحاب، المحقق: عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، مرکز ھجر للبحوث والدراسات العربیۃ والإسلامیۃ- مصر
۱۰۲. ابن عبد البر، یوسف عبد اللہ بن محمد، جامع بیان العلم وفضلہ، المحقق: ابو الأشبال الزھیری، دار ابن الجوزي
۱۰۳. ابن عساکر، الحافظ فخر الدین ابن عساکر أبو القاسم علي بن الحسن، تبیین کذب المفتری، دار التقوی، دمشق
۱۰۴. ابن عساکر، ثقۃ الدین، ابو القاسم علی بن الحسن بن ھبۃ اللہ، دار الکتاب العربي- بیروت، ۱۴۰۴ھ
۱۰۵. ابن قدامہ، ابو محمد عبد اللہ بن احمد بن محمد، المغنی، وزارۃ الشؤون الإسلامیۃ
۱۰۶. ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین حافظ، البدایہ والنھایہ، دار الفکر، بیروت، ۱۴۰۷ھ
۱۰۷. ابن کثیر، ابو الفداء عماد الدین حافظ، تفسیر القرآن العظیم، دار طیبۃ، الریاض، ۱۹۹۹
۱۰۸. ابن ماجہ، ابی عبد اللہ محمد بن یزید، سنن ابن ماجہ، دار الجیل بیروت
۱۰۹. ابن مفلح الحنبلی، ابو اسحاق برہان الدین ابراہیم بن محمد بن عبد اللہ، الآداب الشرعیہ، تحقیق شعیب الأرناؤوط، مؤسسۃ الرسالہ ۱۴۱۹ھ
۱۱۰. ابن منظور، محمد بن مکرم بن علی، أبو الفضل، جمال الدین، لسان العرب، دار صادر، بیروت
۱۱۱. ابن ھشام، أبو محمد عبد الملک ابن ھشام بن أیوب الحمیري، السیرۃ النبویہ، دار المعرفہ
۱۱۲. ابو الحسن، الندوی، ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین، دار القلم، دمشق
۱۱۳. ابو حیان، محمد بن یوسف، البحر المحیط فی التفسیر، دار الفکر بیروت، ۱۴۲۰ھ
۱۱۴. ابو داود، سلیمان بن الاشعث، سنن ابو داود، مکتبہ قدوسیہ پاکستان، لاہور
۱۱۵. ابو نعیم الاصبہانی، احمد بن عبد اللہ الاصفہانی، حلیہ الأولیاء، السعادۃ، مصر
۱۱۶. اصفہانی راغب، القاسم الحسین بن محمد المفردات فی غریب القرآن، مکتبہ نزار مصطفی الباز
۱۱۷. الألبانی، محمد ناصر الدین، السلسلہ الصحیحہ، مکتبۃ المعارف للنشر والتوزیع، ریاض
۱۱۸. آلوسی، محمود بن عبد اللہ، روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی، دار الکتب العلمیۃ بیروت، ۱۴۱۵ھ

١١٩. الإمام ابوحنيفة، النعمان بن ثابت بن زوطي بن ماه، الفقه الأكبر، تحقيق: محمد زاهد الكوثري، المطبوعات النفيسه

١٢٠. امام احمد، ابی عبد الله احمد بن حنبل، الزهد، دار الغد الجدید، الطبعة الأولی

١٢١. البخاری، صحیح البخاری، دار ابن کثیر، بیروت، ١٩٨٧ء

١٢٢. البغوی، الحسین بن مسعود بن محمد، معالم التنزیل، دار طیبه

١٢٣. التمیمی، عبد الواحد بن محمد، غرر الحکم ودرر الکلم، تحقیق عبد الواحد آمدی، دار الکتب الإسلامیه، تہران

١٢٤. ثناء اللہ، قاضی، المظہری علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی، تفسیر مظہری، ندوة المصنفین، دہلی

١٢٥. الجرجانی، الشریف علی بن محمد بن علی الزین الحسیني، التعریفات دار الریان للتراث، طبعہ الأولی ١٤٠٣ھ

١٢٦. الحاکم ابوعبد الله محمد بن عبد الله الحاکم النیسابوري، المستدرک علی الصحیحین، دار الکتب العلمیہ

١٢٧. حسن البنا، رسائل الإمام حسن البنا، المکتبۃ التوفیقیۃ، ١٩٨٤

١٢٨. الحسن بن علی بن شعبہ الحرانی، تحف العقول عن آل الرسول، المطبعۃ الحیدریہ ومکتبتھا، النجف، ١٩٦٣م

١٢٩. الخطابی، حمد بن محمد، معالم السنن شرح سنن أبی داود، تحقیق سعد بن نجدت عمر، مؤسسہ الرسالۃ ناشرون، بیروت

١٣٠. الخطیب، البغدادی، احمد بن علی بن ثابت، الجامع لأخلاق الراوی وآداب، دار الکتب العلمیۃ بیروت

١٣١. الخطیب الشربینی، محمد بن احمد، السراج المنیر فی الاعانۃ علی معرفۃ بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر، القاہرہ، مطبعۃ بولاق

١٣٢. الخطیب، البغدادی، احمد بن علی بن ثابت، تاریخ بغداد، دار الکتب العلمیۃ، بیروت۔لبنان، الطبعۃ الأولی، ١٤١٧ھ

١٣٣. الخفاجی، شہاب الدین، احمد بن محمد، عنایۃ القاضی وکفایۃ الراضی علی تفسیر البیضاوی، دار صادر بیروت

١٣٤. الدکتور یوسف القرضاوی، الإیمان والحیاۃ، دار الشروق، القاہرۃ

١٣٥. الذھبی، شمس الدین، سیر أعلام، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت، بیروت، لبنان. ١٩٨٨ء

١٣٦. الرازی، احمد بن فارس بن زکریا، معجم مقاییس اللغہ، تحقیق عبد السلام محمد ھارون، دار الفکر

١٣٧. الرازی، زین الدین محمد بن ابی بکر، مختار الصحاح، المکتبہ العصریہ، الدار النموذجیہ، بیروت صیدا، ط٥، ١٤٢٠ھ

١٣٨. الرازی، ابوعبد الله محمد بن عمر، فخر الدّین، مفاتیح الغیب، دار إحیاء التراث العربی، بیروت، ١٤٢٠ھ

١٣٩. رشید رضا، تفسیر المنار، الھیئۃ المصریہ العامہ للکتاب، القاہرۃ، ١٩٩٠ء

١٤٠. الزبیدی، ابوالفضل محمد بن محمد، تاج العروس من جواہر القاموس، تحقیق عبد الستار احمد فراج، دار الھدایہ

١٤١. الزمخشری، محمود بن عمرو، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل، دار الکتاب العربی بیروت، ١٤٠٧ھ

١٤٢. السمین الحلبی، احمد بن یوسف، ابوالعباس، الدر المصون فی علوم الکتاب المکنون، دار القلم دمشق

١٤٣. سید إبراھیم قطب، فی ظلال القرآن، دار الشروق، الفرع الأکادیمی، علوم القرآن والتفسیر

١٤٤. سید قطب، معالم في الطریق، دار الشروق، القاھرۃ، ١٩٦٤ء

۱۴۵. السیوطی، جلال الدین، عبد الرحمن بن ابی بکر الخضیری، الأشباہ والنظائر، دار الکتب العلمیہ، بیروت
۱۴۶. الشاطبی، ابراہیم بن موسی الغرناطی، الاعتصام، تحقیق: سلیم بن عید الھلالی، دار ابن عفان، السعودیہ الطبعۃ الأولی،
۱۴۷. الشاطبی، ابراہیم بن موسی الغرناطی، الموافقات فی اصول الشریعہ، مکتبہ علمیہ بیروت لبنان
۱۴۸. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، الإنصاف فی بیان اسباب الاختلاف، مطبعۃ المجیدیۃ
۱۴۹. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید، تحقیق: محمد عبد الرحمن، الجامعۃ السلفیۃ، بنارس
۱۵۰. شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، حجۃ اللہ البالغہ، دار إحیاء التراث العربي، بیروت
۱۵۱. الشریف الرضی، الشریف أبو الحسن محمد بن الحسن، نھج البلاغۃ، تحقیق الشیخ قیس، مؤسسہ الرافد للمطبوعات، الاولی
۱۵۲. الشوکانی، محمد بن علي، نیل الأوطار من أسرار منتقی الأخبار، وزارۃ الأوقاف السعودیہ
۱۵۳. الشوکانی، محمد بن علی، نیل الأوطار شرح منتقی الأخبار، وزارۃ الأوقاف السعودیہ
۱۵۴. الشوکانی، محمد بن علی، فتح القدیر، دار ابن کثیر بیروت، ۱۴۱۴ھ
۱۵۵. الصاوي، د. صلاح. التطرّف الدینی: الرأي الآخر. القاھرۃ: الآفاق الدولیۃ لِلإعلام، (الطبعۃ الأولی ۱۴۰۸ھ-۱۹۹۳م
۱۵۶. الطبرسی، ابو علی فضل بن الحسن، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، دار العلوم بیروت، لبنان
۱۵۷. الطبری، ابن جریر، جامع البیان عن تأویل آي القرآن، دار ہجر، القاہرہ، ۲۰۰۱
۱۵۸. الطبری، ابن جریر، تاریخ الطبری، دار التراث، بیروت، ۱۳۸۷ھالطبعۃ: الأولی، ۱۴۴۰ھ-۲۰۱۹م
۱۵۹. عبد الرحمن السعدی، تفسیر السعدی، دار السعدی، مؤلفات السعدی، الریاض
۱۶۰. عبد الواحد بن محمد التمیمي الآمدی، غرر الحکم ودرر الکلم، المفھرس من کلام أمیر المؤمنین علي بن ابی طالب دار الھادی بیروت لبنان
۱۶۱. العیني، بدر الدین أبو محمد محمود بن أحمد، عمدۃ القاري شرح صحیح البخاری، دار الکتب العلمیۃ
۱۶۲. الغزالی ابو حامد محمد بن محمد الطوسي، إحیاء علوم الدین، دار المعارف، بیروت
۱۶۳. الغزالی ابو حامد محمد بن محمد، الاقتصاد فی الاعتقاد، دار البصائر، القاہرہ
۱۶۴. الفیروزآبادی، مجد الدین ابو طاہر محمد بن یعقوب، القاموس المحیط، مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
۱۶۵. القاسمی، جمال الدین، محاسن التاویل، دار الکتب العلمیۃ، بیروت
۱۶۶. القاضی، عیاض بن موسی الیحصبي، أبو الفضل، إکمال المعلم بفوائد مسلم، المحقق: الدکتور یحیٰی دار الوفاء للطباعۃ والنشر والتوزیع، مصر ۱۴۱۹ھ
۱۶۷. القرضاوی، الوسطیۃ فی الِاسلام مفھومھا ومظاہرھا، مکتبۃ وھبۃ القاہرہ، طبع اول ۱۳۹۷ھ=۱۹۷۷م
۱۶۸. القرطبی، أبو عبد اللہ، محمد بن أحمد الأنصاري، الجامع لأحکام القرآن، دار الکتب المصریۃ، القاہرۃ، ۱۹۶۴

١٦٩. القمی النیشاپوری، نظام الدین الحسن بن محمد، غرائب القرآن ورغائب الفرقان، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ١٤١٦ھ

١٧٠. الکلینی، ابوجعفر محمد بن یعقوب بن اسحق الرازی، الکافی، دار المعارف بیروت لبنان

١٧١. مالک بن نبی، شروط النھضۃ، دار الفکر، دمشق

١٧٢. الماوردی، ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب بصری، الأحکام السلطانیہ، دارالکتب العلمیہ بیروت لبنان

١٧٣. محمد الغزالی، الإسلام المفتری علیہ، دار الشروق، القاھرۃ

١٧٤. محمد بن اسماعیل بن صلاح، التنویر شرح جامع الصغیر، مکتبہ دارالسلام الریاض، ١٤٣٢ھ

١٧٥. محمد بن عبد الوھاب، الأشباہ والنظائر، ص ٢٨٣ الدرر السنیۃ فی الأجوبۃ النجدیۃ

١٧٦. محمد عبدہ، الأعمال الکاملۃ، دار الشروق للنشر والتوزیع

١٧٧. محمد عمارۃ، تیارات الفکر الإسلامی، ص ٢١٤، دار الشروق، القاھرۃ، ١٩٨٥ء

١٧٨. محمد غزالی، فقہ السیرۃ، دار القلم، بیروت

١٧٩. المدنی،، مالک بن انس بن مالک بن عامر الأصبحی المدونہ الکبری، بیروت، دار صادر

١٨٠. مسلم بن حجاج، صحیح مسلم،، المحقق: نظر بن محمد الفاریابي أبو قتیبۃ، الناشر: دار طیبہ، ٢٠٠٦ء

١٨١. مسند احمد بن حنبل، المسند، بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، ٢٠٠١ء

١٨٢. المعجم الوسیط، مجمع اللغۃ العربیہ، مکتبۃ الشروق الدولیہ، ٢٠٠٤

١٨٣. ملا علی القاری، علی بن سلطان محمد، أبو الحسن نور الدین الملا الھروي القاري، مرقاۃ المفاتیح شرح مشکاۃ المصابیح، دار الفکر، بیروت - لبنان، ١٤٢٢ھ

١٨٤. ملا علی القاری، عمدۃ القاری علی شرح صحیح البخاری، دار الکتب العلمیۃ، ١٤٢١ھ-٢٠٠١م

١٨٥. مُلا علی قاری، شرح الفقہ الأکبر، تحقیق: محمد زاھد الکوثری، دار البشائر الإسلامیۃ، بیروت، ٢٠٠١ء

١٨٦. النسائی، احمد بن شعیب، ابوعبد الرحمن، سنن النسائی، حلب، المکتب المطبوعات الاسلامیۃ، ١٤٠٦ھ

١٨٧. النعمانی، عمر بن علی، ابو حفص، اللباب فی علوم الکتاب، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ١٤١٩ھ

١٨٨. النووی، یحیٰ بن شرف، ابوزکریا، المجموع شرح المھذب، بیت الأفکار الدولیہ

١٨٩. نووی، محمد بن عمر، الجاوی،، مراح لبید لکشف معانی القرآن المجید، دارالکتب العلمیۃ بیروت، ١٤١٧ھ

١٩٠. النووی، یحیٰ بن شرف، ابوزکریا، المنھاج شرح صحیح مسلم بن الحجاج، داراحیاء التراث العربی بیروت، ١٣٩٢ھ

١٩١. یوسف القرضاوی، الدکتور، الصحوۃ الإسلامیہ بین الجحود والتطرف، مؤسسۃ الرسالۃ ناشرون، مصر

اردو کتب

۱۹۲. اطہر مسعود ڈاکٹر، مسلم معاشروں پر انتہا پسندی کے فکری، سماجی اور معاشی اثرات

۱۹۳. خالد علوی، ڈاکٹر، انتہا پسندی کے فکری، معاشرتی اور مذہبی اسباب، دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی یونیورسٹی

۱۹۴. خورشید ندیم، ڈاکٹر، مذہبی شدت پسندی کے سیاسی، سماجی اور فکری عوامل

۱۹۵. شبلی نعمانی، علم الکلام، مطبع احمدی، علی گڑھ، علی گڑہ، انڈیا

۱۹۶. عرفان شہزاد، ڈاکٹر، داعش کا فکری پس منظر

۱۹۷. علامہ اقبال، تشکیلِ جدید الٰہیات اسلامیہ، بزمِ اقبال؛ شہر: لاہور، ۱۹۵۸

۱۹۸. علامہ ڈاکٹر محمد طاہر القادری، عالمی دہشت گردی، فکری انتہا پسندی، تکفیریت

۱۹۹. فضل الرحمن، ڈاکٹر، فکری انتہا پسندی، مذہبی تعبیرات کی غلط بنیادیں

۲۰۰. محمد حمید اللہ ڈاکٹر، سیرت النبیؐ کی روشنی میں پُر امن معاشرت

۲۰۱. مودودی، ابو الاعلیٰ، اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی، ترجمان القرآن پبلیکیشنز

۲۰۲. مودودی، ابو الاعلیٰ، تفہیم القرآن، ادارہ ترجمان القرآن پرائیویٹ لمٹیڈ لاہور

۲۰۳. مودودی، سید ابو الاعلیٰ، تجدید و احیائے دین، اسلامی پبلیکیشنز لاہور

۲۰۴. مودودی، سید ابو الاعلیٰ، اسلامی ریاست، ادارہ ترجمان القرآن پرائیویٹ لمٹیڈ لاہور

۲۰۵. مولانا محمد تقی عثمانی، اسلام کا اصولِ امن، جہاد کے احکام، تکفیری گروہوں کی فکری غلطیاں

ENGLISH BOOKS

206. Gilles Kepel Terror in France: The Rise of Jihad in the West, Princeton University Press, 2017
207. John L. Esposito, , The Islamic Threat: Myth or Reality 1992,P207
208. Meade, Robert C., Red Brigades: Story of Italian Terrorism, Palgrave Macmillan, 1990 p336
209. Oxford Advanced Learner's Dictionary of Current English a S Hornby, seventh edition Oxford University Press
210. Roy, Olivier. Islamic Extremism Is Not the Root Cause of Europe's Terror Problem. The Nation, August 20, 2018
211. Sabir Michael, "Terrorism: A Socio-economic and Political Phenomenon with Special Reference to Pakistan", Journal of Management and Social Sciences, (2007)
212. Shah, S. S. H., 2019. Religious Extremism in Pakistan. University of Warsaw.
213. The Reconstruction of Religious Thought in Islam, Lecture
214. Willan, Philip, Puppet masters: The Political Use of Terrorism in Italy, Constable, London

215. Win Trobe, R. (2006). Rational extremism: The political economy of radicalism. Cambridge University Press